اکبر نامہ

یا

اکبر میری نظر میں

(حضرت اکبر الہ آبادی کے کلام و پیام پر ۱۳ نوشتوں کا مجموعہ)

از

عبد الماجد دریابادی

اڈیٹر "صدق جدید" لکھنؤ و مصنف "حکیم الامت"

و

"محمد علی ڈائری" وغیرہ

ہماری شائع کردہ کتابیں

شرح دیوان غالب طبا طبائی ہے	اضافہ شدہ تیسرا ایڈیشن حسرت موہانی عبدالشکور ایم اے ع؍
تنقیدی اصول اور نظریے حامد اللہ افسر ع؍	اُردو کے ہندو ادیب ناظر کاکوروی ع؍
سنہرا حلقہ ناظر کاکوروی ؍	ابو الخمسہ مجنوں گورکھپوری ؍

ہماری عنقریب شائع ہونیوالی کتابیں

ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن پروفیسر لک، ہے	اُردو میں تنقید ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ہے
مضامین تنقید آل احمد سرور ہے	مجموعہ مضامین پروفیسر احتشام حسین

ملنے کا پتہ:۔ انوار بک ڈپو لکھنؤ

(نوٹ) ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ کا خریدار بننا آپ کا قومی فرض ہے۔ سالانہ چندہ

فہرست مضامین

پبلشر
ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ
ملنے کا پتہ:- انوار بک ڈپو لکھنؤ

پاکستان میں ملنے کا پتہ
منیجر مبارک بک ڈپو
بندر روڈ مقابل ڈینسو ہال کراچی ۲

قیمت ۳/
۱۹۵۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

کہاں سنہ ۲۱ء اور کہاں سنہ ۵۱ء و ۵۲ء، ۳۰، ۳۱ سال کی مدت کچھ تھوڑی ہوئی، ایک جُگ بیت گیا۔ ایک قرن گزر گیا۔ جو بچہ تھا، جوان ہو گیا۔ جوان بڑھاپے کو پہنچ گیا اور جو بوڑھا تھا وہ اس عالم ہی سے سفر کر گیا، کیا کیا انقلابات، خارجی اور مادّی، دماغی اور روحانی، اس درمیان میں ہر قسم کے آئے اور اپنا کام کر گئے۔ لیکن اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں، تو جو عقیدت حضرت اکبر اور انکے کلام سے سنہ ۲۱ء میں انکی وفات کے وقت تھی اُسمیں آج بھی ایک ذرہ کمی نہیں۔ عجب نہیں کہ کچھ اضافہ ہی ہو گیا ہو۔ پہلا مفصل تبصرہ ان کے کلام پر آخر سنہ ۲۱ء میں لکھا تھا جو اپریل سنہ ۲۲ء کے رسالہ اُردو (انجمن ترقی اُردو) میں نکلا تھا۔ اور اب پھر ایک ذرا بڑا سا تبصرہ انکے پرانے کلام، کلیات اول کے نئے ایڈیشن پر آخر سنہ ۵۱ء میں کر رہا ہوں۔ آہ، مرحوم ستمبر میں اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ اتفاق سے یہ سطریں بھی ستمبر ہی کے مہینہ میں سپرد قلم ہو رہی ہیں!

اس درمیان میں بارہا ان پر لکھنا لکھانا ہوا۔ کبھی ریڈیو پر بولنا ہوا، کبھی یوم اکبر پر کوئی پیام نشر کرنا ہوا، گو کم فرصتی یا کم ہمتی ہمیشہ ہی دامنگیر رہی اور دل کھول کر کبھی ایک بار بھی لکھنا نصیب نہ ہوا۔ ارادہ اور حوصلے

شروع شروع بڑے بلند تھے اور ہمت یہ تھی کہ انکے ایک ایک صنف کلام پر تفصیل سے لکھا جائے گا، اور تغزل، سیاست، ظرافت، فلسفہ، معرفت، غرض اُن کے ایک ایک میدان کی تفصیلی سیر کی جائے گی۔ زمانہ نے کبھی مساعدت نہ کی، یا صحیح طور پر یہ کہئے کہ کاہلی اور کام چوری نے ہمیشہ کوئی نہ کوئی عذر تراش لیا۔ اور کتنی باتیں جو کہنے والی تھیں اَن کہی رہ گئیں ——— اور اب وہ کم عمری والی فرصتیں اور مہلتیں لائی جائیں تو کہاں سے؟

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

دل برابر فکر مند اور ملول رہتا تھا کہ حشر میں جب حضرت اکبر کا سامنا ہوگا تو اسوقت کیسی شرمندگی ہوگی۔ اور اِس قرضہ کے چکانہ سکنے کی بات کیا بنانا پڑے گی، اتنے میں خبر مسرت اثر معلوم ہوئی کہ حضرت اکبر کے شہر الہ آباد سے بہت دور بلکہ ایک دوسرے ملک میں بزم اکبر کے نام سے ایک ادارہ کلام اکبر و تعلیمات اکبر کے احیاء، ونشر و تبلیغ کے لئے قائم ہو گیا ہے ——— خدا فراموشی کی اِس فضا میں بھلا کسی کو بھی یہ توقع ہو سکتی تھی کہ یادگار ایک اُردو شاعر اور پھر ایسے خدا پرست شاعر کی قائم ہو سکے گی! اکبر نے تو اپنے ہی زمانہ میں حیرت داستعجاب کے لہجہ میں کہا تھا ؎

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانہ میں!

چہ جائیکہ اب ۴۰، ۵۰ برس اور اِدھر ہٹ کر!

یہ مجموعہ تیار ہو کر ابھی روانہ ہی ہو رہا تھا کہ معلوم ہوا "آن قدح

بشکست و آں ساقیِ نماند"۔ وہ بزم ہی سرے سے ٹوٹ گئی۔ اِنا للہ

مسودہ میزر کے لئے بار بنا ہوا تھا کہ لکھنؤ کے ایک ناشر ہمت کر کے آگے بڑھے، اور یہ اوراق طبع اوّل کے لئے انکے سپرد کئے جا رہے ہیں۔ یہ ناشر صاحب بڑے تاجر نہیں۔ اُردو کے مشہور نعت گو شاعر محسن کاکوروی مرحوم کے پرپوتے اور صاحب نور اللغات مولوی نور الحسن کاکوروی مرحوم کے پوتے ہیں۔ اور اسلئے اُردو شعر و ادب کی خدمت کا حق موروثی رکھتے ہیں۔

یہ مضمون اور مقالے اور شذرے زیادہ تر اپنے ہی ہفتہ وار پرچہ صدق سے منقول ہیں۔ ایک بڑا مضمون انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالہ اُردو سے ایک مضمون علیگڈھ میگزین کے اکبر نمبر سے اور دو ریڈیو کے نشریہ ہیں۔ جو تحریریں ۳۰ سال کے وسیع رقبہ میں پھیلی ہوں اور اکثر ایک دوسرے سے بالکل مختلف موقعوں کے لئے لکھی گئی ہوں ان میں ہم آہنگی اور یکسانی پیدا کرنا آسان نہیں۔ یہ خصوصیت تو صرف ایک مستقل و مرتب کتاب ہی کی ہوتی ہے، تاہم ان منتشر تحریروں پر نظر ثانی خاص اسی مقصد سے کر لی گئی ہے کہ تناقضات حتی الامکان رفع کر دیے جائیں، تکررات کم سے کم رہ جائیں اور مغز و عبارت دونوں کے لحاظ سے پُرانی اور ابتدائی تحریریں آخری اور حال کی تحریروں سے قریب قریب آجائیں۔

پڑھنے والوں کو ان صفحات میں اگر کہیں کوئی خوبی نظر آجائے تو اُسے وہ حضرت اکبر کی روحانیت کی برکت اور انکا فیض تصور فرمائیں اور جتنی باتیں ناپسند ہوں انھیں بے تکلف اسی ہیچمدان کے نامۂ اعمال میں ڈال دیں۔

دریاباد۔ بارہ بنکی
تحریر اول ستمبر ۱۹۵۱ء
نظر ثانی اپریل ۱۹۵۴ء

عبدالماجد

"پیامِ اکبر"[1]

یعنے

حضرت اکبر الہ آبادی کی کلیاتِ سوم پر ایک نظر

لسان العصر حضرت اکبر مغفور زمانہ حال کے ان چند بزرگوں میں تھے جنکا مثل و نظیر کہیں مدتوں میں جاکر پیدا ہوتا ہے۔ ان کی ذات ایک طرف شوخی و زندہ دلی اور دوسری طرف حکمت و روحانیت کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھی یا یوں کہئے کہ ایک طرفہ معجون۔ آخر آخر نہ ان کی شاعری شاعری رہی تھی نہ انکا فلسفہ فلسفہ۔ ان کا سب کچھ بلکہ خود انکا وجود حکمت و معرفت کے سانچہ میں ڈھل گیا تھا، انکی گفتگو جامع تھی ادب، حکمت وظرافت کی۔ انکی صحبت ایک زندہ درسگاہ تھی، تصوف، اسرار شریعت و معرفت کی۔ روزمرہ کے معمولی فقروں میں وہ وہ نکتے بیان کر جاتے کہ دوسروں کو غور و فکر کے بعد بھی نہ سوجھتے اور باتوں کے چٹکلوں میں

---

[1] یہ مضمون وفات اکبر (ستمبر ۱۹۲۱ء) کے دو ہی چار مہینہ بعد قلمبند ہوا ہے اور پہلی بار انجمن ترقی اردو کے مشہور سہ ماہی رسالہ اردو (جو اُس وقت اورنگ آباد دکن سے نکلتا تھا) کے دو نمبروں میں اکتوبر ۱۹۲۲ء و اپریل ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ نظر ثانی ۱۹۲۳ء میں ہوئی اور نظر ثالث وسط ۱۹۵۱ء میں۔

ان مسائل کی گرہ کشائی کر جاتے جو سالہا سال کے مطالعہ سے بھی حل نہ ہو پاتے۔ خوش نصیب تھے وہ جنھیں انکی خدمت میں نیازمندی کا شرف حاصل تھا۔ جنکی رسائی اس چشمۂ حیات تک نہ ہو سکی، انھیں آج اپنی نارسائی و محرومی پر حسرت ہے اور جن کی ہو چکی تھی انھیں یہ حسرت ہے کہ وہ اور زیادہ سیراب کیوں نہ ہو لئے——

ع خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود!

ع روے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد!

اکبر کے مجموعہ کلام پر تفصیلی تبصرہ کے لئے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں: چھپا ہوا کلام اس وقت تک[1] تین جلدوں میں ہے۔ اور جو حصہ ابھی غیر مطبوعہ ہے وہ بھی اتنا ہے کہ اگر دو جلدیں نہیں، تو ایک بھر کیلئے تو بالکل کافی ہے۔ رسالہ کی محدود گنجائش میں اس سارے ذخیرہ پر اجمالی نظر بھی ممکن نہیں۔ یہاں صرف اس حصہ کلام پر نظر کی جائیگی جو انھوں نے تقریباً ۱۹۱۴ء سے لیکر آخر ۱۹۱۹ء تک فرمایا۔ اسی دور کے کلام کا شائع شدہ مجموعہ[2] ان کے کلیات سوم کے نام سے مشہور ہے۔ ایک معتدبہ ذخیرہ کلام اس کے بعد کا بھی ہے یعنی ۱۹۲۰ء سے لیکر عین وقت

---

[1] یعنی ۱۹۲۲ء تک [2] "شائع شدہ" کی قید بہت معنی ہے۔ حضرت اکبر بڑے ہی پرگو اور بڑے ہی زود گو تھے۔ بات چیت کرتے جاتے اور شعر کہتے جاتے۔ لیکن کلام کا ایک خاصہ حصہ ایسا بھی ہوتا جسے صرف نجی کی محفلوں تک محدود رکھتے اور اپنے مخصوص دوستوں ہی کو سناتے۔ عام اشاعت کے روادار اس حصۂ کلام کے لئے کسی حال میں بھی نہ ہوئے۔ ع۔ا یعنی وہی

وفات ستمبر ۱۹۲۱ء تک کا۔ ممکن ہے کہ کبھی یہ بھی کلیات چہارم کے نام سے شائع ہو جائے۔ لیکن ابھی تک[1] کہ مرحوم کی وفات کو ۲۳ سال گذر چکے ہیں مسودہ کی حالت میں ہے اور مسودہ بھی شاید پوری طرح مرتب نہیں۔

بہتر ہوگا کہ انکی شاعری کو مختلف صنفوں میں تقسیم کر کے ہر عنوان پر جداگانہ نظر کی جائے۔ ہاں متعدد اشعار ایسے بھی ہونا لازمی ہیں۔ جو پہلے ایک عنوان کے تحت میں آئینگے اور بعد کو دوسرے کے بھی۔ مختلف حیثیتوں اور پہلوؤں سے انھیں بار بار لانا پڑے گا اور تکرار بیان کسی نہ کسی حد تک ناگزیر ہوگی۔

اکبر کی کتاب شاعری کے پانچ مستقل باب بآسانی قرار دئیے جا سکتے ہیں :-

(۱) ظرافت و زندہ دلی

(۲) سیاسیات

(۳) عشق و تغزل

(۴) اخلاق و معاشرت

(۵) تصوف، معرفت و فلسفہ (اور جی چاہے تو اس ایک عنوان کے بھی دو حصے کر لیجئے۔ فلسفہ الگ اور تصوف الگ) ان میں سے ہر عنوان پر ایک ایک کر کے گفتگو مناسب ہو گی۔

---

[1] یعنی ۱۹۴۴ء تک۔

ظرافت و زندہ دلی

اکبر کی شہرت و مقبولیت کی سب سے بڑی نقیب انکی ظرافت تھی۔ ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا۔ انکی شہرت کو مسکراہٹوں نے چمکایا۔ ہندوستان میں آج جو گھر گھر انکا نام پھیلا ہوا ہے اِس عمارت کی ساری داغ بیل انکی شوخ نگاری و لطیفہ گوئی ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔ قوم نے اُن کو جانا مگر اسی حیثیت سے کہ وہ روتے ہوئے چہروں کو ہنسا دیتے ہیں۔ ملک نے انکو پہچانا مگر اسی حیثیت سے کہ وہ مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دیتے ہیں۔

اس میں ذرا کلام نہیں کہ اکبر ظریف اور بہت بڑے ظریف تھے لیکن جس زمانہ کے کلام پر یہاں خصوصیت کے ساتھ تبصرہ مقصود ہے یہ زمانہ انکی ظرافت کے شباب کا نہ تھا۔ جب تک خود جوان رہے شوخ طبعی بھی جوان رہی، عمر کا آفتاب جب ڈھلنے لگا تو ظرافت کا بدر کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بنتا گیا۔ اب اُسکی جگہ آفتاب معرفت طلوع ہونے لگا۔ بالوں میں سفیدی آئی اور صبح پیری کے آثار نمودار ہوئے تو ظرافت نے انگڑائیاں لیں اور زندہ دلی کی شمع جھلملانے لگی۔ حکمت کی تابش اور حقیقت کی تڑپ دل میں پیدا ہوئی۔ جمال حقیقی کی جلوہ آرائیوں نے چشم بصیرت کو محو نظارہ بنایا۔ سوزش عشق نے سینہ کو گرمایا ذوق عرفان نے دل کو تڑپایا اور معرفت کی شعاعیں ان کے مطلع قلب سے اس نورانیت کے ساتھ پھوٹیں

کہ تماشائیوں کی آنکھوں کو قریب تھا کہ چکا چوند لگ جائے۔ یہی تو بات ہے کہ کلیات سوم میں خالص ظریفانہ اشعار شاید ۱۰ فیصدی بھی نہ نکلیں[1] حالانکہ کلیات اول و دوم میں ظریفانہ اشعار کا تناسب تیس فیصدی سے کسی حال میں بھی کم نہ تھا۔

لیکن ہے یہ کہ قسام ازل نے ذہانت و فطانت، شوخی و زندہ دلی کی تقسیم میں ان کے لئے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ اسی لئے پیرانہ سالی میں بھی ایک طرف ذاتی صدمات و خانگی مصائب[2] کے ہجوم اور دوسری طرف دینداری و تصوف کے غلبہ کے باوجود یہ جذبات فنا ہرگز نہیں ہونے پائے۔ شمع جھلملا ضرور رہی تھی مگر بجھی نہ تھی۔ آفتاب ڈھل بیشک چکا تھا مگر غروب نہیں ہوا تھا۔ بدر ہلال بننے لگا تھا لیکن بے نور نہیں ہوا تھا۔ چمن سے بہار رخصت ہونے کو تھی تاہم خزاں کا سایہ بھی ابھی نہیں پڑنے پایا تھا۔ زندہ دلی نہ صرف قائم تھی بلکہ اس قوت کے ساتھ اور اس شدت کے ساتھ کہ دیوان پڑھنے والے متحیر اور کلام سننے والے ششدر رہ رہ جاتے تھے۔

---

[1] کلیات سوم میں کلام ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء کا کلام درج ہے۔ حضرت اکبر کا سال ولادت ۱۸۴۶ء تھا اس حساب سے اسوقت سن ۶۸ تا ۷۳ سال تھا۔ [2] حضرت اکبر کے دو محل تھے۔ زوجہ اولیٰ سے تعلقات شروع ہی سے بہت تلخ رہے۔ زوجہ ثانیہ محبوبہ خاص تھیں انھوں نے ۱۹۱۰ء میں رحلت کی۔ چھوٹے صاحبزادے سید ہاشم بہت محبوب تھے ۱۲ سال کی عمر میں ۱۹۱۳ء میں انھوں نے داغ مفارقت دیا۔ بعض اور خانگی صدمے انکے علاوہ تھے۔ پھر حضرت اکبر تھے ہی بڑی حساس طبیعت کے۔ ہر حادثہ سے متاثر بہت زائد ہوتے تھے۔

کلیات سوم میں اس کے نمونے بیشتر کے مقابلہ میں یقیناً کمتر لیکن پھر بھی اچھی خاصی معقول تعداد میں نظر آتے ہیں۔

اکبر ظریف تھے۔ "ہزال" و فحاش نہ تھے۔ دلوں کو خوش کرتے تھے، چہروں پر تبسم لاتے تھے جذبات سفلی کے بھڑکانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ انکی ظرافت پھکڑ اور ہزل گوئی کے مترادف نہ تھی، اکثر صورتوں میں معنویت سے لبریز ہوتی تھی۔ کہیں کہیں روزمرہ اور محاورہ، لفظی مناسبت، ترکیب کی ندرت، قافیہ کی جدت کے زور سے شعر کو لطیفہ بنا دیتے تھے۔ سیاسی مسائل میں رائے بڑی آزاد رکھتے لیکن جتنا کہہ جانے میں جری تھے اتنا ہی سنانے میں، چھاپنے میں، پھیلانے میں محتاط تھے۔ قدم اتنا پھونک پھونک کر رکھتے کہ مخلصوں اور نیازمندوں تک کو حیرت کی ہنسی آجاتی۔ اور جو اتنے معتقد اور باادب نہ تھے وہ تو جھنجھلاہٹ میں حضرت اکبر کو خدا جانے کیا کچھ کہہ سن ڈالتے۔ خیر۔ ظرافت اس خاص غرض یعنی ستر حال کے لئے، اخفا، خیال کے لئے انکے ہاتھ میں اچھے لفافہ کا، بڑے کارآمد آلہ کا کام دیتی تھی۔ جو کچھ اور جس کی نسبت چاہتے اسی پردہ میں سنا جاتے۔ کچھ اکیلی سیاسیات پر موقوف نہیں، رند و پارسا، امیر و فقیر، عالم و عامی، "صاحب" اور "نیٹو" "ہندو و مسلم" سنی و شیعہ سب کی صحبت میں آمد و رفت رکھتے اور مسجد اور مندر، کالج اور اسکول، خانقاہ و میکدہ، کاونسل اور کچہری، سرکس اور تھیٹر، بازار اور دفتر کے ایک ایک گوشہ میں بے تکلفانہ سیر کرتے

پھرتے۔ ایک ایک چہرہ کا جائزہ غور سے لیتے رہتے۔ اسے جھانکتے اُسے تاکتے۔ کسی کو جانچتے۔ کسی کو بھانپتے۔ تجھ کو تولتے مجھ کو ٹٹولتے لیکن ظرافت کے نقاب کے تار چہرے پر کچھ ایسے گہرے پڑے رہتے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلنے پاتا کہ نگاہیں ہیں کس جانب۔ بے تکلف صحبتوں میں بارہا یہ کہہ بھی گذرتے۔ کہیں کہیں مطبوعہ کلام میں بھی اقرار کر گئے ہیں۔ ایک جگہ واضح لفظوں میں فرماتے ہیں ؎

لغزشیں مد ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر ‏ ‏ ‏ دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اسکو معاف

سرد موسم تھا۔ ہوائیں چل رہی تھیں برفبار ‏ ‏ ‏ شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

"موسم" کا اشارہ زیادہ تر سیاسی فضا کی جانب ہے اور "ہواؤں" سے مراد قانونی شکنجے اور سرکاری گرفتیں تھیں۔ وہ بھی آج (۱۹۴۲ء) کی نہیں آج سے ۳۰، ۳۵ سال قبل کی۔ انکی ظرافت کا بہت بڑا مظہر یہی سیاسیات کا میدان تھا اور اس باب میں انکا عمل عارف رومی کی اس تعلیم پر تھا ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں ‏ ‏ ‏ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اکبر ان دلبران سیاسی کی ایک ایک ادا کے محرم تھے۔ ان کے اسرار کی منادی وہ سر بازار کرتے لیکن زبان وہی اپنی مخصوص رکھتے۔ جو لوگ اُن کی اِس بولی سے واقف ہو گئے تھے وہ معنی و مفہوم کو سمجھ کر چشم و ابرو کو جنبش دیتے۔ اور جو تہ تک نہ پہنچتے وہ بھی بہرحال ایک دل لگی کی بات سمجھکر ہنس تو پڑتے ہی تھے۔ "بُت"۔ "صنم"۔ "مِس"۔ "شیخ"۔ "سید"۔ "سید صاحب"۔ "اونٹ"۔ "گائے"۔ "کلیسا"۔ "حرم"۔ "دیر"۔ "بتکدہ"۔ "کالج"۔ "برہمن"

"لالہ" "صاحب" وغیرہ بیسیوں الفاظ نے لغات اکبری میں کہنا چاہیئے
کہ ایک مخصوص اصطلاحی حیثیت حاصل کرلی تھی۔
ایک جگہ فرمانا یہ منظور تھا کہ سیاسی حقوق جو ہم روز بروز زیادہ
حاصل کرتے جاتے ہیں انھیں اپنی ترقی کی علامتیں سمجھ کر ان پر خوش
ہو رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ حریف نے ہماری حرص و ہوس اور جاہ
پرستی کا صحیح اندازہ کرکے ہمارے لئے ایک جال بچھا دیا ہے جس میں ہم
اور زیادہ جکڑتے جاتے ہیں[1] اور محکومی و تنزل کے غار میں برابر دھنستے
چلے جاتے ہیں۔ اسکو یوں ادا فرماتے ہیں ؎

ہاون تو ہے ہوس کا دستہ ہی پالسی کا — لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا
ہے کوفت لیکن اسی پہ مسرور ہو رہے ہیں — ہر سو اچھل رہے ہیں اور چور ہو رہے ہیں
اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو — اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو
ہے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری[2] میں — اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

"قبلہ رو جماعت" سے کھلی ہوئی بات ہے کہ مراد مسلمان ہیں۔ کلام اکبر
کا روئے سخن بیشتر اپنی ملت کی جانب رہتا ہے۔ تعلیم اکبری کا ایک
خاص پہلو یہ تھا کہ اصل الزام خود ہم پر ہے۔ ہم اگر حرص و ہوس کے بندے

---

[1] کلیات اول میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے ؎
تڑپو گے جتنا جال کے اندر — جال گھسے گا کھال کے اندر

[2] یعنی تاریخ۔ لفظ "حسرت" کے لانے میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ حسرت موہانی خود اس زمانہ
میں سیاسی لیڈروں کی صف اول میں تھے۔

نہ ہوئے ہوتے تو صیاد جال ڈالنے کی تکلیف ہی کیوں گوارا کرتا؟ ہاں اگر نہو تو دستہ چلے کس پر؟

سرکاری مدرسوں اور تعلیم گاہوں کی بھول بھلیاں کچھ رکھی ہی ایسی گئی ہے کہ "ہم" ہمیشہ انھیں الجھاوؤں میں پڑے رہیں اور "وہ" عیش مناتے رہیں۔ ہم ان کی کلرکی کی، خدمت گذاری کی محنتوں میں اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہیں اور وہ "آقایانہ" بے نیازیوں کے ساتھ داد عیش دیتے رہیں ارشاد ہوتا ہے ؎

سمجھا رہے تھے مجھکو کمٹ[1] کی وہ گردشیں
خود گر رہی تھی تاک کی ٹٹی بہ سازشیں
نقشے میں دیکھتا تھا وہ پیتے تھے جام مے
میں نے کہا کہ حضور یہ مضمون عجیب ہے
ہیں خود تو مست بادۂ عشرت کے خم سے آپ
الجھا رہے ہیں مجھکو ستاروں کی دم سے آپ
بولے کہ اس زمین میں کوئی شعر اور بھی
میں نے کہا یہ بات مرے ذہن میں بھی تھی
اللہ رے ارتقائے سگان درِ حضور
کل تو سے تم ہوئے تھے ہوئے آج تم سے آپ
ہنسکر دیا انھوں نے الٹ بحث کا ورق
گانے لگے وہ گیت میں پڑھنے لگا سبق

سرکار نامدار کے بعض "نیکنام" محکموں اور سررشتوں کی ذہانت وطباعی بلکہ قوت خلاقی کے مشاہدہ سے یہ ظریف شاعر بھی دنگ رہ جاتا ہے اور محکمہ پولیس کی کارگذاریوں کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ شاعر غریب کو سیاسی مسائل سے کیا سروکار اس کے اسلاف صدہا برس یار کی کمر کو تلاش کرتے آئے ہیں آجتک پتہ نہ لگا۔ خواجہ خضر کی رہنمائیاں، ہاتف کی

---

[1] دمدار ستارہ (COMET)

دستگیریاں سروش غیب کی مہربانیاں سب کی سب ناکام رہیں۔ شاعر کا ذہن ادھر منتقل ہوتا ہے کہ اس ہستی "معدوم" کا پتہ اب سرکار کے خفیہ پولیس ہی کی مدد سے کیوں نہ چلایا جائے۔ فرماتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال — خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہوں کمر کا حال

ایسا اچھوتا اور نادر سرٹیفکیٹ خفیہ پولس کو اپنی ساری تاریخ میں کبھی کیوں ملا ہو گا! مگر ظرافت کا رنگ کچھ سیاسیات ہی کے لئے مخصوص نہ تھا جب یہ ہولی کھیلنے پر آتے تو مذہب، اصلاح، معاشرت، تعلیم، کسی بھی شعبہ حیات کے بڑے بڑے ثقہ وشین سفید پوشوں کو اپنی پچکاریوں سے رنگے بغیر نہ چھوڑتے —— اس وقت ملت پر جو فرنگی تہذیب ومعاشرت کا جن مسلط ہے اس نے نوبت یہاں تک پہنچا دی ہے کہ علم، ہنر، اخلاق کے ساتھ ساتھ حسن وعشق، عیش وعشرت سبھی کا معیار بدل گیا۔ اور ہم اپنی رنگینیوں اور عیش پسندیوں تک میں پابند روز بروز مغربی معیار کے ہوتے جاتے ہیں یہ پوری کہانی اکبر کی زبانی دو لفظوں میں ادا ہو گئی ہے ؎

فکر ساری کی ہے نہ لنگن کی — اب تو دھن ہی انھیں فرنگن کی

اور خیر ادھر طالبوں عاشقوں شوریدہ سروں کا حال تو بدلا تھا ہی، کمال یہ ہوا کہ ادھر مطلوبوں محبوبوں کی جماعت بھی "انقلاب زندہ باد" کی زد میں آجانے سے نہ بچ سکی۔ عشق کی وضعداری میں فرق آیا تو حسن کی طرح داریاں بھی کب اپنے رنگ پر قائم رہیں۔ بازار فسق میں چلن

تمام تر نئے سکّوں کا ہو گیا اور پرانے سکّے ٹکسال باہر ہو گئے۔ اب تک مشرق نے اور مشرق کی شاعری نے حسن و جمال کا سب سے بڑا زیور شرم و حیا، تمکین و حجاب کو سمجھا تھا لیکن اب جو جا کر دیکھا تو محفل ناز کا رنگ ہی بدلا ہوا کیسی کم سخنی اور کہاں کی بے زبانی ہمشق اب خطابت کی ہو رہی ہے نہ وہ "نگاہِ شرمگیں" نہ وہ "چشم سرمہ گیں" ـــــ اٹھی اور پھٹی ہوئی نگاہیں اور چڑھی ہوئی نشیلی آنکھیں اب خود ہی دید و نظارہ کی مشتاق۔ چہرہ پر نقاب کے ریشمی تاروں کی جگہ شفاف پتھروں کی عینک اور سنہری کمانیاں۔ حجلۂ عروسی کی خلوتوں کا تخیل مٹ مٹا کر ڈرائنگ روم میں ٹھاٹھ محفل طرازی و بزم آرائی کے جم رہے ہیں۔ عاشق صاحب اس قلب ماہیت پر دنگ رہ جاتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

خامشی بھی ہے تعلق نہ ہو تمکین کا ذوق	اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں اسپیچ کا شوق
شانِ سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں	بُت بھی اب دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

جو تھے مصرع نے دریا کوزہ میں بند کر دیا ہے مفہوم کو جتنی چاہے وسعت دیتے چلے جائیے۔ جنکو گوشہ نشین علماء دین سمجھا جاتا تھا، وہ حجروں کی چٹائیاں اور مسجدوں کی صفیں لپیٹ، انکسار و تواضع چھوڑ، پنڈال اور پلیٹ فارم کی زینت بن گئے ہیں۔ جو صوفی و مشائخ کہے جاتے تھے، خانقاہوں سے نکل انھوں نے خود اپنے نقارہ پر چوب لگانی شروع کی۔ دینی مدرسوں کے طلبا استادوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کے بجائے اسٹرائیک اور مطالبہ حقوق کا بگل پھونکنے لگے۔ بیویوں نے شوہروں کی خدمت

چھوڑ سینما اور تھیٹر کا راستہ اختیار کیا۔ مائیں بچوں کو آیاؤں کے حوالہ کر خود کلب جا پہنچیں۔ یہ سارے کا سارا مفہوم اس ایک بلیغ مصرعہ میں سما گیا ع

ع بُت بھی اب دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

اپنی دیسی تہذیب اور دیسی حکومت خواہ کسی ملت و فرقہ کی ہو، اغیار کی حکومت اور بیرونی تہذیب سے تو بہرحال گوارا تر ہے۔ اس مفہوم کو جن لذیذ و خوش ذائقہ کنایات میں ادا کیا ہے عجب نہیں کہ ان سے اہل ذوق کی زبان چٹخاریاں لینے لگے ؎

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا ایک دہاتی
بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

"پوری" اور "چپاتی" اور "بسکٹ" تینوں کی تلمیحیں بالکل صاف ہیں رہی "دیس کی دھن"، تو ایک معنی اس کے ظاہر ہی ہیں یعنی وطن کا جوش محبت باقی "دھن" ایک اصطلاح موسیقی بھی ہے اور "دیسی" ایک راگ کا نام ہے اور پھر یہ سارا راگ ایک دیہاتی یعنی عامی کی زبان سے! نور علیٰ نور اس زمین کا دوسرا شعر بھی سننے کے قابل ہے ؎

شان نماز اکبر شاہانہ ہو چلی ہے
مسجد الگ بنائیں اپنی میاں فاقی

نماز باجماعت کی تاکید تو تھی ہی اس لئے کہ شاہ و گدا، آقا و غلام، خادم و مخدوم ایک صف میں شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں، اور کم از کم اللہ کے گھر میں

۱؎ خوش خیالیوں سے بھرے ہوئے فقرے خوب خیال رہا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب خونین سے سالہا سال قبل کے لکھے ہوئے ہیں۔

آکر تو دن میں پانچ پانچ مرتبہ یہ بندوں کے قائم کئے ہوئے امتیازات مٹتے رہیں۔ یہاں شیخ صاحب مسجد میں حاضر ہو کر بھی اپنی آقائی و خواجگی کو نہیں بھولتے اور بفاتی اور جمن۔ بچاروں کے لئے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا بجز اس کے کہ اپنی مسجد ہی الگ بنائیں!

ایک ذہنیت اس وقت یہ چلی ہوئی ہے کہ زبان سے تو فرنگیت، فرنگی سیاست فرنگی تہذیب، فرنگی حکومت کو خوب بُرا بھلا کہا جائے لیکن انھی حلقوں سے اگر کہیں واہ واہ ہونے لگے، شاباش ملنے لگے، داد و ستائش کی طرح پڑ جائے تو دل اس پر بھی خوشی سے اُچھلنے لگتا ہے اور اندر ہی اندر لہر فخر و مسرت کی دوڑ جاتی ہے۔ اکبر کی نظر اس پہلو پر بھی گئی۔ اسکی گرفت اپنے پنجۂ آہنی سے کی صنعت گری کا کمال ملاحظہ ہو کہ فولاد کی صلابت و کرختگی کس خوبی کے ساتھ نرم و گداز مخملی دستانے کے اندر غایب کر دی ہے

رقیب سرٹفکیٹ دیں تو عشق ہو تسلیم یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولی

فلاں قومی شاعر کا خان بہادر ہو جانا، فلاں خادم ملت کا شمس العلماء بن جانا یہانتک کہ اقبال رح کا "سر" کے خطاب سے سرفراز ہو جانا یہ سب مثالیں اکبری نظریہ کے مطابق اسی رقیب کے دیئے ہوئے سرٹفکیٹ کی ہیں۔

ملت کے نو جوانوں کو مذہب سے جو بیگانگی ہے، بُعد و اجنبیت ہے،

---

[1] زمانہ تحریر ۱۹۲۲ء

اسکو اکبر نے بڑی تکرار و کثرت سے بیان کیا ہے اور کہیں کہیں تو انداز
ایسا لطیف اختیار کیا ہے کہ وہ ان کے سوا اور کسی سے بن ہی نہ پڑتا۔
دل کے آنسوؤں سے روتے جائیے لیکن چہرہ وہی ہنسی اور تبسم کا بنائے
رکھیے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی
تاکید عبادت یہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے

معاذ اللہ۔ بُعد و بیگانگی کی حد یہ ہے کہ عبادت کی کوئی سنجیدہ اہمیت ذہن
میں آ ہی نہیں سکتی اور اب جو کوئی تاکید کرتا ہے تو لامحالہ یہی کہنا پڑتا ہے
کہ یہ بھی ایک اچھی دل لگی ہے!

اب ملت کی مشغولیت سوا اس کے باقی ہی کیا رہ گئی ہے کہ صلاح
و فلاح کی حقیقی تدبیریں اور انکی جانب توجہ غائب۔ آج یہ انجمن بنی کل
وہ مجلس۔ چندہ اس میں بھی دیجئے اور اس میں بھی۔ اور ترقی کے بجائے
سایۂ ترقی کو کافی سمجھ لیجئے! ؎

کمیٹی میں چندے دیا کیجئے
ترقی کے ہجے کیا کیجئے

جدید حریت بابی، جدید تعلیم، جدید کمیٹی آفرینی اور جلسہ سازی حضرت اکبر
ان سب چیزوں کے شدید مخالف تھے چندہ کا رواج نیا نیا انہی کے زمانہ
میں نکلا تھا اور خوب زور شور سے پھیل گیا تھا اس لئے ان کے ترکش طنز کے
تیروں کا بڑا ہدف یہی چندہ رہا کرتا تھا۔ ذیل کی مصوری ان کے نقطۂ
خیال سے کتنی دلکش اور کیسی جامع ہے ؎

کالج کے چونٹے لپٹے ہیں ٹڈی کی ٹانگ سے
قوم ضعیف، تنگ ہے چندوں کی مانگ سے

عالم ہیں چپ جو مستند و باوقار ہیں[1] گونجا ہوا ہے پیش ہو وفاقی کے سانگ سے[2]

نیت دنیا طلبی و دنیا پرستی کی ہے لیکن آڑ مذہب کی۔ مقصود و مطلوب دنیا لیکن زبان پر نام دین و مذہب کا۔ اکبر یہ رنگ دیکھتے ہیں اور ذرا دیکھئے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر صدا کیا لگاتے ہیں ؎

کل کہتے تھے یہ بھائی گھورن دُنیا ہے روٹی، مذہب چورن[3]

کھانا ٹھوس ٹھوس کر کھا لیا جاتا ہے تو آخر چورن کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ چورن کچھ دل سے مرغوب ہو مقصود تو وہی کھانا ہے لیکن کام بغیر چورن کے نکلتا نہیں۔ اسی طرح مقصود تو وہی دنیا ہے لیکن آڑ مذہب کی۔

گئو رکھشا کی جد و جہد نئی نہیں پرانی ہے اور تحریک خلافت کے زمانہ میں یعنی ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں تو قدرۃً اسکا بڑا زور بندھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے جوش میں مسلمان اس معاملہ میں بھی ہندوؤں سے کچھ آگے ہی بڑھ چلے۔ اکبر کا کہنا یہ ہے کہ خیر گائے کی جان بچی تو بچی، یہ بھی ایک سیاسی مصلحت سہی مصلحت نہیں ضرورت تک کہہ لیجئے۔ لیکن آگے چلئے۔ اصل ضرورت تو مسلمانوں کو اپنے احکام دین و شعائر ملی پر توجہ کی تھی —— تخیل کا یہ طیارہ ظرافت کی پھلجھڑی بنکر یوں پیش ہوا ؎

[1] جس زمانہ کا یہ کلام ہے علماء دین بھی کثرت سے سیاسی اور وطنی تحریکات کے جزو بنکر انہیں گھل مل گئے تھے۔ ایک حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی مع اپنے مخصوص شاگردوں اور نائبوں کی اس طوفان سے الگ اپنی دینی خدمات میں مشغول تھے اکبر کا یہ اشارہ انھیں کی جانب ہے [2] اخبارات [3] راگ۔ گیت [4] کلیات میں یہ شعر اس سے ذرا مختلف ایک دوسری بحر میں چھپا ہے مگر مجھے حضرت اکبر کی قلمی بیاض میں اسطرح لکھا ہونا یاد پڑتا ہے۔

چھوٹیں جو گائے ماتا حسرت سے اونٹ بولے[1]
افسوس شیخ جی نے ہم کو پتا نہ سمجھا

اور یہ ترک ذبح بقر کا مسئلہ تو پھر بھی بڑا تھا۔ اکبر کی نظر قومی و ملی زندگی کے چھوٹے چھوٹے جزئیات پر رہتی تھی۔ ایک روز مجلس میں یہ نامہ سیاہ حاضر تھا۔ ارشاد یہ ہو رہا تھا کہ "صاحب" کی دیکھا دیکھی اب تو ہماری ہر چیز مجلس سازی اور انجمن سازی کی نذر ہے اتنے میں ذکر انجمن ترقی اُردو کا نکل آیا۔ فرمایا "دیکھئے نہ زبان ہماری اپنی چیز تھی اب یہ ہمارے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ اس کے لئے بھی انجمن کھڑی کی گئی ہے جب ہی تو میں نے کہا ہے[2]

ہم سے چھن کر ہو گئی بزم ترقی کے سپرد
سچ کہا مرزا نے اب اُردو بھی کورٹ ہو گئی

حکومت کے دربار میں عزت کی کرسی حاصل کرنے کا جو ایک ہی طریقہ و تدبیر ہے سب پر روشن و عیاں ہے۔[3] لیکن اسے کھلے لفظوں میں کہہ دینا سب سے لڑائی مول لے لینا ہے۔ یہ اکبر کی زندہ دلی ہے جو اس تلخی میں بھی ایک شیرینی

---

[1] "حسرت" کا لفظ شعر میں بہت بلیغ ہے۔ حسرت موہانی اسوقت ہندو مسلم اتحاد کے بڑے علمبردار تھے [2] لفظ "کورٹ" کو اسکے اُردو تلفظ کے مطابق کورٹ (بروزن "موٹر" پڑھیے) — انجمن ترقی اُردو بہ طور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک شعبہ کے قائم تو عرصہ سے تھی، لیکن مولوی عبدالحق صاحب کی سکریٹری شپ کو ابھی تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا اور اسوقت سے بہ طور ایک مستقل ادارہ کے اس میں از سر نو جان پڑی تھی۔ [3] یہ انگریزی دور کے اس زمانہ کا ذکر ہے جب آنریری مجسٹریٹی خانبہادری، اور دوسرے خطابات اور تمغے خاص نشانات تقرب و اعزاز کے تھے۔

اور حلاوت پیدا کر دیتی ہے ؎

عقل نے اچھی کہی کل لالہ مجلس رائے سے
جھک کے ملنا چاہیئے ہم سب کو وائسرائے سے

"صاحب" کے ہاں عزت پانے کے لئے "لالہ مجلس رائے" کیا خوب۔ اور اسکا قافیہ وائس رائے تو بہت خوب! عقل بہ معنی مصلحت اندیشی۔

اور لطف قافیہ کے لئے ساتھ کا دوسرا شعر بھی معاً سن لیجئے ؎

شعر کیسا ہی ہو لیکن قافیے اسکے ہیں خوب
کون ایسا ہے کہ جو ہو مختلف اس رائے سے

تشبیہات کی ندرت اکبر کے نسخۂ ظرافت کا جزو اعظم ہے، وہ وہ اچھوتی نادر و لطیف تشبیہیں اور کیسی کیسی پھبتیاں انھیں برجستہ سوجھ جاتیں جو دوسروں کے ذہن میں سوچ بچار کے بعد بھی نہ آتیں — یہ ہم آپ سب ہی جانتے ہیں، اور روزمرہ دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک طرف تو شوق "صاحبیت" کا فرنگیت کا سوار رہتا ہے دوسری طرف کچھ رکھ رکھاؤ کچھ ذات برادری کا ڈر، کچھ وضع کا پاس بھی چلے جاتا ہے غرض "نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے" ایک تذبذب گو مگو اور دوعملی کا عالم قائم کبھی چار قدم آگے بڑھے تو کبھی چھ قدم پیچھے ہٹ گئے۔ کتر بیونت کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے۔ جوڑ پھر بھی نہ ٹھیک بیٹھا۔ بہ قول شخصے نہ خدا کی یافت ہوئی نہ صنم کا وصال نصیب ہوا۔ ہنسے گئے بنائے گئے قہقہے ادھر سے بلند ہوئے تالیاں اُدھر سے پٹیں — واقعیت کے اس سادہ نقش پر حضرت اکبر کی گلکاری ملاحظہ ہو ؎

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی
اُونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

اکبر کے زمانہ میں سینما کہاں تھا۔ تھیٹر ہی سب کچھ تھا۔ ناٹک دیکھنے کے لئے کسی ثقہ بزرگ کا بہ ایں جبہ و عمامہ تشریف لے جانا اور پھر اس کے لئے اونٹ ایسے مقدس جانور کا انتخاب جان بلاغت ہے، کیا کیا انگلیاں اٹھی ہونگی جب حضرت سلامت کی سواری اس سج دھج سے اونٹ پر نکلی ہوگی!

عام شاعروں پر قیاس کر کے لوگ اکبر سے بھی فرمائشی شاعری کی توقع رکھتے تھے اور فرمائشوں کی بھرمار سے انھیں زچ کر دیتے تھے۔ آپ نے بھی یہ کیا کہ ساری توقعات سارے تقاضوں کے جواب میں ایک پر لطف اور اچھوتی تشبیہ پیش کر دی ؎

عشاق کو بھی مال تجارت سمجھ لیا — اس قہر کو ملاحظہ للہ کیجئے
بھرتے ہیں میری آہ کو فونو گراف میں — کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے[1]

اخباروں اور رسالوں کی طرف سے فرمائشوں کی حد ہی نہ تھی۔ اکبر کا نام چلا ہوا، شہرت بوئے گل کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی۔ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ اس شہرت و ناموری سے خوب فائدہ اُٹھائے اور اکبر کے کلام کی چاٹ دلا کر اپنی دوکان کو خوب چمکائے۔ اکبر کہاں تک سب کو خوش رکھتے اور پھر پیرانہ سالی میں۔

---

[1] حضرت اکبر کے ایک عزیز کا بیان ہے کہ یہ نظم اسوقت کی ہے جب ایک انگریز افسر ڈسٹرکٹ جج پبلسٹی کمشنر نے حضرت سے فرمائش کی تھی کہ تحریک ترک موالات کے تردید میں کچھ کہئے۔ لیکن یہ روایت درایتہً علاوہ دوسری حیثیتوں کے اس اعتبار سے بھی کمزور ہے کہ ترک موالات کا جب زور ہوا ہے اسوقت تک کلیات کا یہ حصہ پریس میں پہنچ چکا تھا۔

مروت میں انکار کرتے بھی نہ بن پڑتی۔ آخر ایک تبہ یہ شعر چھاپ دیا ؎

یہ پرچہ جس میں چند اشعار ہیں ارسال خدمت ہے
ہمارے لخت دل ہیں آپ کا مال تجارت ہے

یہ ضرور نہ تھا کہ تشبیہیں ہمیشہ نادر اور اچھوتی ہی ہوں۔ بعض بعض جگہ معروف و مانوس بلکہ پامال تشبیہوں کو بھی استعمال کیا ہے۔ مگر اس حسن وصنعت کاری کے ساتھ کہ اس تقلید پر جدتیں نثار ہو ہو جائیں ___ مشاطہ کا کمال اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ ساٹھ سال کی بوڑھی باڑھی خاتون میں سولہ سال کی حسین و نوخیز لڑکی کی رعنائی و زیبائی حلیت کھیرتا۔ پیدا کر دکھائے ___ بعض نامور اُستادوں کو دیکھا ہوگا کہ شعر میں مضمون پیدا کرنے سے تو کورے ہیں البتہ لفظی دروبست کے بادشاہ ہوتے ہیں محاورہ کوئی غلط بند ھنے نہیں پاتا، عروض کی لغزش قدم رکھنے نہیں پاتی۔ متروکات کے ترک کا اہتمام رکھتے ہیں پہلوئے ذم پاس نہیں پھٹکتا۔ اکبر کے نگارخانہ میں شبیہ ایسے حضرات کی ملاحظہ ہو ؎

عشق کے معنی کے عالم تھے مگر عاشق نہ تھے　　　صورت عذرا سے واقف تھے مگر وامق نہ تھے

ایک دوسرا تعارف انہی حضرات کا یوں کراتے ہیں ؎

صورت لیلیٰ نہ دیکھی پڑھ لیا دیوان قیس　　　شاعری آئی نہیں لیکن زباں داں ہو گئے

طبیعت میں مضمون آفرینی غضب کی تھی۔ نمونہ اوپر ہی سے آپ دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ ایک اور ملاحظہ ہو۔ اُردو کے رسم الخط کے دشمنوں کا کہنا یہ ہے کہ اسکو گھسیٹ میں لکھا کچھ جاتا ہے اور پڑھا کچھ یہ کہنا کچھ صدق دل سے نہیں تمامتر پروپگنڈا تھا

کے ماتحت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دیوناگری کی گھسیٹ تحریر اردو کے خط شکست سے کہیں زیادہ چوپٹ ہوتی ہے اور اسکی مضحکہ انگیز مثالیں عدالتی کارروائیوں، دستاویزوں، وغیرہ کے حوالہ سے اخباروں میں بارہا نکل چکی ہیں۔ اب دیکھیے اکبر کی نازک خیالی نے اس خشک حقیقت سے کیسا تر و تازہ مضمون نکال کھڑا کیا ہے

دوستو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ تھی کام کی بات
بسکہ تھا نامہ اعمال مرا ہندی میں کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

زمانہ کی ناقدری شاعری کی دنیا کا بڑا پرانا مضمون ہے سب ہی شاعر سامعین کی بدمذاقی کا رونا روتے چلے آئے ہیں لیکن یہی صدائے درد جب چمنستان ظرافت کے اس عندلیب کی زبان سے نکلتی ہے تو نغمہ لطیف بنکر چلاتی ہے، ہنساتی ہے، اور چٹکی کو گدگدی میں تبدیل کرکے رہتی ہے ؂

قدردانوں کی طبیعت کا عجب رنگ ہے آج بلبلوں کو ہے یہ حسرت کہ ہم الّو نہ ہوئے

اردو دانوں، اردو خوانوں، اردو نویسوں کی بزم میں مرحبا اور سبحان اللہ کی گیا کمی ـــــ تحسین کے وہ غلغلہ ہائے آفریں کے وہ آوازے بلند ہوں کہ محفل کی محفل گونج جائے، در و دیوار جنبش میں آجائیں۔ لیکن لفاظی کے شور و ہنگامہ کے آگے بس خلا ہی خلا۔ بڑی سے بڑی علمی تحقیق و کاوش میں سر کھپائیے اسکے بعد خود اپنے ہاتھ سے مسودہ صاف کیجئے۔ مطبع والوں کے دروازوں پر دستک دیجئے۔ انکے سارے نخرے غمزے برداشت کیجئے۔ وغیرہ وہ صبر آزما کہ پریس کے شکنجے میں اوراق کتاب کے ساتھ ساتھ گویا مصنف کی روح بھی

دبی اور گھٹی جا رہی ہے۔ اور جب کتاب پریس سے باہر آئے تو خود ہی اشتہار لکھئے اور پھر جس طرح کتاب لکھی گئی "بہ بقلم خود" تھی، اسی طرح اسکا مطالعہ بھی بہ چشم خود ہی بلا شرکت غیرے کرتے رہئیے۔ یہ خشک حقیقت اردو اہل قلم کے لئے کیسی ہی یاس انگیز و دل شکن سہی، لیکن ذرا دیکھئے گا ظرافت کی مسیحائی نے اس بیجان لاشہ میں کس طرح جان ڈالکر اسے گویا کر دیا ہے ؎

کھلا دیوان مرا تو شور تحسین بزم سے اُٹھا
مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

شاعروں کا ضعف، لاغری و ناتوانی کا مضمون العظمۃ للہ! ضرب المثل کی حد تک پہنچا ہوا۔ جیسے دیکھئے اپنی صحت سے نالاں اپنی لاغری سے متعلق نوحہ خواں ہمارے حضرت اکبر نے اس پامال مضمون میں ندرت یہ پیدا کی کہ کمزور اپنی صحت ہی کو نہیں اپنی بیماری کو بھی باندھا اور اپنے نہ مرنے کو اپنی بیماری ہی کی کمزوری کے بل پر ثابت کر دکھایا۔ فرماتے ہیں ؎

کمزور ہے میری صحت بھی کمزور مری بیماری بھی
اچھا جو ہوا کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مر نہ سکا

ندرت قوافی کے تو بادشاہ تھے ایسے ایسے نادر قافیہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے کہ انکے تصور ہی سے دوسروں کا قافیہ تنگ ہو جاتا۔ یوں کہئے کہ انکے نمکدان ظرافت کی نمکینی کا ایک بڑا عنصر یہی نادر قافیہ بندی ہے۔ ایک جگہ بڑھاپے کی آپ بیتی دکھ درد کی کہانی سناتے ہیں لیکن طبیعت کی شوخی کا یہ عالم کہ سننے والوں کو آبدیدہ کرنے کی جگہ ہنساتے جاتے ہیں ؎

ہر طرح راحت تھی مجھکو دانت سے
قافیہ انکا ملا تھا آنت سے

صحت اب بگڑی تو انمیں درد ہے
اس طرف دیکھو تو معدہ سرد ہے

خوابِ راحت کس کو کھانا کون کھائے ۔ رات بھر کرتا رہا ہوں ہائے ہائے
درد کے آگے رہا منجن بھی گرد ۔ مصطگی[1] بھی رہ گئی بار دے زرد

ایک دوسرا زعفران زار اس سے بھی بڑھکر ملاحظہ ہو ؎

دانت کا درد بدستور چلا جاتا ہے ۔ وہی مازو وہی کافور چلا جاتا ہے[2]
ڈارون[3] کے اس لکچر کا سبق ہے اب تک ۔ وہی بندر وہی لنگور چلا جاتا ہے
برق کے لمپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ ۔ روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

"روشنی" اور "نور" کا یہ نازک فرق اسکے قبل کسی کو کیوں سوجھا ہوگا! اور پھر برقی لیمپ، سبحان اللہ۔ "نورٌ علیٰ نور"! قطعہ کا آخری شعر اپنے رنگ میں فرد ہے ؎

شیخ صاحب کی کمر جھک گئی اور دل نہ جھکا ۔ آج تک شوق سقنقور[4] چلا جاتا ہے

اشعار ذیل میں جان محض قافیہ نے ڈال دی ہے ؎

جو سچی بات ہو کہدونگا بخوف و خطر اسکو ۔ نہیں رکنے کا میں ہرگز بری تو کے کہ جن لوکے
انار آتے جو کابل سے تو پڑتے سب کے حصہ میں ۔ امیر آئے تو کیا آئے مزے ہیں "لارڈ منٹو"[5] کے

---

[1] مصطگی رومی ایک مشہور دوا ہے اور یونانی نسخوں میں پڑتی رہتی ہے۔ زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ [2] مازو اور کافور دانت کے امراض کی مشہور دوائیں ہیں۔ [3] انگلستان کا مشہور سائنس داں۔ اسکے نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوع ترقی کرتے کرتے دوسری نوع بنتی چلی گئی ہے۔ یہانتک کہ حیوانات کا ارتقا انسان پر ختم ہوا اور انسان اصلاً گویا ترقی یافتہ بندروں کی ہی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل ہے۔ [4] ماہی سقنقور یونانی طب میں مردانہ قوت کے لئے ایک مشہور دوا ہے۔ [5] لارڈ منٹو ہندستان کے وائسرائے تھے غالباً ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک امیر حبیب اللہ خاں مرحوم والئ افغانستان انھیں کے زمانہ میں ہندوستان سیاحت کے لئے آئے تھے شاہ افغانستان اسوقت امیر ہی کہلاتے تھے۔

"منٹو کے" کا قافیہ "جن ٹو کے" لانا بس اکبر ہی کا حصہ تھا۔
ایک غزل اس زمین میں ہے "مجلس تو باقی ہے، نرگس تو باقی ہے"۔
اس کے مقطع میں قافیہ "پیرس" کا لائے ہیں اور وہ بھی کس روانی اور بے تکلفی کے ساتھ ؎

یہ مصرعہ قافیہ ہی کیلئے ہے خوب اے اکبر — جو اجڑا لکھنؤ کچھ غم نہیں پیرس تو باقی ہے

اگرچہ اس میں واقعیت پر ظلم اچھا خاصہ ہو گیا۔ لکھنؤ غریب انتہائی اوج و شباب کے زمانہ میں بھی بھلا پیرس کے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکتا تھا!۔
ظریفانہ کلام میں بارہا لفظ پست و تبذل لاتے لیکن ایسا با موقع، برمحل اور بندش کچھ ایسی چست و نادر رکھتے کہ مصرعہ کا ٹھاٹھ ہی کچھ اور ہو جاتا۔ کلام میں پستی و ابتذال کی جگہ لطف و شگفتگی لے لیتی۔ اور مذاق سلیم خود پکار اٹھتا کہ بیشک "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست"۔
ایک شعر چند ہی صفحہ اُدھر نقل ہو چکا ہے ؎

شانِ نمازِ اکبر شاہانہ ہو چلی ہے — مسجد الگ بنائیں اپنی میاں وفاتی

اب "میاں وفاتی" چاہے عامیانہ ہو یا بازاری مگر اس موقعہ کے لئے موزوں اور چست کتنا ہے؟
اقبال کی مشہور نظم جواب شکوہ کا وہ مشہور بند تو سب کے ذہن میں ہوگا ؎

جا کے مسجد میں جو ہوتے ہیں صف آرا تو غریب — زحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب — پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب
امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے

زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے

اکبر نے مضمون کے اس سارے دریا کو اپنے دو مصرعوں میں اور دو ہیں کیوں ایک ہی مصرعہ کے کوزہ میں بند کر دیا ہے ؎

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

"کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن" کیا خوب! زبانی فرماتے تھے کہ ایک بار دلّی جانا ہوا (زمانہ کوئی سنہ ۱۳ء و ۱۴ء کا ہوگا) برطانوی سرکار ہند کی راجدھانی کی منتقلی نئی نئی کلکتہ سے دلّی ہوئی تھی اور دلّی بڑی تیزی سے نئی دلّی بن رہا تھا۔ اجلاس امپیریل کونسل[1] کے ہو رہے تھے اور مسلمانان ہندوستان بھر کا جمع تھا۔ ایک دن نئی دہلی کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے گیا۔ نماز کے وقت دیکھتا کیا ہوں کہ ایک پھٹے حالوں موذن صاحب تشریف لائے اور انھی کے طبقہ کے دو ایک نمازی اور۔ بس کل اتنی ہی جماعت۔ نماز کے بعد میں نے موذن سے پوچھا کہ کیوں بھائی سر........ بھی کبھی نماز پڑھنے آتے ہیں؟ اچھا وہ نہیں تو خان بہادر........ صاحب؟ وہ کبھی نہیں تو آنریبل نواب........ تو ضرور ہی آتے ہوں گے۔ موذن غریب کو ان لیڈروں کے اسم گرامی تک کی خبر نہ تھی۔ بیچارہ ہکا بکا میرا منہ دیکھا گیا۔ اسپر میں نے کہا اچھا تو یہ بات ہے "کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن" اور پیش مصرعہ بعد کو لگا دیا۔

---

[1] بعد کو جس قانون ساز مجلس کا نام سنٹرل لیجسلیٹیو اسمبلی پڑا اسوقت یہ امپیریل لیجسلیٹیو کاونسل کہلاتی تھی اور اسکی ممبری ایک خاص عزت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

ذکر غالباً ۱۹۱۱ء کا ہے۔ اس خاکسار کو الہ آباد میں حضرت اکبر کے مہمان ہونے کا شرف حاصل تھا اتفاق سے شیعہ کانفرنس کا جلسہ بھی اس زمانے میں الہ آباد میں ہو رہا تھا ـــــ ایک روز شب کے کھانے پر حضرت اکبر مسلمانوں کی زبوں حالی پر تاسف کر رہے تھے کہ ایک صاحب بول اُٹھے کہ، "کچھ بھی سہی بہرحال شیعوں سے تو ہماری اخلاقی و معاشری حالت بہتر ہی ہے"
"لسان العصر بولے کہ جی کیا بات آپ نے پیدا کر دی ہے ہم ساری خدائی سے ذلیل سہی، پھر بھی یہ اطمینان کیا کچھ کم ہے کہ شیعوں کی حالت ہم سے بھی ابتر ہے اور جب ہی تو میں نے کبھی عرض کیا ہے ے

ہر چند بے وقار ہیں مرزا کو غم نہیں
کیا کم ہے یہ شرف کہ وفاتی سے کم نہیں

"کیا کم ہے یہ شرف" اس ٹکڑے کو جی میں آتا ہے کہ بار بار پڑھے جائیے!
ایک جگہ "صاحب" کے مقابلہ میں صاحبیت زدہ گروہ کا چربہ ان الفاظ میں اتارتے ہیں ے

مسجد میں شیخ صاحب گرجا میں لاٹ صاحب
بدھو فلاسفی کے کمرہ میں مٹر رہے ہیں

کسی تپھلے کلیات میں مسلمانوں کے پاس انگیز مستقبل کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچ چکے ہیں ے

حکم برٹش کا ملک ہندو کا
اب خدا ہی ہے بھائی صلو کا

پھر جب ۱۹۱۹ء میں مسلمانوں کے ایک مشہور و معروف عالم دین نے تحریک ترک موالات میں گاندھی جی کے نقش قدم پر چلنے اور اپنے پس رو ہونے کا اعلان کیا فوراً ارشاد ہوا ے

بدھو میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں   گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اکبر۔ لفظ حرفوں سے مرکب نہیں بولتے۔ پوری کی پوری تصویر کھینچ دیتے ہیں" بدھو میاں" سے بڑھکر اور جامع اس موقع کے لئے اور کیا ہو بھی سکتا تھا؟

کلیات اول میں مسلمان خاتون کی تعلیم کا عکس بھی ایسے ہی آئینہ میں دکھلا چکے ہیں ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں   میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

گھٹا کی دولت اسپیچیں بڑھا کیں

رہیں ہر سپھر کے آیا بی نصیبن   وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

غرض یہ کہ" کلو، صلو، بیرو، حسنو، بدھو، گنگو، گھورن، جمن، وفاتی، شراتی کرمن، نصیبن وغیرہ کوئی لفظ بھی اکبر کی ٹکسال سے باہر نہیں اور وہ ہر جگہ کام انسے اپنی مرضی کا لیتے رہتے ہیں۔ اور خیر یہ تو پھر بھی علَم تھے یعنی مردوں عورتوں کے ذاتی و شخصی نام۔ کمال یہ تھا کہ زبان کے عام لفظ مبتذل طبقہ سے اُٹھا کر لاتے اور اپنے حسن بندش و کمال مرصع سازی سے گرخت و بدزیب بدہیئت۔ سنگریزوں کو نگینہ بنا خاتم شعر میں جڑ دیتے۔ داغ کی ایک غزل ہے ؎

لُطفِ مَے تجھ سے کیا کہوں زاہد   ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

اکبر نے بھی اسی زمین میں طبع آزمائی کی ہے مطلع ملاحظہ ہو ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں   فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

یہ" فالتو" بھی کیا خوب! اکبر کے سوا یہ کسی کے بس کی بات تھی کہ دیو زشت رو

کو پری جمال بنا کھڑا کر دے! شاعر کے ذہن میں جو تحقیری تصویر ایسی
عقل سے متعلق تھا اسے کس خوبصورتی سے اس لفظ نے ادا کر دیا۔

کلیات دوم میں ایک قطعہ آزادی نسواں پر ہے۔ کوئی صاحب
اپنے گھر میں بے پردگی کے خلاف کوئی وعظ شروع کرتے ہیں ــــ
لڑکیاں تردید پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اور سند میں "دولھا بھائی" کی
رائے پیش کرتی ہیں ؎

دولھا بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عمدہ ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اس کے آگے بھی لڑکیاں خاندان کے مردوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں ؎

خود تو "گٹ پٹ" کے لئے جان دئے دیتے ہو
ہم پہ تاکید ہے کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

"گٹ پٹ" اے سبحان اللہ انگریزی کی ابجد نہیں "اے، بی، سی، ڈی،"
نہیں صرف گٹ پٹ ــــ حق یہ ہے کہ زبان کا کوئی لفظ بھی مستقلاً
نہ مبتذل ہے نہ خلاف متانت۔ اصل شئے اسکا موقعہ و محل استعمال ہے
اور اکبر اس موقعہ شناسی کے بادشاہ تھے۔

الفاظ سے گذر کر بھی سلوک مثلوں۔ محاوروں کے ساتھ کرتے
رہتے ــــ بازار میں چلتے پھرتے کہیں ایک محاورہ ہتھیایا اور کہیں سے
دوسرا۔ روزمرہ کے سانچے میں ڈھال، سلاست و خوش بیانی کے قالب
پر چڑھا، رنگ و روپ ان کھلونوں کو کچھ اس طرح کا دیدیا کہ اب جسکی بھی
نظر پڑی وہ لٹو ہو گیا۔ لڑکوں اور نابالغوں کا ذکر نہیں اچھے ثقہ بڑے

بوڑھے انھیں کمال صناعی کا نمونہ سمجھ کر اپنی میز پر یا ڈرائنگ روم کی کانسول پر جگہ دینے لگے، فرش کے گلدان ان آرائشوں سے سجانے لگے ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

الفاظ ثقیلہ کو مغرب نے کیا خارج　　اب دم کی جگہ ٹنٹ مدرسے کی جگہ کالج

"بات تری دم میں نمادہ" یہ زبان شرفا کی نہیں عوام کی ہے لیکن اکبر کی کانِ نمک میں آکر ہر شے نمک ہی بن جاتی ہے۔ اس لطف و لطافت کے ساتھ انھوں نے اسکو کھپایا کہ بزرگان محفل کے چہروں پر شکن پڑنے کے بجائے اور مسکراہٹ آگئی۔

ظرافت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ الفاظ و حروف کی باہمی مناسبتوں کی جانب ذہن تیزی سے منتقل ہوتا اور پھر بھی ان مناسبتوں کے بل پر دلچسپ و پرلطف نکتے طرح طرح کے پیدا کرتا رہتا۔ فرماتے ہیں ؎

پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا　　سرٌ ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا

علاقہ پنجاب کے مقام کیمبل پور کے کوئی مذہبی اہل قلم منشی الف دین نامی تھے ایک مثنوی حقانیت اسلام پر لکھی اور حضرت اکبر کے پاس ریویو کے لئے ارسال کی۔ پیر ظریف نے دو مختصر مصرعوں میں جامع و مانع ریویو

لے سر یعنی نائٹ انگریزی دور کا مشہور اور بہت اونچا خطاب ہے۔ بال (Ball) انگریزی ناچ۔ اردو کے بال اور سر میں جو مناسبت ہے ظاہر ہے۔ بنگال کے ایک نامور شخص ایس۔ پی۔ سنہا تھے (جو آخر میں لارڈ سنہا ہو گئے تھے) جب زمانہ میں سر (نائٹ) کے خطاب سے سرفراز ہوئے تو ایسا ہی اس کے بعد یہ اطلاع بھی اخباروں میں آئی تھی کہ فلاں جگہ انگریزی رقص میں شریک ہوئے۔

کر دیا تصنیف و مصنف دونوں پر سے

"الف دین" نے خوب لکھی کتاب ملی جس سے "ب" دین کو راہ صواب

پہلے مصرعہ میں "الف" کے لام کو ساکن نہیں کسرہ کے ساتھ پڑھیے دوسرے مصرعہ میں اس "الف" کے مقابلہ میں "ب" پڑھیے سارا کھیل بس "الف بے" کا ہے۔

ذیل کا قطعہ کیا ہے ایک مستقل گدگدی ہے۔ بڑے سے بڑے خشک مزاج کے لئے بھی اور بات کچھ نہیں لفظی بھی نہیں، محض حرفی ہیر پھیر ہے

یہ کہتے تھے اک لالہ باوقار کہ عربی حروف اب تو ہیں ہم پہ بار
رکی ہے انھیں سے ہماری نمود یہ کھسکیں تو ثابت ہو اپنا وجود
کہاں کا "حرام" اور کہاں کا "حلال" ہٹے جائے حطی، رہیں "رام لال"

"حرام" اور "حلال" سے حائے حطی ہٹا کر دیکھ لیجئے نہ، وہی "رام" اور "لال" باقی رہ جائیں گے۔

کبھی یہ بھی کرتے کہ کوئی عام و معمولی سا لفظ لے لیتے، اس کے حروف میں قطع و برید کر کے نئے نئے شگوفے معانی و مطالب کے پیدا کر دکھاتے الفاظ وہی جو روز، ہم آپ بولتے، سنتے رہتے ہیں۔ اکبر کی ذہانت بس ان کے اجزا ترکیبی ہیں الٹ پھیر کر کر، نئے نئے قالب تیار کر دیتی، اور قوت خلاقی ان کاغذی تیلوں میں نازک خیالی، اور معنی طرازی کی روح پھونکتی جاتی۔ ایک آدھ مثال اس صنعت گری کی ابھی ادپر گزر

چکی ہے، دو ایک مثالیں وہ بھی بے ساختہ دھاوا کیے، زبان قلم پر چلی آرہی ہیں۔ لکھنؤ سے ۱۹۱۶ء میں جب روزنامہ ہمدم پہلے پہل نکلا ہے۔ جالب مرحوم دہلوی کی ادارت میں اور اس اس نام کے موجودہ اخبار سے بالکل ہی مختلف تو اسی پر ارشاد ہوا ہے

خوب ہی نام اس کا گر ہمدم رہے
"دم" نکلنے پر بھی باقی "ہم" رہے

کیا بے تکلف سجع ہے!

الف، ب، ت کے نام سے واقف تو جاہل تک ہیں لیکن کسی بڑے عالم نے بھی محض ان ناموں سے تصوّف و معرفت کا یہ درس کیوں حاصل کیا ہوگا ہے

الف، ب، ت ہی کو پڑھ کر میں سمجھا
الف اللہ کا، اور ماسوا بت

"ب" اور "ت" کو ملائیے تو بت بن جاتا ہے یا نہیں؟ بس تو اکبر کا کہنا یہ ہے کہ الف تو اللہ کا ہو گیا، اور اللہ کے سوا اب جو کچھ وہ بت ہی بت ہے! کیا نیا رنگ وحدت الوجود کو دے دیا!

"تعلیم" کا لفظ ہر شخص کی زبان پر ہے۔ علیؓ کا نام بھی عالم و عامی سب ہی جانتے ہیں اور پڑھے لکھے تو انھیں باب مدینۃ العلم بھی مانتے ہیں، اب اکبر کی شاعری اور ساحری یہ ہے کہ ان دو بظاہر بالکل بے تعلق لفظوں کے درمیان رشتہ؟ اور کیسا گہرا رشتہ پیدا کر دیتے ہیں! ہے

سمجھاتی ہے مجھے نکتہ یہ میری طبع سلیم
علیؓ کی "تم" میں جگہ ہو تو بس وہی تعلیم

ظاہری پہلو تو یہ ہوا کہ لفظ "علی" کو اگر "ت" اور "م" کے حصار کے اندر

لے لیا جائے تو لفظ تعلیم بن جاتا ہے معنوی پہلو یہ ہے کہ حُبِ علیؓ کو قلب میں جگہ دینا حقیقی تعلیم ہے۔

سیاسیات کے دائرہ میں خود بلاغت ان کے اس تراش و خراش کی بلائیں لیتی ہے، سخن سنجی سر دھنتی ہے، معنی طرازی وجد میں آ کر رہتی ہے۔

قطعہ ملاحظہ ہو ؎

"ہ" سے ہندو "م" سے مسلم یہ دونوں مل گئے "ہم" | سر پہ انگریزی "الف" اس سے ہوئی حاصل "اہم"
ہے "الف" اہم کو جداً لیکن محافظ اور معین | اسکے سایہ میں ہیں یا "ہ" "م" شامل ہوں بہم

لفظ "اہم" کی کتابت میں دیکھئے نہ حرف "الف" کیسا اکل کھرا، الگ تھلگ، سر کشیدہ نظر آتا ہے، بخلاف اس کے "ہ" اور "م" باہم شیر و شکر، ایک دوسرے سے مدغم! "ہ" اور "م" کے ادغام کی تصویر آج ۱۹۴۳ء میں، تو شاعرانہ معلوم ہو گی لیکن ۱۹۲۰ء میں جب یہ شعر کہا گیا ہے، اسوقت یہ نقل تمامتر مطابق اصل تھی، باقی انگریزی "الف" کی اہمیت، اس کا اکل کھرا پن اور اس کا سر پر ہونا یہ کیفیتیں تو آج بھی جوں کی توں ہی ہیں۔

اسی گلشن کے ایک دوسرے چمن کی سیر ؎

سر تراشا اُن کا۔ کاٹا اِن کا پاؤں | وہ ہوئے ٹھنڈے، اگئے یہ بھی پگھل
شیخ کو تخ کر دیا، مومن کو موم | دونوں کی حالت گئی آخر بدل

شیخ کا سر "ش"، تراش دیجئے تو بیچارہ تخ ہو کر نہ رہے تو اور کیا کرے مومن کا پیر "ن"، کاٹ دیجئے تو بجز "موم" بن جانے کے اور کر ہی کیا سکتا ہے؟ باقی کس نے شیخ اور مومن کو یوں بے سر و پا کر دیا، تو اب کیا

ناظرین اتنی سخن فہمی سے بھی گئے گزرے ہوئے!

اکبر کے سنجیدہ کلام کا ذکر تو آگے آئے گا، لیکن ظریفانہ شاعری بھی اس پیرِ ظریف کی معنویت سے خالی نہ ہوتی۔ اوپر مثالیں بار ہا گزر چکیں کبھی کبھی اتفاقیہ دو چار شعر محض ہنسنے ہنسانے کے لئے بھی کہہ دیتے، ورنہ عموماً صرف پردہ ظرافت کا تھا۔ باقی اصلاً مدنظر، کسی مذہبی، اخلاقی یا سیاسی مسئلہ کی تعلیم ہی رہتی وہ بڑا فرق اپنے اور عام شاعروں کے درمیان پاتے۔ کبھی کہتے ؎

میں اپنے آپ میں، ان شاعروں میں فرق پاتا ہوں
سخن اُن سے سنورتا ہے، سخن سے میں سنورتا ہوں[۱]

یوں بھی کہا کرتے کہ شاعری سے مقصود تفریح و تفنن نہیں۔ یہ تو ایک آلہ ہے نفس کی تربیت و اصلاح کا اور کہیں یوں ارشاد فرماتے ؎

ہے میری شاعری دلِ آگاہ کے لئے
تنخواہ کے لئے ہے نہ ہے واہ کے لئے

جو کچھ کہوں وہ ہو فقط اللہ کے لئے
ہے یہ دعا کہ ترکِ فضولی نصیب ہو

نہ کھل چکا تھا، ورنہ مرا آہ کے لئے
اک غل مچا کہ اسکو بھی لیسنس ہی ضرور

سنجیدہ بیانی کے باوجود آخری شعر میں ظرافت کے چٹخارے کے بغیر نہ رہ سکے۔

---

[۱] حالیؔ کے بھی ایک قطعہ کا آخری شعر ملاحظہ ہو ؎

حالی کو تو بدنام کیا اسکے وطن نے
پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

حالی کا خطاب اپنے ہمعصروں سے ہے جنکے ترکش کا سب سے بڑا تیر یہ تھا کہ نہ دہلوی، نہ لکھنوی یہ پانی پتی بھلا شعر اور زبان کیا جانے۔

مشہور و پر عظمت شخصیتوں کی مخالفتیں بھی بڑے زور شور کی ہوئی ہیں۔ اکبر کی مخالفت اس درجہ میں تو نہ ہوئی۔ پھر بھی کبھی کبھی یار لوگ فن عروض ولغت کی کتابیں بغل میں دبا نکلتے ہی رہتے اور کلام اکبر کی طرف انگلیاں اُٹھا دبی زبان سے کہتے ہی رہتے کہ یہاں یہ فن کی غلطی ہے۔ وہاں یہ لغزش ہے۔ اکبر بحث و مباحثہ کے قریب بھی نہ جاتے، نہ زبانی نہ تحریری، دوسروں کو نصیحت کیا کرتے کہ کبھی مدعی کے منہ نہ لگنا۔ اور کسی صاحب دعویٰ سے سوال وجواب میں نہ پڑنا۔ پھر بھی بشر تھے۔ منہ میں زبان رکھتے ہی تھے کبھی کبھی کچھ کہہ ہی اُٹھتے۔ جو بول ان کے منہ سے نکل جاتے۔ ظریفانہ ادب میں پتھر پہ لکیر بن جاتے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

تم سے استادوں میں کیا میری شاعری بیکار ہے؟ ساتھ سارنگی کا بلبل کیلئے دشوار ہے

کہاں بلبل کی قدرتی، بے ساختہ ہم آہنگی، کہاں سارنگی کی مصنوعی روں روں! خیر یہ تقابل تو ہئی ہے، باقی یہ سارنگی کے ضلع میں "استاد" بھی کیا خوب! ایک دوسری جگہ شوخی کا نمک ذرا تیز کر دیا ہے ؎

قاعدوں میں حسن معنی گم کرو شعر میں کہتا ہوں ہجے تم کرو

اب چند شعر بلا کسی تنقید و تبصرہ کے یوں ہی ملاحظہ کرتے چلیے۔ باغ کی سیر آزادی و بے فکری سے خود بھی تو ایک چیز ہے۔ یہ کیا کہ پھولوں کے نام، نشان، رنگ و بو کی پوچھ پاچھ قدم قدم پر مالی سے ہوتی رہے ؎

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

ہمیں کیا بالشویک آ گیا یا روس آتا ہے یہاں تو فکر سر پائی ہے ماہ اور پوس آتا ہے[1]

---

[1] جنگ زمانہ کا یہ شعر ہے روس میں نیا نیا "بالشویک" انقلاب ہوا تھا، اور "بالشویک" حملہ کا دھڑکا ہر وقت ہندوستان پر لگا رہتا تھا۔

ایرشپ[1] سے ہم اماں اے چرخ پائیں گے کہاں
آسماں بولا کہ ہم سے اڑ کے جائیں گے کہاں

ممبر علی گڑھ آرہے ہیں یا سکھ نداہان ہیں!
لیکن معائنہ کو وہی نابدان ہیں

ہجر کی شب یونہی کاٹو بھائیو
ان کا فوٹو لے کے چاٹو بھائیو

طاعون کی بدولت انکو بھی ارتقا ہے
جو مارتے تھے مکھی اب مارتے ہیں چوہے

شاعر جو لازم ہوا اکبر، ذو قافیتیں ہے اسکا لقب
پوچھو گے یہ کیوں تو صحیح سنو، تنخواہ بھی ہے اور وہ بھی ہے

جب غم ہوا چڑھا لیں دو بوتلیں اکٹھی
ملا کی دوڑ مسجد اکبر کی دوڑ بھٹی

تھے معزز شخص لیکن انکی لاالف کیا کہوں
گفتنی درج گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی

ارتقا نے کی برکت دیکھئے
تاجراب اہل قلم ہیں بانس کے

محاورات کو بدلیں "براہ ریل" جناب
"ٹکٹ بدست" کہیں اب بجائے "بابرکاب"

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے
ایک ہے خفیہ پولیس میں ایک پھانسی پا گئے

یہ سب شعر زیادہ تر وہی شعر ہیں جو ان کے مطبوعہ کلیات میں موجود ملیں گے، لیکن ظریفانہ کلام کا ایک اچھا بڑا حصہ ایسا بھی ہے جس کے چھاپنے کے وہ اپنی زندگی میں کسی طرح روادار نہ ہوئے۔ شاعر، آخر شاعر، خدا جانے کیسے کیسے وہم انھیں گھیرے رہتے اور چھاپنا تو الگ رہا ناجنسوں کو سنانے تک بھی نہیں تھے۔ بے تکلف دوست یا نیاز مند کو اگر کہیں سنا بھی دیا تو تو تاکیدیں کہ خبردار اسے میری زندگی میں شائع نہ کر دینا، اس مخفی کلام کا بیشتر حصہ تو ایسا ہے کہ حضرت اکبر کی زندگی میں بھی بے تکلف شائع کیا جا سکتا تھا، اور اب دنیائے فانی سے انکے تعلقات ختم

[1] (AIRSHIP) ہوائی جہاز

ہو جانے کے بعد تو تھوڑا بہت مضائقہ بھی اس کی اشاعت میں باقی نہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ کلام بجز ان کے "صاحبزادہ" کے اور کسی کے پاس ہے کہاں؟ اور صاحبزادے صاحب اس خزانہ کے سانپ کی حیثیت رکھے ہوئے ہیں۔ البتہ دو چار شعر، متفرق طور پر ادھر اُدھر سے سنے سنائے یاد رہ گئے وہ حاضر ہیں۔ ہائے اسوقت کیا خبر تھی کہ چند ہی روز میں یہ گوہر بے بہا ایسے نایاب ہو جائیں گے اسوقت اسکا احساس ہوتا تو چرا چھپا کر، ضد کر کے، منا کر، غرض زاری سے، زور سے، زر سے، جس طرح بھی ممکن ہوتا، نقلیں ان منہ سے نکلے ہوئے الہامات کی ضرور ہی حاصل کر لی جاتیں!

اکبر بڑے گہرے مذہبی! لیکن تقشف و تنگ خیالی سے بالاتر، عابد، عالم، صوفی تھے، "زاہد خشک" نہ تھے۔ سید احمد خانی تحریکوں کو ملت کے حق میں زہر قاتل سمجھ رہے تھے۔ خود سر سید کی زندگی میں ان تحریکوں کو اپنی میٹھی چھری سے کچوکے ہی دیتے رہے۔ اور نہ کلیات کے ہر حصہ میں تو خوب کھل کھیلے ہیں، تاہم ذات سر سید احمد خاں کے مخالف نہ تھے اور ان پر فتاوی کفر کی بارش ہو گئی تھی! اس کے قائل نہ تھے کہتے تھے، خدائے رحمن و رحیم کی رحمت و مغفرت ہر کلمہ گو کے لئے بے پایاں ہے ہمارے مولوی صاحبان نے خواہ مخواہ اسے اس قدر ضابطوں، قاعدوں میں جکڑ رکھا ہے۔ وہاں نیت کا سوال سب پر مقدم ہے مسلمان گنہگار کے حق میں بالکل مولانا روم کے ہم مسلک و ہم زبان تھے ؎

ما بروں را ننگریم و قال را ‫ ‫ ما دروں را بنگریم و حال را

ناظر قلبیم کو خاشع بود — گرچہ گفت لفظ نا خاصع بود

آخر زمانہ کی ایک غزل "دوا ہو یا نہ ہو" "شفا ہو یا نہ ہو" کی زمین میں ہے
اس میں کہتے ہیں ے

مولوی صاحب نہ چھوڑینگے خدا گو بخش دے — گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو یا نہ ہو

مولوی صاحبان کی تشبیہہ پولیس والوں سے ہی بڑی پر لطف ہے ایک طرف ان کا احترام بھی، فرض شناسی کی داد بھی، دوسری طرف انکی ضابطہ پرستی پر طعن بھی! خیر یہ شعر تو عمومی پہلو رکھتا ہے۔ ایک رباعی اپنے مخصوص رنگ میں سید احمد خانیوں ہی کو پیش نظر رکھ کر کہی ہے چوتھے مصرعہ میں شوخی ذرا اپنے حد سے تجاوز کر گئی ہے یہ طریقہ اکبر کا نہ تھا ہر بزرگ کے نام کا بڑا ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ پہلے اور تیسرے مصرعہ کے الفاظ پوری طرح حافظہ میں نہیں ممکن ہے کہ فرق ہو گیا ہو ے

کتا جیسے بھکہ پھیفہ دوڑے — یوں دہریہ نیچری خلیفہ دوڑے[۱]
جب مر کے چلے جنت حضرت — لٹھ لے کے امام ابو حنیفہ دوڑے

آخر ۱۹۱۵ء تھا جب لکھنؤ میں رباعی اس زندہ دل زندہ جاوید شاعر نے اپنی زبان مبارک سے ہنستے ہوئے اور اس سے کہیں زیادہ ہنساتے ہوئے سنائی تھی مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ "دیکھئے میری زندگی میں کہیں چھاپ نہ دیجئے گا ورنہ مولوی صاحبان جان غضب میں کر دینگے میں نے تو جنت کا خیالی سماں دکھایا ہے یہ لوگ اسی دنیا میں میرے

۱؎ یہ رباعی غالباً کلیات چہارم میں بھی جگہ نہ پا سکی ۱۹۵۱ء

اوپر لٹھ لیکے دوڑ پڑیں گے!!

۱۹۱۹ء میں جب ترکی سے (بہ سلسلہ جرمنی) برطانیہ کی جنگ ختم ہو چکی تھی اور برطانوی مدبرین قسطنطنیہ سے ترکوں کے اخراج کا منصوبہ باندھ چکے تھے اُس وقت اسی قافیہ کے ساتھ پھر ایک رباعی ارشاد ہوئی۔ فرمانا یہ تھا کہ اسلام کا مذہبی اثر تو مدت ہوئی قلوب سے مٹ چکا ہے اب نہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں عبادت کے چرچے ہیں اور نہ درسگاہوں میں کہیں دینی تعلیم کا رواج ہے۔ لے دیکے دنیوی اقتدار کی یادگار ایک ترکی سلطنت باقی تھی۔ یہ جھلملاتی شمع بھی زمانہ کی تیز آندھی کے جھکڑوں سے گُل ہو کر رہی۔ مسلمانوں کے لئے یہ حادثہ قیامت کا اثر رکھتا ہے، مجازاً بھی حقیقتہً بھی، مجازاً تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھکر مصیبت مسلمانان عالم کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے کہ انکا شیرازۂ ملی ہی منتشر ہو گیا۔ اور حقیقتہً اس لحاظ سے کہ حدیث نبوی کی پیشین گوئی کے مطابق قسطنطنیہ سے اسلامی حکومت کا اُٹھ جانا قرب قیامت کی علامت ہے۔ اب دیکھئے اس سارے مضمون کو کیسا کوزہ میں بند کیا ہے ؎

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت | کالج سے امام ابو حنیفہ رخصت
صاحب" سے سنی ہو اب "قیامت" کی خبر | قسطنطنیہ سے ہیں خلیفہ رخصت

مرثیہ کے مضمون کو لطیفہ کی صورت میں پیش کرنا اکبر ہی کا حصہ تھا۔ اللہ اکبر!

سر جیمس مسٹن (لفٹنٹ گورنر یو۔پی) کی حکومت علی گڈھ سے ناخوش ہوئی

کچھ ادھر کا اشارہ پا، اور کچھ دوسرے اسباب سے بھی علیگڈھ کا زور اور مرکزیت توڑنے کے لئے اودھ کے شیعہ رئیسوں نے لکھنؤ میں ایک شیعہ کالج کی طرح ڈال دی، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ تعلیم کے متوالے "روشن خیالوں" کو بھلا "کالج" سے کیوں اختلاف ہونے لگا۔ انھیں منہ مانگی مراد ملی۔ لیکن شیعوں میں بھی جو دور اندیش تھے وہ تاڑ گئے کہ یہ تو صریح ضرب ہے علیگڈھ کی مرکزیت پر۔ عین اسی زمانہ میں حضرت اکبر کا آنا لکھنؤ ہوا۔ مشہور شیعہ رئیس راجہ صاحب محمود آباد[1] کے ہاں کے ایک شیعہ صاحب ملنے آئے چرچے تو ہر جگہ ہو ہی رہے تھے۔ یہاں بھی بات اسی کالج کی چھڑ گئی۔ وہ صاحب بولے "ہمارے سرکار اسی لئے تو کالج سے بالکل الگ تھلگ ہیں خواہ مخواہ شیعہ سنی کے درمیان ایک اختلاف کی بنیاد پڑ رہی ہے" اکبر اپنی سنیت میں بڑے سخت لیکن انگریزی تعلیم اور انگریزی کالجوں کے حقیقت شناس کچھ اس سے بھی زائد تھے، بولے جی نہیں علیگڈھ والوں کو کیوں برا لگے گا وہ تو اور خوش ہونگے کہ چلئے ہماری تحریک کو کامیابی ہوئی اور ہماری ہی ایک شاخ اور کھل گئی۔ جب ہی تو میں نے کہا ہے ؎

سید صاحب کو عذر کیوں ہونے لگا ... کالج ہے یہ کچھ امام باڑا تو نہیں

یہ بھی کیا کوئی مذہبی چیز ہے؟ مسجد ہے؟ امام باڑا ہے؟ علیگڈھ والے

---

[1] راجہ محمد علی محمد خاں والئ محمود آباد (بعد کو سر مہاراجہ محمود آباد) اپنے زمانہ میں مسلمانوں کی ملی زندگی میں ایک بڑا امتیازی مرتبہ رکھتے تھے اور سالہا سال انکا شمار مسلمانوں کے بڑے لیڈروں میں ہوتا رہا۔

اس سے کیوں چڑھنے لگے وہ تو اور خوش ہونگے کہ چلئے ہمارے ہی مشن کی اعانت ہوئی۔

کیا نگاہ تھی۔ قومی۔ ملّی مجلسی زندگی کے ہر بڑے چھوٹے ایک ایک جزئیہ پر نظر رکھتے نظر بھی کیسی عقابی، ہمہ گیر نظر۔ لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الّا احصاھا[1] کا نمونہ مجال کیا کہ اِدھر واقعہ، غیر معمولی نہیں، معمولی سا بھی ہو، اور اُدھر وہ پیر ظریف کے رجسٹر میں درج نہ ہو جائے! اور پھر جو تصویر تیار کرتے اس میں کیسے کیسے بظاہر بے جوڑ واقعات میں جوڑ اور بے ربط حالات کے درمیان ربط پیدا کر دیتے تھے۔ دلکشی اور دلآویزی تو حصّہ تھی ان کے تخیل کا۔

ذکر شروع ۱۹۱۷ء کا ہے۔ علیگڈھ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اسوقت مسلمانوں کی بڑی چہیتی اور سب سے بڑی مرکزی انجمن تھی۔ اس کے کارفرما صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب پر اخبارات میں لے دے زور شور سے ہو رہی تھی کہ اتنے میں وہ وزیر ہند کی انڈیا کونسل کے ممبر ہوکر لندن تشریف لے گئے۔ انکے جاتے ہی طوفان مخالفت دھیما پڑ گیا ایک واقعہ یہ اپنی جگہ پر تھا۔ دوسرا واقعہ عین اسی زمانہ میں پیش آیا کہ لکھنؤ میں ایک صاحب تھے مولوی نظام الدین حسن نیوتنوی ..... ایک اعلیٰ پنشنر عہدیدار اور ریاضیات و ہیئت کے ماہر۔ انھیں رویت ہلال کے مسئلہ

---

[1] سورۃ الکہف کی آیت۔ ذکر نامہ اعمال کا ہے کہ قیامت میں اسے دیکھ، کافر چلّا اٹھیگا کہ "ہائے میری کمبختی یہ کیسا رجسٹر ہے کہ چھوٹی بڑی کوئی چیز اس نے چھوڑی ہی نہیں"۔

پر مضمون نگاری کی سوجھی۔ لکھنؤ کے مقبول و مشہور روزنامہ "ہمدم" میں (سید جالب والے ہمدم میں) لکھ دیا کہ علم ہیئت کا حساب بالکل کافی اور قابل اعتماد ہے۔ ہلال کی شہادت عینی سے بے نیاز کر دینے والا۔ علما، شریعت اس بدعت پر کیسے سکوت اختیار کر سکتے تھے۔ فرنگی محل لکھنؤ سے جواب پر جواب نکلنے شروع ہوئے۔ اچھا خاصہ اکھاڑا قائم ہو گیا۔ قلمی اور اخباری اکبر کی ذہانت کب چوک جانے والی تھی۔ دونوں بے تعلق، بے ربط واقعات کو ایک رشتہ میں پرو کر موتیوں کی لڑی تیار کر دی۔ پوری نظم تو اب یاد نہیں ہے قطعہ کی جان آخری مصرعہ تھا۔ ع

آفتاب احمد گئے تو چاند خاں پیدا ہوئے

کیا کہنا ہے ہماری قوم کی زندہ دلی کا! کوئی نہ کوئی پھلجھڑی ہر روز اسکو چاہیئے۔ کل تک قوم کے آفتاب پر گرم گرم نگاہیں پڑ رہی تھیں۔ ان بیچارہ کی گلو خلاصی ہوئی، تو لیجئے مسئلہ رویت ہلال پر چاند ماری شروع ہو گئی!

۱۹۲۰ء کا آغاز تھا کہ تحریک خلافت کے سلسلہ میں ایک وفد کا یورپ جانا طے ہوا۔ صدر وفد رئیس ملت مولانا محمد علیؒ تھے۔ ایک رکن مولانا سید سلیمان ندوی (مدیر رسالہ معارف) بھی قرار پائے۔ اکبر کو یہ بات کھل گئی کہ ایک عالم دین سیاسیات کا ضمیمہ بنے ہوئے ولایت جا رہے ہیں۔ شاعری کی ساحری اور الفاظ کی نظر بندی ملاحظہ ہو کہ پیشانی کی چڑھی ہوئی تیوریوں کو خندہ جبینی اور مسکراہٹ کے نقاب میں لپیٹ یوں گویا ہوئے

سلیمان کی بات کیسی بنی | کہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی
رہے بادہ نوشوں سے بیشک کھنچے | مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علی کی رفاقت میں ہیں | خدا عیزر سے انکو کر دے غنی

اپنے دل کو شبہ کیا معنی یقین ہے کہ یہ نظم بس اتنی سی نہ ہوگی کچھ اور بھی ضرور فرمایا ہوگا لیکن اپنی زبانِ مبارک سے سنایا صرف اسی قدر تھا۔[۱] گو بہت کم لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ شوخ نگاری کی باگ ذرا ڈھیلی چھوڑ دیتے اور ظرافت کے حمام میں مخلّی بالطبع ہوکر داخل ہوتے۔ اسوقت متانت اپنا منہ پھیر لیتی اور شائستگی کی آنکھیں نیچی ہو جائیں۔ ایک ہلکا سا نمونہ اس صنعت کا بھی ملاحظہ ہو۔ یورپ میں جنگ عظیم برپا ہے۔ ترکی غریب پر ہر طرف سے یلغار ہے۔ بتیس دانتوں میں ایک زبان۔ اور روزانہ دردناک خبریں آرہی کہ آج یہ مقام گیا کل وہ۔ یہانتک کہ حریف کا قدم سالونکا پہنچ گیا (اس مقام کا نام یاد رہے) سارا عالم اسلامی۔ غم و اضطراب میں مبتلا۔ مرکز خلافت کی مظلومیت و بےکسی پر دنیائے اسلام کا ایک ایک گھر ماتم کدہ بنا ہوا۔ عین اسوقت حضرت اکبر اپنے بند کمرہ میں یہ چار مصرعے بے تکلف دوستوں کو سناتے ہیں۔ منٹ دو منٹ کے لئے اُداسی بشاشت میں بدل جاتی ہے اور آہیں بھرنے والے بے اختیار کھکھلا کر ہنس پڑتے

---

[۱] بادہ نوشی کے سلسلے میں "کھنچنا" اور چائے کے ضلع میں "گاڑھی چھننا"، خوب ہی نہیں بہت خوب۔ انھیں مولانا سلیمان ندوی کے متعلق اسی سلسلہ وفد یورپ میں یہ شعر بھی ارشاد ہوا ہے[۲]

دعائیں کر رہے ہیں ہم یہاں مسجد کی دریوں پر | مبارک ہو سلیمانی نظر پیرس کی پریوں پر

میں ارشاد ہوتا ہے ؎

یورپ کی لیڈیاں بھی ترکی حرم میں آئیں
پھر کر گئے اُس پہ قبضہ کہدیں یہ ترک اُنسے

ملحوظ رکھے دنیا اس رشتۂ بہم کو
"سالونکا" سہی اب تو سالونکالو ہم کو

نظم شدہ دلّی کے ایک ہفتہ وار کو ہاتھ لگ گئی اور اُسنے اپنے یہاں چھاپ بھی دی۔ حضرت اکبر کو خبر ہوئی بہت ہی جز بز ہوئے کہ ان اخبار والوں تک کون ایسی خبریں پہنچا دیتا ہے۔ اس خاکسار نے عرض کیا کہ "مگر نظم میں کوئی بات ایسی ویسی تو ہے نہیں۔ جس لفظ کو کریہہ خیال فرمایا گیا ہے اس میں آپ نے کراہت اور اسکی دشنامی حیثیت باقی ہی کب رہنے دی ہے؟ پہلے اور دوسرے مصرعہ میں تو آپ نے خود ہی رشتہ کا اعلان کر کے دنیا کو خوب جتا دیا ہے اور آپ اسے مستقل رشتہ کی حیثیت سے لائے ہیں۔ گالی اب وہ رہی کہاں ہے؟" اس گذارش سے حضرت مطمئن تو نہ ہوئے لیکن محظوظ ضرور ہوئے۔

(ب) سیاسیات

سیاسیات سے براہ راست حضرت اکبر کو کبھی دلچسپی نہیں رہی،
نہ انکا یہ فن نہ اس موضوع سے اُنھیں کوئی خاص مناسبت، لیکن تھے
پورے مشرقی اور مشرقی سے بھی بڑھکر مذہبی، پھر دل و دماغ نہایت
درجہ حساس، اسلئے مذہب کی توہین اور مشرقیت کی چوٹ پر تڑپ جاتے
اور جب کبھی سیاسی کانٹوں کو مذہب و اخلاق کے دامن سے گتھا خیال
کرتے دیکھتے تو قدرۃً یہ بات انکے دل میں چبھ جاتی، اور مجبوراً خار
زار سیاست میں قدم رکھکر کانٹوں کو ایک ایک کرکے چنتے۔

عمر کا بیشتر حصہ سرکاری ملازمت میں گذارا اور ملازمت کا
آخری زمانہ تو خاصے اعلیٰ عہدوں پر۔ اسکے بعد بھی پنشن کے طوق سے
گراں بار اور خطاب خان بہادری کی زنجیر طلائی سے پا بجولاں رہے۔
اسلئے زبان پر آخر تک مصلحت اندیشیوں کی مہر لگی رہی، اور ناطقہ قلب
و دماغ کی پوری ترجمانی کھلے الفاظ میں نہ کرسکا۔ تاہم ظرافت کا نسخہ
ایسا ہاتھ میں موجود تھا کہ جسے جتنی تلخ دوا چاہتے کھلا دیتے اور اوپر
شکر کا غلاف اسقدر دبیز رکھتے کہ کھانے والا ادھر حلق سے کڑوی کسیلی
گولیاں اتارتا، اور ادھر زبان ہے کہ فرط حلاوت سے ہونٹ چاٹتی رہتی۔

۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت و ترک موالات دونوں کا جوش اپنے شباب پر تھا۔ وفات سے چند ماہ بلکہ شاید چند ہفتہ ہی قبل ایک پورا رسالہ گاندھی نامہ کے نام سے کہہ ڈالا اس میں خلافت و ترک موالات کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مختلف خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ افسوس ہے کہ ایسی پُر لطف نظم نہ مرحوم کے زمانہ میں شائع ہوئی نہ اب اسکے بعد بھی (۱۹۴۴ء میں) جب شاعر اور خود تحریکات کو ختم ہوئے اتنا عرصہ ہو چکا ہے اور اب اس نظم میں ظاہر ہے کہ کوئی زندہ لطف باقی نہیں رہ سکتا۔ زندہ لطف تو جبھی تک رہتا ہے جبتک متعلقہ شخصیتیں جیتی جاگتی رہتی ہیں! ہاں تاریخی لطف البتہ بعد کو بھی قائم رہ سکتا ہے۔ وفات سے چند ہفتہ قبل جب آخری بار الہ آباد میں حاضر خدمت ہوا ہوں، چند شعر زبان مبارک سے سننے میں آتے تھے۔ افسوس ہے کہ اب ان میں سے کوئی بھی یاد نہیں نقل لینے کی اجازت اُسوقت کیا ملتی خود اپنی بھی ہمت اجازت مانگنے کی نہ پڑی۔

کلیات سوم میں سیاسی اشارے کنائے، رمز، تلمیحیں ایک دو جگہ نہیں سیکڑوں جگہ ملیں گی۔ کہیں کہیں ایسا ہے کہ کوئی مخصوص مسئلہ نہیں بیان کیا ہے بلکہ ملک کی عام سیاسی فضا کی مصوری کی ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر قالب غزل کا اختیار کیا ہے۔ چنانچہ جب نظر بندیوں کی گرم بازاری تھی اور محمد علی، شوکت علی ابو الکلام سب نظر بند ہو چکے تھے، ذیل کی

۱؎ بالآخر گاندھی نامہ گو بہت غلط سلط ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا

بلیغ و پُر معنی غزل ارشاد ہوئی ہے

زباں ہو ناتوانی سے اگر بند — مرے دل پر نہیں معنی کی در بند
ہماری بیکسی کبتک چھپے گی — خدا پر تو نہیں راہ خبر بند
بہ یادِ رنج یاراں نظر بند — کیا ہم نے بھی اب ملنے کا در بند
دلوں میں دردہی کی کچھ کمی ہو — نہیں ہو آہ پر راہِ اثر بند
بُتِ مشرق نہیں محتاجِ ساماں — کمر ہی جب نہیں، کیسا کمر بند
کہونگا مرثیہ اس غم میں ایسا — کھلے معنی دکھائے جبکا ہر بند
خیالِ چشمِ فتاں میں ہوا محو — مرا دل اب ہو سینہ میں نظر بند

لیکن اظہارِ خیال کی یہ صورت خال ہی خال ہو۔ عام دستور یہ ہے کہ یا تو سیاسی فلاح و ترقی کی کوئی خاص اصل بیان کرتے ہیں یا اسباب تنزل میں کسی متعین سبب کی جانب رہنمائی کرتے ہیں، یا موجودہ صورت حال سے مستقبل کا استنباط کرتے ہیں، اور یا پھر حریف کے کسی زبردست وار کو رد کرتے ہیں۔ تحریری سیاسیات کا عالم جیسا کچھ دشوار گذار ہے سب کو معلوم ہو۔ بڑے بڑے محتاط مسافروں اور بڑے بڑے ہوشیار سیاحوں نے جب اس وادی میں قدم رکھا ہو تو اپنے تئیں زخموں سے چور اور جراحتوں سے دوگارہی پایا ہو۔ لیکن اس ہمیر سخن کا اعجاز یہ تھا کہ اسکے قدم رکھتے ہی یہ خارزار بھی چمنستان بن گیا، سفر کی خستگی تفریح میں تبدیل ہوگئی اور کانٹوں کی چبھن کی جگہ پھولوں کی مہک نے لے لی۔

اعتراض بہت پُرانا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کی اشاعت

بزور شمشیر کی۔ ایک لطیف الزامی جواب کی جانب سب سے پہلے اکبر کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ہماری شمشیر کی یہ دھوم دھام ہے لیکن آپ نے اپنی توپ کے کارناموں پر کبھی نظر کی ہے۔ ہم نے بالفرض شمشیر کے ذریعہ سے اشاعت کی تو مذہب ہی کی، توحید و رسالت ہی کی۔ گردنیں اسلئے ماریں کہ دوزخ کے عذاب سے بچائیں جنت کی دائمی راحت کی راہ دکھائیں۔ مے فروشی، سود خواری، بے حجابی، حرامکاری، زر پرستی، فواحش کی اشاعت کے لئے تو نہیں کی۔ توپ دم سارے کے سارے قبیلوں کو اسلئے تو نہیں کردیا کہ قبضہ انکے گھروں پر انکی جائدادوں پر، انکی دولت پر کریں اور ان کی جانوں کو، اولادوں کو اپنی غلامی میں لیں، لمبے چوڑے مضمون کو دو شعروں میں یوں ادا کرتے ہیں ؎

اپنے عیبوں کی نہ کچھ فکر نہ کچھ پروا ہے
غلط الزام بس اوروں پہ لگا رکھا ہے

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

کمزور و ناتواں قوموں کی قوت مقاومت توڑنے اور انکے جسموں کو ہلاک کرنے کے لئے تو توپ، گولہ، بندوق، مشین گن استعمال ہوتی ہیں پھر جہاں تسلط ہوا اور قدم جما انھیں بدبختوں کے دلوں، دماغوں اور روحوں کو غلامی کے سانچہ میں ڈھالنے کے لئے اسکول اور کالج اور خدا جانے اور کیسی کیسی تعلیم گاہیں کھولدی جاتی ہیں۔ غرض کمزور اقوام کے مقابلے میں "صاحب" کی جنگ و صلح دونوں کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی انکے جسموں اور روحوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا جائے۔ اس خشک حقیقت کو کس

تر زبانی سے بیان کرتے ہیں ؎

جب بسولا ہٹا تو رندا ہے
توپ کھسکی۔ پروفیسر پہونچے

ہماری تہذیب و ترقی، ہماری صلاح و فلاح، ہماری تعلیم و تربیت کا نام لے کر جسقدر بھی کارگذاریاں، ہمارے "یہ خداوند" کرتے رہتے ہیں، ہمارے لئے درسگاہیں کھولتے ہیں، عدالتیں قائم کرتے ہیں، معیشت میں سہولت بہم پہنچاتے ہیں، ان سب کا مقصد بجز اسکے اور کچھ نہیں کہ ہم کو اپنے میں جذب کریں ؎

اس اونٹ کو خرِ عیسیٰ بنا کے چھوڑینگے
وہ اس کو محوِ کلیسا بنا کے چھوڑینگے
شراب کو بھی ہریسا بنا کے چھوڑینگے
کرینگے شوق سے مُسلم غذا میں مَے داخل
کہ تجھ کو بھی وہ ممھی سا بنا کے چھوڑینگے
کہا یہ شیخ نے اکبر سے روک اپنی زبان

"اونٹ" اور "خرِ عیسیٰ" اکبر کی زبان کی مخصوص اصطلاحیں ہیں، "مسلمان" اور "صاحب" کے لئے۔ "اونٹ" اور "گائے" کا ذکر بھی بڑی کثرت سے آیا ہے مسلمان اور ہندو کے لئے۔ "خرِ عیسیٰ" کا کام کہیں کہیں "جان بل" سے بھی لیا ہے اور کہیں "بندر" سے۔

اکبر کے عقیدے میں سیاسی ترقی کا اصل اصول حصول قوت تھا۔ اگر آج ہم اپنے حاکموں سے مساوات کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس میں کامیابی کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے میں قوت بھی ان کے مساوی پیدا کریں۔ سیاسیات نام ہی توازن قوت کا ہے جو قوم جسقدر قوی ہوگی اسی قدر دوسروں کے مقابلے میں ممتاز ہوگی طاقتور قوم کسی کی محتاج نہیں رہ سکتی اور کمزور

کو ہمیشہ غلامی سہتے رہنا پڑے گا۔ تحصیل قوت کی بار بار تعلیم دیتے ہیں مثلاً سہ
مذہب سے سائنٹی ہی اور دین آخرت ہی | پولٹیکل جو یہ جھوٹا قت ہی اور سکت ہی
صحیح طریقہ عمل صرف یہ ہے کہ قوت حاصل کی جائے نہ یہ کہ شکوہ و شکایات
یا خوشامد و تملق میں وقت ضائع کیا جائے سہ

نہایت قابلیت ہے مجھے ثابت کیا مرہ | مناسب داد دینا ہی مجھے یارب رٹنا ہی
ندا آئی مناسب ہے کہ جینا اپنا ثابت کر | خوشامد یا شکایت دونوں ہی ہیں فقط کھوناہی

سیاسیات کی دنیا میں محض زبان بنالا حاصل ہی، یہاں ہاتھ بنکر رہنا چاہئے سہ
زور بازو نہیں تو کیا اسپیچ | ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ

ترک ہوں خواہ عرب، اسلام کے اقتدار دنیوی کے محافظ وہی ہو سکتے
ہیں جنکی تلواروں میں دم موجود ہے[2] سہ
کوئی عرب کے ساتھ ہو یا عجم کے ساتھ | کچھ بھی نہیں ہی تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

زور بازو ہندوستان کی دوسری قوموں کو بھی نہیں حاصل، اور وہ
سبھی کونسلوں وغیرہ ہی کے جال میں پھنسی ہوئی ہیں۔ تاہم کم از کم اس
محدود دائرہ کے اندر تو وہ اپنی قوت بڑھانے کی فکر میں رہتی ہیں سہ

---

[1] مصرعہ میں "پولیٹیکل" پالٹکس کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔
[2] ترک اسوقت تک محافظ اسلام سمجھے جاتے تھے اور عرب کے حاکم تھے "خادم الحرمین الشریفین" ترکی سلطان (خلیفۃ المسلمین) کا خاص لقب ہوا کرتا تھا۔ عربوں میں نیا نیا جوش اسوقت پیدا کیا گیا تھا کہ اپنے کو ترکوں کی محکومی سے آزاد کرا لیں ۔ ۱۹۲۲ء میں یہ تلمیحات معمولی تھیں ہر پڑھے لکھے کی سمجھ میں از خود آجاتی تھیں۔

گو رہتے ہیں ممبری فانی پہ شاد ۔۔۔ لیکن نہیں اپنی ناتوانی پہ شاد
کونسل میں بڑھا رہے ہیں طاقت اپنی ۔۔۔ عاقل ہیں بکرمی بھوانی پرشاد[1]

جبتک قوت ہاتھ میں نہیں زبانی چیخ و پکار، شور و غل، تقریر و محفل طرازی سب بیکار ہے۔ پلیٹوں کی جھنکار عمر بھر سنتے رہئے مگر کیا اتنے سے بھوک کی تسکین ہو جائے گی؟ ع

رزولیوشن کی شورش ہے مگر اسکا اثر غائب ۔۔۔ پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

اسوقت صرف مسلمان ہی ایسے ہیں جو تذبذب، کشمکش، دو عملی میں مبتلا ہیں باقی قومیں یا تو حکمراں قوت میں جذب ہو گئی ہیں، اور یا اپنے میں قوت پیدا کر رہی ہیں۔ اس حقیقت کو کس اچھوتے انداز سے پیش کرتے ہیں ع

بھائی صاحب تو ادھر فکر مساوات میں ہیں ۔۔۔ شیخ صاحب کو سنا ہے کہ حوالات میں ہیں[2]
قوم کے حق میں تو الجھن کے سوا کچھ بھی نہیں ۔۔۔ صرف آنر کے مزے انکی ملاقات میں ہیں
سر بسجدہ ہے کوئی اور کوئی تیغ بکف ۔۔۔ اک ہمیں ایں رزولیوشن کی خرافات میں ہیں

کونسلوں میں جانا بجائے خود ضعیفی و کمزوری کی دلیل ہے، اس اعزاز پر قناعت وہی لوگ کر سکتے ہیں جنکی خودداری پہلے ہی سے ضعیف ہو چکی ہے ع

کونسل میں سوال کرنے لگے ۔۔۔ قومی طاقت نے جب جواب دیا

---

[1] یاد رکھیے کہ کلام ۱۹۱۹ء سے قبل کا ہے اور مقالہ کا سال تحریر ۱۹۲۲ء ہے۔

[2] حضرت اکبر نے یہ اشعار ۱۹۱۳ء میں حادثہ مسجد کانپور کے بعد ہی موزوں کئے تھے اور فوراً ایک گرامی نامہ بھی تحریر فرماتے تھے شیخ صاحب سے اشارہ قریب مولانا آزاد سبحانی کی جانب ہے جو اسوقت مدرسۃ الالٰہیات کانپور کے شیخ تھے اور ہنگامہ مسجد کے سلسلہ میں گرفتار ہو چکے تھے۔

اس سوال و جواب کا پورا لطف جب ہے، جب یہ یاد رہے کہ "سوال کرنا" اُردو محاورہ میں کن کن موقعوں پر آتا ہے اور پھر "جواب دینا" بھی کن کن معنوں میں۔

اس وقت تو حالت یہ ہے کہ جس شئے کو ہم اپنی ترقی سمجھ رہے ہیں یہ سب ہماری نہیں انھیں کی ترقی ہے۔ ہم خوش ہوئے کہ ہم نے اپنی یونیورسٹی بنائی وہ مسکرائے کہ غلامی و محکومی کا ایک نیا سانچہ اور تیار ہو گیا۔ ہم ٹوپیاں اُچھال رہے ہیں کہ اب تو گورنری تک ہمیں ملنے لگی صیاد اندر ہی اندر ہنس رہا ہے کہ، نادان چڑیا کس بھولے پن سے اپنی اسیری پر راضی اور مطمئن ہو گئی۔ بس اتنا ہی ہوا کہ پنجرہ کی تیلیاں لوہے کی جگہ سونے کی کر دینی پڑیں؟ اس صورت حال کی تصویر کتنی موثر اور سچی اکبر کے مرقع میں ملے گی ؎

انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زباں میری ہے بات انکی
انھیں کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات انکی
فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے، انھیں کا مطلب نکل رہا ہے
انھیں کا مضمون، انھیں کا کاغذ، قلم انھیں کا دوات انکی

بت کدہ میں ہماری عزت کیا خاک ہو سکتی ہے، جب سب کو یہ معلوم ہے کہ جو قشقہ ہماری پیشانی پر ہے، وہ بھی ہمارا اپنا نہیں غیروں کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے۔ ہماری بیدست و پائی کا نشان اور کلنگ کا ٹیکا ـــــ وفاداری کی مستقل پالیسی جو ملت پر کہنا چاہیئے کہ کوئی چالیس سال تک مسلط رہی، یہ تمام اسی کی تفسیر و تفصیل بیان ہو رہی ہے ؎

اکبر میری نظر میں

عزتِ اکبر نہ مثلِ برہمن در دیر بود ۔۔۔ قشقہ بودش بر جبین لیکن زد نسبت غیر بود

اپنی بے دست و پائی پر ایک اور تشبیہہ سنئے۔ نئی اور پھڑکتی ہوئی نہیں بلکہ کودتی اور اچکتی ہوئی۔ اسے کمند ڈال کر گرفت میں لانا اکبر ہی کی ظرافت کا، ذہانت کا حصہ تھا ؎

بوزنہ کو رقص پر کس بات کی داد دوں ۔۔۔ ہاں یہ جائز ہے کہ مداری کو مبارکباد دوں[1]

گوری قوموں کو تو کھلے بندوں آزادی ہے کہ جہاں جس خطہ میں جس جتن سے بھی چاہیں قابض ہو جائیں، حکومت قائم کر لیں، ہر طرح انکی حوصلہ افزائی ہی کی جائے گی کہ حکمرانی و جہانبانی تو فطری حق صاحب بہادروں کا ہے لیکن اگر کوئی مشرقی قوم خصوصاً مسلمان کہیں ذرا بھی سنبھلنا چاہیں، اپنے پیروں پر کھڑے ہونے لگیں تو انھیں روکئے، تھامئے، ماریئے، پیٹئے، نوچئے، پھاڑیئے۔ بلگیریا، سروِیا، رومانیہ، یونان اگر بڑھیں، ترقی کریں تو یہ انکا حق ہی ہے، انھیں خوب بڑھاوے ملتے رہیں۔ لیکن اگر ترک و عرب، ایرانی و افغانی محض اپنی کمر ہی کسنا چاہیں تو فرنگستان کا گوشہ گوشہ چیخ اُٹھے کہ لو وہ "پین اسلامزم" کا جن باہر نکل آیا۔ اب مہذب و شائستہ مسیحی سلطنتوں کی خیر نہیں"۔ حالات و واقعات کی اس رفتار سے واقف تو اب بچہ بچہ ہو چکا ہے۔ لسان العصر بھی اس حقیقت کو اپنی زبان میں دوہراتے چلتے ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ہاتھ میں ظرافت کے کھلونے لئے ہوئے ہیں انھیں

---

[1] مقالہ کا سال تحریر ۱۹۲۲ء ہے اور جن واقعات کی طرف اشارہ ہے وہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) سے قبل یا اسکے دوران کے ہیں۔

زور زور سے اچھالتے جاتے ہیں اور زیر لب مرثیہ بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ نظریں کھلونوں پر سب کی جمی ہوئی ہیں اور زیر لب آواز ہے کہ کسی کے کان میں آتی ہو اور کسی کے نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

سرفرازی ہو "اونٹوں" کی تو گردن کاٹیے
اگر "بندر" کی بن آئے تو فیض ارتقا کہیئے

کہا جاتا ہے کہلایا جاتا ہے کہ عہد حاضر کی برکتیں دیکھو، خدا کی رحمتوں کی طرح شمار و حساب سے باہر ہیں۔ اسکول ہیں، کالج ہیں، ریل ہے تار ہے، اسپتال ہیں وغیرہا۔ عندلیب گلشن حقیقت جواب دیتا ہے کہ یہ ساری "برکتیں" برکتیں مان بھی لی جائیں جب بھی بلبل تو دلدادہ اپنی آزادی پرواز کا ہے صیاد کا سجا سجایا رنگین و پُر تکلف قفس اسکے کس کام کا؟ ؎

کہا صیاد نے بلبل سے، کیا تو نے نہیں دیکھا
کہ تیرے آشیاں سے یہ قفس آراستہ تر ہے
کہا اسنے اسے تسلیم کرتی ہے نظر بندی
نشاط طبع کی مُہلک، مگر بیکار ئی یہ ہے

مسلمانوں کے لئے یہی قہر الٰہی کیا کم تھا کہ وہ اپنی صداقت، اپنا اخلاص، اپنے ایمان کی پختگی کھو چکا تھا، ستم یہ ہوا کہ رہنما کا جامہ پہنے، آپ ملگئے۔ اونٹ راستہ تو بھول ہی چکا تھا لیکن شاید کہ بھٹکتے بھٹکتے منزل مقصود تک کبھی پہنچ ہی جاتا، لیکن اب اسکا کیا علاج کہ زمین پر لٹکتی ہوئی تکمیل بندر کے ہاتھ آگئی اور اچک کر اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہوگیا — زبانی خاطر داریوں، لفظی واہ واہ میں اب بھی کمی نہیں، لیکن یہ مجال کس کی جو مساوات کا کلمہ

کفر زبان پر لا سکے۔

گم کی تھی میں نے راہ، مصیبت یہی تھی سخت — اس پر ہوا یہ قہر، تم ایسے خضر ملے
باتیں بھی مجھ سے کیں، مری خاطر بھی کی بہت — لیکن نجال کیا جو نظر سے نظر ملے
کس سے میں پوچھتا گل و بلبل کی سرگزشت — دو چار برگِ خشک تو دو چار پر ملے

سرکار کا ادنیٰ سا گوشۂ چشم بھی ہمارے لئے طرۂ افتخار۔ "صاحب" کا ادنیٰ سا التفات بھی ہمارے لئے موجب ناز۔ فرنگیت سے شرمانا کیسا وہ تو الٹی ہمارے خون میں رچ گئی ہے، روح میں بس گئی ہے ؎

انکو بسکٹ کیلئے سوجی کی تھیلی مل گئی — کمپ میں غل مچ گیا، مجنوں کو لیلیٰ مل گئی

بیمار ہم پڑیں تو علاج سرکاری شفا خانوں میں کرائیں۔ بچے پیدا ہوں تو تعلیم سرکار کے جاری کئے ہوئے مدرسوں میں پائیں۔ کورس سرکار کا تیار کرایا ہوا پڑھیں آپس میں لڑیں جھگڑیں تو دروازہ سرکاری عدالتوں کا کھٹکھٹائیں۔ مدد سرکاری پولیس کی لائیں جاہ و نام کی طلب دل میں پیدا ہو تو خطاب و اعزاز سرکار کے دربار سے حاصل کریں۔ پیٹ خالی ہو بھوک لگے تو روٹی کا سوال اسی فرنگی سرکار کے دربار سے کریں۔ غرض سرکار دولت مدار کا دامن عاطفت آغوشِ مادر سے بھی بڑھکر وسیع ہو گیا ہے اور یہیں ہماری زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ہماری مرکزیت سے ہماری خودی سے دور کرتا جا رہا ہے۔ آخر اس صورتِ حال کا اثر ملت کی سیرت پر کیا پڑیگا اور کیا پڑ رہا ہے۔ یہ سوال اکثر زبانوں پر ہے جواب آیئے اکبر کے جام جہاں نما میں دیکھیں ؎

میں نے کہا یہ اپنے خیالی خضر سے آج — بتلاؤ اس روش سے ترقی کی کیا امید

ہر گام پر جو طاعت حق سے الگ پڑا | ہوتے رہو گے مرکز قومی سے تم بعید
ہاں انتشار و جہل کی تکمیل ہو گی جب | ہو جاؤ گے بتان کلیسا کے تم مرید
شاید کہ مدعا بھی تمہارا ہے بس یہی | ہر چند ابھی ہے درس کا پردہ میں ناپدید
حیرت سے مجھکو دیکھ کے اس خضر نے پڑھا | حافظ کا اک شعر جو معنی کو تھا مفید
سر ازل کہ عارف سالک بکس نہ گفت | در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

"صاحب" کو اس دیس میں اپنے پرستاران وفا کے ساتھ جس درجہ اور جس نوعیت کا تعلق ہے، اور ظاہری خاطر داری کے عقب میں خلوص کی مقدار کتنی رہی ہے اسکی توضیح و تشریح سے خشک نثر میں اخبارات کے کالم روز ہی لبریز رہتے ہیں۔ اکبر کی قادر الکلامی نے اس سارے دفتر کو ایک مصرعہ میں سمیٹ لیا۔ "دریا کو کوزہ میں بند کرنا" یہ مثل تو آپنے بارہا سنی ہوگی۔ صحیح مثال و نظیر اسکی یہیں ملے گی ؎

اکبر سے میں نے پوچھا اے واعظ طریقت | دنیائے دوں سے رکھوں میں کس قدر تعلق
اسنے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھکو | انگریز کو ہے "نیٹو"[۱] سے جسقدر تعلق

بڑے بڑے پرجوش اخباری اداریے، بڑی بڑی شعلہ بار سیاسی تقریریں ان چار مصرعوں کی بلاغت، جامعیت نکتہ وری پر قربان ہیں!

بیرونیوں اور بدیسیوں کی کفش برداریوں سے تو اپنوں کی غلامی، چاہے اپنے کوئی بھی ہوں بہر حال و صورت بہتر ہے[۲] اس خیال کو ذرا دیکھئے کس مزہ داری سے ادا کیا ہے۔

---

[۱] (NATIVE) دیسی آدمی۔ یا گورا شاہی زبان میں "کالا آدمی"۔

[۲] ۱۹۵۱ء میں نظر ثالث کے وقت ان فقروں کو پڑھکر عجب حسرت طاری ہوتی ہے۔ ہندی مسلمان اس دور آزادی سے کہیں زیادہ آزاد تو اس دور غلامی ہی میں تھا۔

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک ہاتی   بسکٹ سے ہو ملائم پوری ہو یا چپاتی
دیس کے معنی وطن کے تو ظاہر ہی ہیں۔ باقی دیس ایک راگنی کا بھی نام ہے۔ گانا۔
دھن۔ دیس اب سب اکٹھے ہو گئے۔ بسکٹ کا اشارہ "صاحب" کی میز کی طرف "پوری"
کا ہندو کی رسوئی کی طرف "چپاتی" کا مسلمان کے باورچی خانہ کی طرف بالکل کھلا ہوا ہے۔
ہندیوں کی باہمی ناچاقی ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ "صاحب" بھی
اس رمز سے خوب آگاہ ہیں جب کبھی اس آگ کو سرد ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں کبھی
بندش ذبح گاؤ کا شغلہ چھوڑ دیا کبھی ہندی زبان اور دیوناگری حروف کا قضیہ
لے بیٹھے، کبھی مسجد کے آگے باجے کا سوال چھیڑ دیا اور کبھی بڑا ہوا حملہ افغانستان
کا بنا کر پیش کر دیا۔ اکبر کی نگاہ دوربیں نے تاڑ لیا کہ اہم ترین مسئلہ زبان کا ہے۔
زبان کے معاملہ میں جب تک سارا ملک رواداری برتنے کیلئے تیار نہ ہوگا۔ اتحاد وطنی
کی گتھی کسی طرح نہ سلجھے گی۔ اپنے ہم وطنوں کی سادہ مزاجی، کم فہمی، نادانی پر تاسف
و حسرت کے آنسو بہاتے ہیں ؎

کہنا ہے مجھکو جو کچھ سُن لے گا اُس صدی میں   پوچھا کہ اس صدی میں کیوں چپ ہو گئے جی ہیں
بولے کہ یہ صدی ہے اس بحث اور بیاں میں   کہنا ہے جو کہیں ہم وہ کون سی زباں میں
سن کر یہ بات ان سے ہر اک کو آیا چکر   اک صاحب بصیرت چلتے ہوئے یہ کہکر
پیر فلک نہ کیونکر ابواب بحث کھولے   جیتے رہیں گرو جی، زندہ رہیں یہ بھولے

غیر ملکی حکومت کی بدگمانیاں اور سخت گیریاں خدا کی پناہ۔ بات بات پر گرفت۔
خود غرضانہ و عاقبت نااندیشانہ شعروں کے اندر بھی غدر، بغاوت و قانون شکنی کے جراثیم سرکاری
خوردبین میں عیاں ــــ اس دارو گیر کی لطیف و شاعرانہ تصویر شاعر کے نگارخانہ میں ملاحظہ ہو۔

ایک غزل میں اتفاقاً میرا ایک مصرعہ یہ تھا

دیدۂ عبرت سے رنگ یہ فانی دیکھیے

کوئی بول اُٹھا، زوال حسن بت مقصود ہے

اس سخن میں بدشگونی کی نشانی دیکھیے

عارفانہ شاعری بھی آجکل دشوار ہے

بزم دنیا میں یہ زور بدگمانی دیکھیے

اکبر کی آپ بیتی بھی اس سلسلہ میں سننے کے قابل ہے۔ ستمبر ۱۹۱۴ء میں جب یورپ کی پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی ہے تو بالکل ابتدا میں اعلان جنگ آسٹریا اور سرویا کے درمیان ہوا تھا۔ برطانیہ اسوقت تک الگ تھا۔ اکبر نے فی الفور ایک نظم کہی ایک مصرعہ یہ تھا ع

بحمد اللہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے

مسجد کانپور کے سلسلے میں گولی چلنے اور مسلمانوں کے شہید ہونیکا واقعہ تازہ تھا۔[1] خونِ شہیداں کی تلمیح اس جانب سمجھی گئی اور شاعر صاحب دھر لئے گئے۔ اکبر صاحب بھی نرے شاعر تھے کوئی دار و زنداں کے مرد میداں تو تھے نہیں۔ اعلان کردیا کہ بہت اچھا آئندہ شعر گوئی ہی سے توبہ، نہ معلوم کسوقت کیا نکل جائے اور آپ کیا گرفت کر بیٹھیں لیکن رند قدح خوار کی طرح شاعر کی توبہ ہی کیا اور کے دن کی؟ توبہ کیجئے! اخیر کچھ دن ظاہر کی تو احتیاط رہی بھی۔ لیکن تخلیہ کی مجلسوں میں قاضی و محتسب کی دسترس سے دور، شغل اسوقت بھی جاری ہی رہا۔

ایک آدھ نمونہ ملاحظہ ہو ے

سینہ ادھر ایسے کہ سہیں جور نہ قفل بھی

کان انکے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی

حکم اکبر کو ملا ہے کہ نہ لکھو اشعار

خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانہ سے

---

[1] یہ واقعہ ۱۳ ۱۹ء میں ہوا تھا

جنگ یورپ کی تلمیحوں سے اس دور کی غزلیں خالی نہیں نئی نئی تشبیہیں میدان جنگ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں ایک غزل کا مطلع ہے ؎

یہ بت دل میں گھسے آتے ہیں جرمن کا ستم بنکر
میر اتقوی کہاں تک انکو روکے بلجیم بنکر[1]

یہ کونسلیں یہ اسمبلیاں یہ ووٹ بازیاں اور الکشن جنگیاں یہ علامت ہیں ہماری ترقی وآزادی کی یا مزید حلقے ہیں زنجیر غلامی کے اور ہمارے حق میں مزید پھندے؟ اکبر کے ہاں یہ تعلیم بار بار اور وضاحت کے ساتھ ملتی ہے ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا
اچھے اچھے ووٹ کے شیدا

کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ
اسکو سمجھیں فرض کفایہ

بھائی بھائی میں ہاتھا پائی
سلف گورنمنٹ آگے آئی

پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر کی
ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی

ایک دوسری جگہ انکی دور اندیشی قوم کی غفلت و کوتاہ بینی کی مرثیہ خوانی یوں کر رہی ہے۔ تاسف و دلسوزی کا رنگ اب اور گہرا ہے ؎

ہاں تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالیسی کا
لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا

ہے کوفت لیکن اسیر مسرور ہو رہا ہیں
ہر سو اچھل رہا ہیں او رچور ہو رہے ہیں

اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو
اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو

لکھے گا کلارک حسرت دنیا کی سٹری میں
اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

ایک اور مقام کی شاعرانہ دور بینی اور حقیقت سنجی اس ظاہر فریب اور خوش غلاف منظر کو یوں بے نقاب کر رہی ہے ؎

---

[1] پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کا حملہ فرانس پر بلجیم کے راستے سے ہوا تھا اور بیچارہ بلجیم پہلی ہی زد میں گر گیا تھا۔

ٹٹو ہے ہنود ہی کا محتاج | کونسل تو ہو انکی جنکا ہو راج
کہتے جاتے ہیں یا الٰہی | سوشل حالت کی ہے تباہی
ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں | اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں
دراصل نہ دین ہے نہ دنیا | پنجرے میں پھدک رہا ہو مینا
"اسکیم"[1] کا جھولنا وہ جھولیں | لیکن یہ کیوں اپنی راہ بھولیں

مئی و جون کی گرم گرم لو اور تپش میں باہر نکلنا ہر ایک کا کام نہیں، قاضی و محتسب کی دھر پکڑ کی گرما گرمی دیکھ شاعر غریب کو تو اپنی خیریت اسی میں نظر آتی ہو کہ زبان بند رکھی جائے اور بات کرنے کے لئے انتظار کسی مناسب موسم کا کیا جائے۔ بے فصل اگر بیج ڈالا جائے تو پودا ہرگز نہ اُگے گا۔ کہتا ہو کہ جس طرح ایک وقت گفتگو کا ہوتا ہو اسی طرح ایک موقعہ سکوت و بے تعلقی کا بھی ہوتا ہو اور آج وہی موقع ہو ؎

گفتنی ہے دلِ پُر درد کا قصہ لیکن | کس سے کہئے کوئی مستفسرِ حالات تو ہو
داستانِ غمِ دل کون کہے کون سُنے | بزم میں موقع اظہار خیالات تو ہو
عدمِ نشو و نما سے نہ کہو تخم کو بد | وقت بالیدگیٔ تخم و نباتات تو ہو

تینوں شعر سوز و درد کی تصویر ہیں اور انفرادی و اجتماعی دونو پہلوؤں کو لئے ہوئے۔ پھر کہتا ہو کہ اگر زمانے نے مساعدت کی تو کبھی ہماری بھی زبان کھلے گی، ورنہ یہ سکوت سکوتِ اجل سے ہم آغوش ہو رہے گا۔ ؎

ہم اس زمانے میں رہتے ہیں اپنے گھر میں پڑے | ہوا ہی بدلی ہوئی ہے فلک سے کون لڑے
خدا ہی ہم کو اُٹھائے گا جب تو ہم اُٹھیں گے | ابھی تو چپ ہیں کوئی لاکھ اعتراض جڑے
اگر اُٹھے تو علم اپنا گاڑ لیں گے کہیں | جو اُٹھ گئے تو ہے قصہ ہی ختم، خود ہی گڑے

---

[1] اشارہ ہے سنہ ۱۹۱۸ء کی "مانٹیگو ریفارم اسکیم" کی طرف جسکا چرچا ہر جگہ تھا۔

حق پرستوں کیلئے کھلے ہوئے راستہ تو دو ہی ہیں یا سیدھے سادے اس دارِ فانی سے رخصت ہو جائیں اور یا صبر کے تلخ گھونٹ حلق سے اتارتے رہیں ؎

حق پرستی کا نشاں اب قبر ہے یا صبر ہے
اور جو کچھ ہے عقیدوں پر فقط اک جبر ہے

فرماتے ہیں کہ مومن کے لئے فضا یکسر تاریک ، ماحول تمامتر ناسازگار ، جو بھی ہوا چلتی ہے ناموافق ، اہل ایمان کیلئے یاس و حرمان ہیں ، بھی بھروسہ صرف رحمتِ باری کا ، تاریک خانہ میں بھی شعاعِ امید ؎

جب آنکھ کو کھلنے میں ہو جھپک ، جب منہ میں زبان جنبش سے ڈرے
اس قید میں کیونکر جینا ہو ، اللہ ہی اپنا فضل کرے

کیا ناز ہو اس ساعت پر ، افسوس ہے ایسی حالت پر
یا جھوٹ کہے یا کچھ نہ کہے ، یا کفر کرے یا کچھ نہ کرے

قاتل کو بھروسہ قوت کا ، اور ہم کو خدا کی رحمت کا
ہونا تھا جو کچھ وہ ہو ہی لیا ، وہ بھی نہ رکا ہم بھی نہ ڈرے

صاحب کا ساتھ دیجئے تو دین رخصت بے نیازی اختیار کیجئے تو دنیا رخصت ؎

بے گزٹ ہو کے جو چلے تو محلہ میں حقیر
باگزٹ ہو کے جو بیٹھے تو فرشتوں میں خفیف

" گزٹ " کے لفظ سے بھی اکبر نے خوب کام نکالے ہیں کہتے ہیں کہ بے سرکاری تعلق کے بغیر سرکاری اعزاز کے اگر رہیئے تو دنیا میں کون بات پوچھے گا ؟ مادی تعلق منصب و اعزاز کو نظر میں رکھئے تو پھر دین سے ہاتھ دھو بیٹھئے

ادھر تو اور اب اپنے کو محض مسلمان کہنا اور کہلانا بھی مشکل ہو گیا ہے - ادھر آپ نے اعلان اپنے اسلام کا کیا ، ادھر روشن خیالی کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور آپ مضحکہ کے ہدف

بننے لگے مسلمان کہلانے ہی پر اگر آپ کو اصرار ہے تو خیر پھر اپنے کو "بندۂ تجدد یا صاحب زدہ" مسلمان کہلائیے ؎

جو پوچھا مجھسے دورِ چرخ نے کیا تو مسلماں ہے
میں گھبرایا کہ اس دریا میں کیا راز پنہاں ہے

کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھسے
اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے

بالآخر کہدیا میں نے کہ "گو مسلم تو ہے بندہ
ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے"

لیکن اس ساری پستی وادبار کے اسباب اکبرؔ کی تشخیص میں خارجی نہیں داخلی ہیں، جن مصائب کے ہم شکار ہو رہے ہیں، یہ خود ہمارے ہاتھ کے پیدا کئے ہوئے ہیں ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیا، اغیار ہم پر دلیر ہو گئے۔ ہمنے اپنے ملی طور طریقوں کو خیرباد کہا۔ اغیار ہم کو نگلنے لگے۔ ہمنے اپنوں کو چھوڑ کر بیگانوں کی تقلید و نقالی شروع کی بیگانوں نے دیکھتے دیکھتے ہم کو زیر کر دیا۔ جھاڑو جب تک بندھی ہوئی ہے تیز سے تیز آندھی میں بھی محفوظ ہے۔ ادھر اُسکا مٹھا کھلا اُدھر اسکی ایک ایک سینک ہوا کے ہر معمولی جھونکے کے رحم و کرم پر رہ گئی۔ قوم کا شیرازہ قائم رکھنے والی شئے تو صرف قوم و ملت میں خودی و خود داری کا احساس ہے۔ اقبالؔ کی شاعری کا تو خاص موضوع ہی یہ ہے لیکن اسکی جھلکیاں اکبرؔ کے یہاں بھی موجود ہیں فرماتے ہیں ؎

طریقِ حکمت و تزئین ہر ایک رنگ میں ہے
نہ یہ سمجھ کہ فقط مغربی ہی ڈھنگ میں ہے

نگاہِ غور کرو سوئے ترکی و ایران
نئی بنا یہ حریفوں نے کر دیا ویران

تمہارے دل میں یہ کیا وہم کیا گمان آئے
تمہارے جسم میں کیوں دوسرے کی جان آئے

جو تونے بھائیوں کا اپنے ساتھ چھوڑ دیا
تو دستگیر نے تیرا ابھی ہاتھ چھوڑ دیا

جو بات ٹھیک ہے، کہتا ہوں میں اُسے کھُل کر
کہ سلطنت نہ سہی تم رہو تو مل جُل کر

لیکن آج جو بڑے بڑے اقبال مند نظر آتے ہیں انکی بھی اقبالمندیاں، خوش بختیاں، کامرانیاں کبتک؟ کے دن کیلئے؟ ایکدن احتساب کا آخر انکے لئے بھی آنیوالا ہے۔ جہانِ فانی کو فانی سمجھنے والا مشرقی شاعر اس انجام کی خبر کبھی کبھی ان بدمستوں کے کان تک پہونچا دیتا ہے سے

مجبور بدلتے جانے پہ ہے اقبال و حشم کی دور بھی ہیں
یکتائی کا دعویٰ خوب نہیں اللہ کے بندے اور بھی ہیں

کہیں یہ فقیر مدہوشانِ غفلت کے قصر و ایوان کے سامنے آکر صدائے عبرت بلند کرتا ہے سے

ہرج کیا وقعت نہیں میری جو بزمِ غیر میں
غیرتِ مسلم ہے اسکی کس میرسی دیر میں

تار برقی سے ہوا معلوم حالِ زارِ روس[۱]
شور برپا ہے کلیسا میں حرم میں دیر میں

آسمانی توپ چلتی ہے کہیں صدیوں کے بعد
لیکن اُڑ جاتی ہیں ساری غفلتیں دو فیر میں

اور کہیں اپنوں اور بیگانوں دونوں کو حدود انسانیت کے اندر رہنے کی موعظت و تلقین کرتا ہے سے

تم ملو یا نہ ملو مجھسے منو یا نہ منو
ساتھ رہنا ہے اس ملک میں اے ہموطنو

اہلِ مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو یہ قلم
آسماں تنگ ہو تم پہ بگڑا اتنا نہ تنو

ذیل کا شعر اسوقت کا ہے جب پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر (نومبر ۱۹۱۸ء) میں صلحنامہ مرتب ہو رہا تھا اور اسکا خاص اہتمام تھا کہ انکی یورپ کی تنظیم جدید کی جو قبا تیار ہو اسکا دامن بھی ترکوں کے وجود کی نجاست سے پاک رہے سے

نقشوں میں لکیریں کھینچنے سے نظر کی حد بدلی یا نہیں
کو دانہ ترکیں قوت کی کچھ فائدہ انکو دینگی یا نہیں

دوسرا مصرعہ اپنی بلاغت و ایجاز و جامعیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ زبان میں ایک مستقل ضرب المثل کی حیثیت حاصل کرے۔

---

[۱] اشارہ ہے ۱۹۱۷ء کے عظیم الشان انقلاب روس کی جانب۔ زار شاہی کا خاتمہ آناً فاناً ہو گیا۔ زار روس اپنے وقت کا سب سے بڑا فرعون یا سامان اگلے جباروں کی زندہ یادگار تھا

آج جنھیں اپنی طاقت و توانائی پر غرہ ہو گیا انھوں نے کبھی خیال نہیں کیا کہ شمع نے دم بھر میں سینکڑوں پروانوں کی جانیں لے ڈالیں، لیکن خود صرصر فنا کے ایک طمانچہ کے سامنے معاً بے نور تھی۔ ہاتھی نے ایک قدم اُٹھاتے ہی صدہا چیونٹیوں کو کچل ڈالا، لیکن قضاء الٰہی کے بیل تن کی ہلکی سی ٹکر کے سامنے تودۂ خاک تھا۔ طاقتوروں نے کمزوروں کو زبردستوں نے زیردستوں کو، سرمایہ داروں نے ناداروں کو، تختۂ مشق ہمیشہ ہی بنائے رکھا ہے لیکن انجام بھی ہمیشہ ہی کیا ہوتا رہا ہے؟ اسکا جواب مصر کے فرعونوں کی لاشیں روم کے قیصروں کی ہڈیاں، بابل کے کھنڈر، اسیریا کے ویرانے، مذبوح و مقتول آخری زارِ روس کے جسم کی تڑپ، اور زندہ در گور قیصر جرمنی[1] کے دل کی حسرتیں دینگی۔

اکبر کا مرقع سیاست یہ تصویر بھی رکھتا ہے ؎

شک اس میں کیا ہے کہ ساری دنیا ہے آج انکی رفل کی زد پر
اشارہ فطرت کا ہے مگر یہ کہ خود بھی ہیں وہ اجل کی زد پر

سنت الٰہی ایک یہ رکھی گئی ہے کہ سفینۂ ظلم و جور غرق ہو کر ضرور رہتا ہے، لیکن شروع میں نہیں۔ قہر و انتقام کی لہریں چاروں طرف سے لپکتی صرف اسوقت ہیں جب پہلے خوب مہلت مل چکتی ہے اور تمرد و رعونت، خود فراموشی و خدا فروشی کی کشتی حد سے زیادہ بھاری ہو چکتی ہے۔ اکبر کی ذہانت اس اٹل حقیقت سے یہ مضمون پیدا کرتی ہے کہ دامانِ شرق کو پارہ پارہ کرنے میں یورپ عجلت کیوں کر رہا ہے جبتک اسکی طغیانی و تمرد کی کشتی پوری طرح گرانبار ہو چکے گی غضب الٰہی جوش میں نہ آئے گا۔ گویا اس مشغلہ میں دیر تک مصروف رہنا آنیوالے یوم احتساب کو ٹالتے رہنا ہے ؎

---

[1] آخری قیصر جرمنی (ولیم ثانی) (ان سطور کی تحریر کے وقت (دسمبر ۱۹۲۲ء میں) زندہ تھا۔

یورپ کو پالسی میں عجلت کی کیا ضرورت ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیا تک

اس تمام سیاسی کش مکش و بین الاقوامی آویزش سے جو بربادیاں اور ہلاکتیں پیدا ہونیوالی ہیں ان سے تواب کسی کو انکار نہیں۔ البتہ سوال یہ ہے کہ آخری فتح کس کے ہاتھ رہے گی "صاحب" اور "صاحب زدول" کا کہنا ہے کہ آخری جیت ہمت و حوصلہ مندی، باقاعدگی و خوش نظمی علم و روشن خیالی تہذیب و شائستگی کی رہنا یقینی ہے۔ اکبر کا فیصلہ یہ ہے کہ مشیت الٰہی آخری تائید اس فریق کی کرے گی جو نیکو کار ہے اور حسن عمل کے حصار میں پناہ گزیں ہے — استادی کا کمال یہ ہے کہ اس وعظ خشک میں بھی زندہ دلی کی ادائیں بھر دی ہیں ؎

شامت آئی ہے یہ مسلّم ہے ... بحث اتنی ہی رہ گئی کس کی
میری جانب اشارہ غالب ہے ... یعنی اکثر یہ کہتے ہیں اس کی
خیر جو کچھ خدا کی مرضی ہو ... کھل ہی جائیگا آئی ہے جسکی
اسقدر تو نے مجھے بھی کھٹکا ہے ... بہ ڈھنگی ہے بہت میری وہ مسکی

اہل ملک کیلئے اس صورت حال کا آخری علاج کیا ہے؟ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اکبر کی تشخیص اور طریق علاج سب سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پرندہ جال میں کیوں پھنسا کس نے اسے مجبور کیا؟ کسی نے بھی نہیں، بجز خود اسی کی ہوس و طمع کے۔ اکبر بے نیازی، بے طمعی، بے غرضی، کا آئیڈیل (مطمح نظر) پیش کر کے سیاسیات کے پردہ میں گویا تصوف کی تعلیم دے جاتے ہیں ؎

ہو مجھ پہ بتوں کی چشم کرم، دل کو یہ طلب اصلاً نہ رہی
مجھکو بھی خدا نے غیرت دی، انکو جو میری پروا نہ رہی

دنیا کا تردد جب تک تھا، جبتک کہ ہم اسکے طالب تھے
پھیری جو نظر، غم ہوگئے کم، رغبت نہ رہی دنیا نہ رہی

سچ پوچھیے تو راحت ہی ملی، دنیا سے جدا ہو جانے میں
تھوڑی سی اداسی کبھی تو ہو، آفت تو مگر برپا نہ رہی

تحریک ترک موالات، جو انکے زمانہ میں چلی اکبر اس سے صرف کسی حد تک متفق تھے۔ تحریک کے علمبرداروں میں بڑی خامیاں پاتے تھے، کہتے تھے یہ بھی کوئی جنگ ہے کہ روٹی نہ ملی، نوکری نہ ملی، تو حکومت سے بگڑ بیٹھے اور روٹھ کر گئے جھنجھلاہٹ میں غصہ اسی پر اتار رہے۔ مولوی ہوں یا گریجویٹ، جھنجھلاہٹ وہی بھوک کی ہے ذرا دیکھئے کس لطافت کے ساتھ اس گلدستہ کو پیش کر رہے ہیں :-

نئی روشنی کا ہوا تیل کم
حکومت نے اس سے کیا میل کم

ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے
نہ آفس میں تھے نہ کرسی میں تھے

یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے
سیاسی کمیٹی میں پل جائیے

اسی روشنی کا ہے بس یہ ظہور
خدا جانے ظلمت ہے اسمیں کہ نور

حضرت اکبر نے شعوراً اپنا دامن ہمیشہ ہر قسم کی سیاسی مجلسوں سے الگ رکھا، انکا قبلۂ مقصود وطن کے بجائے آخرت، ملک کے بجائے دین اور قوم کے بجائے خدا تھا اسلئے جن مجلسوں میں سب کی زبانیں چلتیں وہ خاموش رہتے اور اسی خاموشی کی تعلیم دوسروں کو دیتے۔

آزادی کا شور مبارک
یہ تقلیدی زور مبارک

مرا تو ہے اور ہی منظر
میں تو کہتا ہوں اکبر

عارف کو بےہوشی زیبا
عاقل کو خاموشی زیبا

انکے خیال میں سیاسی، ملکی، ملّی، اجتماعی ہر مرض کی دوا ایک ہی تھی، طاعت، عبادت عبدیت۔ مومن کے لئے ابتلاء و آزمائش کا وقت آنا لازمی ہے مومن وہی ہے جو اس آزمائش میں پورا اترے اور مرض کی انتہائی شدت کے وقت بھی نظر شافیٔ مطلق پر رکھے۔ اس مضمون کو لیکر پوری ایک غزل کہہ ڈالی۔ ؎

مسجد میں خدا خدا کئے جاؤ — مایوس نہ ہو دعا کئے جاؤ
ہرگز نہ قضا کرو نمازیں — مرتے مرتے ادا کئے جاؤ
کتنا ہی ہو وقت بیحجابی — تم پیروئ حیا کئے جاؤ
امید شفا خدا سے رکھو — کیوں ترک کرو دوا کئے جاؤ ✓

غلامی و محکومی کا راز یہ بتاتے ہیں کہ ہم نے بدی کو نیکی پر ترجیح دے رکھی ہے۔ سلطنت و حکومت، تو مادّی حیثیت سے خلافت و نیابت الٰہی ہے آج ہم اپنے ایمان کو زندہ اور اخلاق کو درست کرلیں تو مادّی غلبہ ابھی حاصل کرلیں ؎

قوت ایماں سے کہدو سب کو سمجھاتی رہے — نیکیاں کثرت سے ہوں مغلوبیت جاتی رہے

اس حقیقت کا مشاہدہ تاسف و حسرت کی نظروں سے کرتے تھے کہ نام وطنیت و قومیت کا لیکر ساری دنیا کیا مشرق اور کیا مغرب، محض مادّی غرض مندیوں کے لئے ایک دوسرے سے مصروف کارزار ہے۔ خوف خدا اور حق پرستی کا وجود روز بروز عنقا ہوتا جارہا ہے اور اسلئے دنیا میں ہر روز ایک نئی تکلیف کا اضافہ ہو رہا ہے ؎

دین خدا ہے حق کی تسلّی کے واسطے — دنیا اٹھی ہے اپنی تعلّی کے واسطے
عارف جو ہیں رہیں گے وہ اللہ ہی کے ساتھ — اللہ ہی ہے اُن کی تسلّی کے واسطے

سلطنتوں کا عروج و زوال زمانہ کی معمولی دھوپ چھاؤں ہے۔ یہ آج اِس قوم کا طبل اقبال بج رہا ہے کل اُس قوم کا۔ دولت کا تاج آج ایک قوم کے سر پر ہے کل دوسری کے یہ مد و جزر، زمانہ کے سمندر میں ہر وقت اور ہر آن لگا رہتا ہے۔ ترک اگر اسوقت حکومت سے بیدخل کئے جا رہے ہیں تو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں[1]۔ تاہم المناک حقیقت یہ ہے کہ ہمارا صبر و عزم، غیرت و خودداری، صدق و ثبات ہم سے رخصت ہو رہا ہے اور ہم روز بروز بجائے توفیق الٰہی اور قوت ذاتی پر اعتماد کرنے کے دوسروں کے محتاج و دست نگر ہوتے جاتے ہیں۔ حسرت ہماری اس قلب ماہیت پر نوحہ کرتی اور عبرت آنسو بہاتی ہے ؎

انتظامی بات ہے یہ، ہوتی رہتی ہے یونہی — اسکا کیا شکوہ جو ہم پر اسکو غالب کر دیا
ہاں یہ ہے افسوس، ہم سے چھن گیا صبر و قرار — طالب حق کو فلک نے بت کا طالب کر دیا

اسوقت دنیا صرف اختیار پر تصور ہی ہے سلط ہے خود ہماری ساری جد و جہد کا مرکز بھی تو دنیا اور محض دنیا رہ گئی ہے اس سے آگے کی دوربینی رخصت۔ فلاح کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم سے سررشتۂ صبر بہر حال نہ چھوٹنے پائے ؎

ارماں بقدر طاقت ہر سو نکل رہے ہیں — "صاحب" تو اڑ رہے ہیں اور ہم اچھل رہے ہیں

---

[1] سنہ ۱۹۱۸ء سنہ ۱۹۱۹ء کا زمانہ یاد کر لیجیے۔ ترک اسوقت دنیا میں اسلامی اقتدار کے سب سے بڑے اور زبردست نمائندے تھے سلطان المعظم اسوقت تک خلیفۃ المسلمین تھے اور خادم الحرمین الشریفین۔ ترکوں کو جنگ عظیم اول میں جو شکست ہوئی یہ محض ایک سلطنت یا جغرافی اقلیم کی شکست نہ تھی۔ عالم اسلامی نے اسے اپنی شکست اور اپنے اوپر ضرب کاری سمجھا ہندوستان میں عظیم الشان و بے نظیر تحریک، تحریک خلافت کے نام سے اٹھی وہ اسی احساس کا نتیجہ تھی۔

غصہ میں ہیں ہم ان پر وہ ہم پہ ہنس رہے ہیں — دامِ فریبِ دنیا میں دونوں ہی پھنس رہے ہیں

دونوں کو چاہیئے یہ طاعت سے منہ نہ موڑیں — وہ اپنا جبر چھوڑیں ہم صبر کو نہ چھوڑیں

تحریکِ ترکِ موالات کو درجۂ قبول صرف اسوقت حاصل ہو سکتا ہے جب اس کے ضابطہ کی پہلی دفعہ کلمۂ عبودیت ہو نہ یہ کہ اسکی بنا خود بینی پر ہو کہ یہ تو عین انانیت ہوئی سہ

ثواب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم — کہ دل کو طاقتِ حق سے دور کرتے ہیں

نہ یہ کہ عیش میں مرے ہیں یہ خلل انداز — ہمیں ضعیف سمجھکر غرور کرتے ہیں

یہ تو سنجیدہ گفتگو تھی ورنہ جب ہنسنے ہنسانے پر آتے تو "تحریکِ ترکِ موالات" سے الگ رہنے کی وجہ کچھ اور ہی بیان کرتے ہیں اسکی "خانگی" حیثیت پر نظر کرکے اسے خود انہی کی زبان سے سُنئے سہ

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا — اسکو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

یہ شعر سناکر بولے کہ "یہ کبھی آپ نے سمجھے میں نے اپنے کو "مدخولہ" گورنمنٹ کیوں کہا؟ پنشن پاتا ہوں نا! ملازمت میں ہوتا تنخواہ پاتا ہوتا تو مدخولہ نہیں، منکوحہ کہتا۔"

ل؎ جولائی ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں نیاز حاصل ہوا (آہ کہ وہی ملاقات آخری تھی) اپنے اوپر وقت کے اکثر نوجوانوں کی طرح نشۂ تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کا سوار تھا۔ "مہاتما" گاندھی کی روحانیت و تقدس کے تذکرے وردِ زبان تھے بات بات پر انکی بزرگی اور روحانیت کا حوالہ۔ دل میں آرزو کہ حضرت اکبر پر بھی یہ جادو چل جائے اور وہ بھی نان کوآپریشن کی کمیٹی کے باضابطہ ممبر بن جائیں۔ حضرت نے دو چار منٹ تو صبر کیا اسکے بعد یکایک پوچھ بیٹھے "اچھا صاحب آپکے بیان سے تو معلوم ہوا کہ گاندھی جی بڑے موحد اور روحانیت کے علمبردار ہیں اپنی اس کمیٹی میں انھوں نے داخلہ کی پہلی شرط لا الٰہ الا اللہ تو ضرور رکھی ہوگی"۔ میں ساری چوکڑی بھول گیا مری ہوئی آواز سے جواب دیا کہ "جی نہیں ایسا تو نہیں" بولے "بس تو مجھے بھی آگے کچھ پوچھنا نہیں ایک سیاسی انجمن ہے جیسی اور بہت سی انجمنیں آجکل ہیں۔"

(ج) عشق و تغزل

اکبر کی شہرت عام غزل گو کی حیثیت سے نہیں، تاہم کلیات اول و دوم میں انکی متعدد غزلیں اچھی سی اچھی موجود ہیں، ایسی کہ انکی بنا پر انھیں بلا تامل غزل اردو کے استادوں کے پہلو میں رکھا جا سکتا ہے۔ کلیات اول کا سال طبع ۱۹۰۹ء ہے اسمیں حضرت اکبر نے خود اپنی غزل گوئی کے تین دور قائم کئے ہیں۔ سلسلۂ بیان کے لئے ان میں سے ہر دور کے نمونۂ کلام پر ایک سرسری نظر کرتے چلئے۔ پہلا دور تا ۱۸۶۶ء۔ اکبر کا سال ولادت ۱۸۴۶ء ہے۔ گویا یہ دور اُن کی شاعری کے بچپن کا تھا۔ شاعر کا سن بیس سال کے اندر تھا یہ سن بھی کوئی سن ہے۔ اپنے اور اپنی شاعری دونو کے اس لڑکپن میں وہ عام غزل گویوں کے بالکل ہم نوا ہیں۔ تاہم برجستگی، شوخیٔ بیان، روانیٔ طبع اور لطف زبان کے جو جوہر آگے چلکر اس آب و تاب سے چمکے، اُسوقت بھی مخفی و غیر نمایاں نہیں، اور رعایت لفظی لکھنؤ کے رنگ کی بھی خاصی موجود ہے، اشعار ذیل کے پڑھتے وقت یہ خوب یاد رہے کہ زمانہ ۱۸۶۶ء اور اس سے قبل کا ہے۔ اودھ میں انگریزی نئی نئی قائم ہوئی ہے۔ نوابی کو رخصت ہوئے ابھی چند سال ہوئے ہیں اودھ بلکہ ملحقات اودھ میں نئی زندگی کے ہر شعبہ میں خصوصاً شعر و ادب میں پرانے لکھنؤ کی خوبو پوری طرح باقی ہے، بلکہ وہی مذاق ابھی تک حاکم ہے ؎

بے تکلف بوسۂ زلف چلیپا لیجئے — نقد دل موجود ہے پھر کیوں نہ سودا لیجئے
دل تو پہلے لیجکے اب جان کے خواہاں ہیں آپ — اسمیں بھی مجھکو نہیں انکار اچھا لیجئے

پاؤں پڑ کر کہتی ہے زنجیرِ زنداں میں رہو — وحشتِ دل کا ہے ایما، راہِ صحرا لیجئے

سنتا ہوں چمن میں جو تیری زمزمہ سنجی — "یاد آتی ہے بلبل مجھے تقریر کسی کی"

دوسرا مصرعہ طرحی تھا۔

پھر گئی آ گئی دو دن میں طبیعت کیسی — یہ وفا کیسی تھی صاحب، یہ مروت کیسی

کوچۂ یار میں جاتا تو نظارہ کرتا — قیس آوارہ ہے جنگل میں یہ وحشت کیسی

جذبۂ دل نے میرے تاثیر دکھلائی تو ہے — گھنگھروؤں کی جانبِ در کچھ صدا آئی تو ہے

عشق کے اظہار میں ہر چند رسوائی تو ہے — پر کروں کیا اب طبیعت آپ پر آئی تو ہے

آپ کے سر کی قسم میرے سوا کوئی نہیں — بے تکلف آئیے کمرہ میں تنہائی تو ہے

دوسرا دور ۱۸۶۷ء تا ۱۸۸۴ء۔ رندی معاملہ بندی، و ہوسناکی کے مضمون اس دور میں بھی باقی ہیں، لیکن جذبات نگاری کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ رنگ تغزل پہلے سے کہیں زیادہ نکھر گیا ہے اور لطف زبان و حسن بیان کے جوہر جگہ جگہ اُٹھے ہیں۔ فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں؎

آج آرائشِ گیسوئے دوتا ہوتی ہے — پھر مری جان گرفتارِ بلا ہوتی ہے

شوق پابوسئ جاناں مجھے باقی ہے ہنوز — گھاس جو اگتی ہے تربت پہ حنا ہوتی ہے

پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انساں — سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے

جس نے دیکھی ہو وہ چتون، کوئی اس سے پوچھے — جان کیونکر ہدفِ تیر قضا ہوتی ہے

ہوں فریبِ ستمِ یار کا قائل اکبر — مرتے مرتے نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

ردیف کے خفیف فرق کے ساتھ اسی زمین میں ایک معرکہ کی غزل امراؤ جان ادا والے مرزا لکھنوی کی ہے اکبر کی غزل اسی کے ٹکر کی ہے۔

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا — آنکھ اُن سے ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا
جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا — بلبل گل تصویر کا شیدا نہیں ہوتا
میں نزع میں ہوں آئیں تو احسان ہے اُنکا — لیکن وہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام — وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

دوسرے شعر خصوصاً اسکے دوسرے مصرعہ میں اکبر کی معنویت پوری طرح جلوہ گر ہے اور چوتھا شعر تو گویا اب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

یار نے کچھ خبر نہ لی دل نے جگر نے کیا کیا — نالۂ شب سے کیا ہوا، آہ سحر نے کیا کیا
کھل گیا سب یہ حالِ دل ہنستے ہیں دوست بر ملا — ضبط کیا نہ رازِ عشق، دیدۂ تر نے کیا کیا

دور سوم ۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۵ء۔ دور کا کلام رنگ تغزل میں پختگی کا نمونہ ہے، طرز ادا میں سنجیدگی بڑھ گئی ہے مضمون آفرینی پر توجہ زیادہ ہو گئی ہے غزل میں اخلاقی و روحانی مضامین کی آمد بے تکلفانہ شروع ہو گئی ہے ظرافت کا چھینٹا بھی جا بجا موجود ہونے لگا ہے۔ پھر بھی تغزل کا رنگ مسلم و مستند اور ثقہ اساتذہ کا سا تھا۔ اس سے مجال نہیں کوئی مصرعہ الگ جا پڑے۔ ملاحظہ ہو ؎

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزم یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس — ایک سر بھی اُسے آمادۂ سودا نہ ملا
گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش — طالبِ زمزمۂ بلبل شیدا نہ ملا
ہوشیاروں میں تو اک اک سے سوا ہیں اکبر — مجھکو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

دل مرا ان پہ جو آیا تو قضا بھی آئی — درد کے ساتھ ہی ساتھ اسکی دوا بھی آئی
آئے کھولے ہوئے بالوں کو تو شوخی سے کہا — میں کبھی آیا ترے گھر، میری بلا بھی آئی

واے قسمت کہ مرے کفر کی وقعت نہ ہوئی
بُت کو دیکھا تو مجھے یاد خدا بھی آئی

ہوئیں آغاز جوانی میں نگاہیں نیچی
نشہ آنکھوں میں جو آیا تو حیا بھی آئی

غنچۂ دل کو نسیم عشق نے وا کر دیا
میں مریض ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا

نشان محبوبی صانع کا نشان رکھا ہو یہ
ورنہ کیا تھا جس نے دل میں درد پیدا کر دیا

کیا مرے اک دل کے خوش کرنے پہ وہ قادر نہیں
ایک کن سے دو جہاں کو جس نے پیدا کر دیا

سب کے سب باہر ہوئے، ہوش و خرد وہم و تمیز
خانۂ دل میں تم آئے ہم نے پردا کر دیا

شاہد بزم ازل نے اک نگاہ ناز سے
عشق کو اس انجمن میں مسند آرا کر دیا

شور شیریں کا مزہ رکھا سر فرہاد میں
قیس کو دیوانۂ انداز لیلا کر دیا

گردن پروانہ میں ڈالی کمند شوق شمع
رنگ گل کو دیدۂ بلبل کا پھندا کر دیا

جس نے یہ سب کچھ کیا اکبر وہیں تم سے کیا کہوں
اس نے مجھکو کیا کیا، دل کو مرے کیا کر دیا

وہ حجاب اُنکا آجتک نہ گیا
نہ گیا انکے دل سے شک نہ گیا

اک جھلک انکی دیکھ لی تھی کبھی
وہ اثر دل سے آجتک نہ گیا

سینہ کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا
اچھا ہوا مزہ تو محبت کا مل گیا

ایسے ستم کیے کہ مرا قلب ہل گیا
اور اس طرح کہ سینہ کا ہر داغ چھل گیا

تیرا پتہ چمن کو صبا سے جو مل گیا
بلبل کو وجد آ گیا، غنچہ بھی کھل گیا

خوش قسمتی پہ اپنی بجا ہے کروں جو ناز
اپنے ہی دل میں مجھکو مرا رب بھی مل گیا

الجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے
ہانکی نہ ہوس دل نے مرے طول امل سے

انکی نگہ مست ہے لبریز معانی
ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

ادراک نے آنکھیں سب اوہام میں کھولیں
واقف نہ ہوا روشنیٔ صبح ازل سے

قرآن ہے شاہد کہ خدا حُسن سے خوش ہے — کس حُسن سے یہ بھی تو سُنو حُسنِ عمل سے[1]

حکم آیا ہے جو خموشی کا تو بس حشر تلک چُپ — ہیبت ترے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے

درجہ متحیر کا ہے، بیخود سے فروتر — ہے روح کو امید ترقی کی اجل سے

بحث کہن و نو میں سمجھتا نہیں اکبر — جو ذرّہ ہے موجود ہے وہ روز ازل سے

یہ تین دور تو خود اکبر کے قائم کئے ہوئے تھے، کلیات اول کے زمانہ تک۔ اب اسکے بعد دورِ چہارم ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک سمجھئے، یہ کوئی مستقل دور نہیں اسے دورِ سوم کا تکملہ ہی سمجھنا چاہئیے۔ دورِ سوم تک کا کلام کلیات اول میں موجود ہے۔ اسکے بعد کے چار سال کا کلام کلیات دوم میں ہے، بس اسلئے اس حصہ کیلئے ایک جداگانہ دور قائم کرنا پڑا۔ اکبر ۱۹۰۹ء تک غزل میں جتنی پختگی آنا تھی آ چکی تھی شاعر کی عمر اب ۶۰-۶۲ سال ہو چکی تھی اور اسکا شمار اب استادوں میں تھا، اسکے بعد صنفِ غزل میں کسی جدت کی نہ توقع تھی، اور نہ کوئی جدت واقع ہوئی کیفیت وہی قائم رہی البتہ کمیت کے لحاظ سے یہ فرق ہوا کہ کلیات اول میں بڑا حصہ غزلوں ہی کا ہے۔ کلیات دوم میں اول تو یہ تناسب گھٹ گیا ہے اور پھر جتنا حصہ غزلیات کا ہے بھی، اسمیں بھی معاملات صرف عشق و محبت ہی کے نہیں بلکہ اخلاق، معاشرت، فلسفہ، سیاست، تصوف، معرفت سب ہی

۱؎ یہ غزل حضرت اکبر نے لکھنؤ کے ایک طرحی مشاعرہ میں پڑھی۔ عمائد لکھنؤ میں اسوقت ایک مشہور بزرگ منشی اطہر علی کاکوروی تھے۔ صاحب علم و صاحب دل۔ وہ بھی مشاعرہ میں موجود تھے۔ اکبر برسوں بعد کو بیان فرماتے تھے کہ جب میں اس شعر پر پہنچا، ابھی پہلا ہی مصرعہ زبان سے نکلا تھا کہ نظریں منشی صاحب سے چار ہو گئیں۔ ان کے تیور پر بل تھے کہ قرآن اور خدا تک سے شوخی! میں نے عرض کیا کہ مصرعہ ملاحظہ ہو۔ یہ کہہ کر جو دوسرا مصرعہ پڑھا تو منشی صاحب "حسن" کی تشریح حسن عمل سے سنکر پھڑک اٹھے اور مجھے گلے لگا لیا۔

کے مضمون شامل ہیں۔ بایں ہمہ اس دور کا عاشقانہ حصّہ بھی کسی اعتبار سے بھی نظر انداز کرنیکے قابل نہیں ریطیف و کیف ایک ایک سطر سے نمایاں، پختگی اور شگفتگی کے ثبوت ہر ہر صفحہ پر مضمون آفرینی اور استادی کا رنگ ایک ایک شعر سے پھوٹا پڑتا ہے طبیعت کی آمد ندرت مضامین کے ساتھ ردیف و قافیہ میں بھی جدت کی بہار دکھانے لگتی ہے ؎

وقت طلوع دیکھا، وقت غروب دیکھا | اب فکر آخرت ہو، دنیا کو خوب دیکھا
اس نے خدا کو مانا، وہ ہو رہا بتوں کا | یا اس نے خوب سمجھا یا اسنے خوب دیکھا

نہ یہ رنگ طبع ہوتا نہ یہ دل میں جوش ہوتا | یہ جنوں اگر نہ ہوتا، تو کہاں یہ ہوش ہوتا
غم دہر سے بچاتا ہے بشر کو مست رہنا | مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا
تمھیں دیکھ حسن کی فطرت نے ہیں نقش کھینچے ورنہ | نہ یہ ہوتی چشم نرگس نہ یہ گل کا گوش ہوتا
دل و دین سب اسکے صدقے جو وہ خود نما بنا ہے | کوئی زندہ ہی نہ رہتا جو وہ خود فروش ہوتا
حسن نظامی، اکبر کا کلام سن کے بولے | تجھے میں ولی سمجھتا جو خرقہ پوش ہوتا

بتوں سے میل، خدا پر نظر یہ خوب کہی | شب گنہ و نماز سحر یہ خوب کہی
تمھاری خاطر نازک کا ہے خیال فقط | وگرنہ مجھکو رقیبوں کا ڈر، یہ خوب کہی
شباب بادہ و فکر مآل کار چہ خوش | جنون عشق و خیال خطر، یہ خوب کہی
سوال وصل کروں یا طلب ہو بوسہ کی | وہ کہتے ہیں امری ہر بات پر، یہ خوب کہی

آہ دل سے جو نکالی جائے گی | کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی
یاد انکی ہے بہت عزلت پسند | آہ بھی دل سے نکالی جائے گی
نزع کہتی ہے کہ روٹھی تجھسے جاں | حشر کہتا ہے منالی جائے گی

یاد ابرو میں ہے اکبر محو کیوں | کب تری یہ کج خیالی جائے گی

اک صوتِ سرمدی ہے جسکا اتنا جوش ہے | ورنہ ہر ذرّہ ازل سے تا ابد خاموش ہے

آئینہ سے کبھی وہ بچتے ہیں کہ پڑ جائے نہ عکس | شرم کہتی ہے کہ یہ بھی صاحبِ آغوش ہے

حضرت منصور کہتے ہیں "انا" بھی حق کیساتھ | دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہے

(یہ تیسرا شعر منصور حلاج کی پُر شور معرکۃ الآرا بحث میں قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔
دوسرا مصرعہ پڑھتے وقت "تکلیف شرعی" کی اصطلاح ذہن میں رہے)

شوق وصل شغلہ رویاں کیوں نہ ہو برسات میں | ابر کو کبھی دیکھتا ہوں برق در آغوش ہے

رنگِ شراب سے مری نیت بدل گئی | واعظ کی بات رہ گئی، ساقی کی چل گئی

تیار تھا نماز پہ میں سُن کے ذکرِ حور | جلوہ بتوں کا دیکھ کے نیت بدل گئی

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمہ پہ شاد ہے | صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

چمکا ترا جمال جو محفل میں وقتِ شام | پروانہ بے قرار ہوا، شمع جل گئی

حسرت بہت ترقیٔ دختر کی تھی انھیں | پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

دور پنجم سنہ۱۹۱۴ء تا سنہ۱۹۱۹ء۔ اس دور کا کلام کلیات سوم میں ہے اور وہی تبصرہ کا اصل موضوع ہے۔ شاعر کی عمر اب ستر کے لگ بھگ یا ستر سے اوپر ہے، اور اب وہ شاعر سے کہیں زیادہ متفکر ہے۔ دل شاہد و شراب، چنگ و رباب کے تذکروں سے اچاٹ ہو چکا ہے۔ معرفت اور عشق حقیقی کی آگ بھڑک چکی ہے۔ رواجی، مجازی تغزل کا رنگ ہلکا پڑ چکا ہے۔ غزل کہنا بھی اس زمانہ میں بہت کم ہو گیا تھا۔ عموماً سیاسی، اخلاقی عارفانہ و ظریفانہ نظمیں کہا کرتے تھے۔ عنوان غزلیات کا کلیات سوم میں بھی خاصہ بڑا نظر آتا ہے لیکن درحقیقت غزلیت کا عنصر انمیں بہت ہی کم ہے عموماً وہ واقعا

حاضر پر شاعر کے خیالات اور تجربے ہیں۔ صرف غزل کے سانچے میں انھیں موزوں کر دیا گیا ہے۔ یہ خصوصیت موجود تو انکی ابتدائی غزلوں میں بھی ہے، درمیانی کلام میں بڑھ گئی تھی۔ اور آخر زمانہ میں تو یہی خصوصیت دوسری خصوصیتوں پر چھا گئی اور غالب آگئی۔ کلیات اول کے پہلے اڈیشن کے شائع ہونے پر ایک ناقد نے اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ:۔

"مصنف بہ نسبت شاعر کے بہت زیادہ ایک تھنکر (سوچنے والا صاحب فکر) یا فلاسفر، ہے جس نے اپنے خیالات کو خوبی کے ساتھ نظم کر دیا ہے"۔

حضرت اکبر کو یہ رائے بڑی پسند آئی، اسے وہ اپنی حقیقی داد سمجھے، اور واقعہ ہے بھی یہی کہ جوں جوں انکی شاعری نکھرتی گئی وہ روز بروز اس خیال کے مصداق زیادہ سے زیادہ ہوتے گئے۔ مثال کے طور پر کلیات سوم کی دو ایک غزلیں درج ذیل ہیں ان سے معلوم ہوگا کہ قالب اگرچہ غزل کا ہے لیکن روح ذرا بھی غزل کی نہیں (غزل اپنے عام عرفی و مقبول معنی میں) جام و سبو کی شکل پر جائیے تو اب بھی ہر طرف شراب ہی شراب نظر آئے گی، لیکن جھک کر دیکھئے تو آپ خود ہی پکار اُٹھیں گے کہ "استغفراللہ" شراب خانہ خراب کیسی، یہ تو گلاسوں میں طریقت و معرفت کا آب طہور جھلک رہا ہے ظرافت کی چاشنی سیاسیات کے شربت میں شیر و شکر ہوتی نظر آرہی ہے"۔

ذیل کی غزل کو آپ غزل کہیں گے، یا ایک درس تصوف؟ "سخن بازنان گفتن" اگر غزل کی تعریف ہے تو یہ غزل کسی معنی میں بھی ہے؟

نگاہ اُٹھی ہے احساس ماسوا کے لئے ۔۔۔ کہاں ہو دل ذرا رو کے اسے خدا کیلئے
رواں ہو کارجہاں کیوں ہماری مرضی پر ۔۔۔ خدا ہمارے لئے ہے کہ ہم خدا کیلئے

عمل خدا کے لئے ہو تو اسکا کیا کہنا مگر ریا یہ بُری صرف واہ واہ کیلئے
لیلائے تغزل کے مجنوں دور سے محمل کو دیکھ کر شوق سے اسکی طرف لپکتے ہیں، پاس آکر اندر جھانکتے ہیں تو نہ کوئی عشوہ فروش ہے نہ کوئی زہرہ جبیں بلکہ ایک شیخ وقت تسبیح و تہلیل میں مصروف نظر آتے ہیں ؎

خدا کے نام کا ہے احترام عالم میں نہ صرف آپ میں ہم میں یا تمام عالم میں
اسی کا نام نہ کیوں مرکز زباں ہو جائے کہ اختلاف سے خالی ہو کام عالم میں
خدا پرست کو کافی ہے مثل ابراہیمؑ زوال شمس و قمر، صبح و شام عالم میں
یہی مشن تھا جناب رسول اکرمؐ کا اور آج انھیں کا تو روشن ہے نام عالم میں

چنگ و رباب کے رسیا دور سے باجے گاجے کی آواز سن سنا دوڑتے ہوئے آتے ہیں کہ چلیں اندر سبھا کے ناٹک کا لطف اُٹھائیں۔ جلوہ گاہ کا پردہ جب اُٹھتا ہے تو سمجھئے وہ سارا تخیل ہی برباد۔ نہ مطرب ہے نہ ساز، نہ ساقی ہے نہ اسکا انداز۔ محفل میں یا بجائے ساز کے سوز ہے، لبوں پہ بجائے واہ کے آہ ہے طبلہ کی تھاپ کی جگہ ضربیں اللہ ھُو کی لگ رہی ہیں، چہروں پر بجائے ہنسی کی کھکھلاہٹ کے خشیت الٰہی۔ درمیان میں ایک صاحب حال درویش اپنی آگ سے دوسروں کو گرما رہے ہیں ؎

گو سعی ہوائے شوق نے کی، بو اسکی نہ نکلی محفل سے مجنوں نے اڑائی خاک بہت، لیلیٰ نے نہ جھانکا محمل سے
دنیا کے تغیر کا نہیں حس شیدائے جمال یاری کو پروانہ کو مطلب شمع سے ہے، کیا کام ہے رنگ محفل سے
احساس ہی ایذا کا نہوا، فریاد و فغاں میں کیا کرتا جس وقت تہ خنجر تھا گلا، آنکھ اپنی ملی تھی قاتل سے

طبیعت زہد خشک سے اکتا چلی ہو، اور دل میں ظرافت کی گدگدی اُٹھ رہی ہو تو اس رنگ کو لیجئے کبھی کہیں دور نہیں جاتا ہے۔ ندرت قوافی کے طلسم ساز کیلئے آگ کو برف

بنا کر پیش کر دینا کیا مشکل ہے۔ اس رنگ کا کلام بھی غزلوں ہی کے تحت میں موجود ہے

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے — صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہے باقی جناب قبلہ میں — کچھ حدیثیں ہیں، ایک ڈنڈا ہے

غرض آخری دور کا جو کلام غزلیات کے زیر عنوان رکھا گیا ہے، اسکا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ بس وہ نام ہی کی غزلیں ہیں۔ با ایں ہمہ جب غزل سرائی پر آئے ہیں تو پورے عاشق بن گئے ہیں، جو کچھ بھی عاشقانہ رنگ میں کہا ہے خوب کہا ہے اپنے مرتبہ کمال کو اس رنگ میں بھی قائم رکھا ہے اور درجۂ استادی کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے لطف زبان وسلاست بیان انکی غزل کی جان ہے۔ دشوار پسندی نے بعض اچھے اچھے غزل گویوں کو غارت کر دیا ہے۔ اکبر کا گلستان ان کانٹوں سے بالکل پاک ہے۔ پھر بیان کی لطافت کے ساتھ خیال کی بلندی بھی موجود صورت کے بناؤ سنگار میں اتنا محو نہیں ہوتے کہ سیرت کی تہذیب وشائستگی سے غافل ہو جائیں۔ جانتے ہیں کہ قافلے میں سبھی طرح کے لوگ ہیں۔ ایسے بھی جو محمل کی آب وتاب، چمک دمک سے ہی خوش ہو لیں گے۔ ایسے بھی جو محمل نشیں کی زیارت کے بغیر دم نہ لیں گے۔ دونو طبقات کے دلوں کی ڈوریں یہ ناقہ بان سخن اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔

رسمی شاعروں کے خلاف، ایک غزل میں تماشا گاہ فطرت کا نظارہ کرتے ہیں اور فطرت کے کھلے ہوئے میدان میں دن دوپہر وہ مزے حاصل کرتے ہیں جن کی تلاش رسمی شاعروں کو خدا جانے کہاں کہاں سرگرداں رکھتی ہے۔ اور یہ لطف انھیں خلوت میں نہیں جلوت میں بھی ہمہ وقت حاصل ہے۔ لیکن پھر آخر جذبات مشرقی شاعر کے رکھتے ہیں اور اسکو مقطع میں نباہ لے جاتے ہیں ؎

جلوہ عیاں ہے قدرت پروردگار کا | کیا دلکشا یہ سین ہے فصل بہار کا
نازاں ہیں جوش حسن پہ گلہائے دلفریب | جوبن دکھا رہا ہے یہ عالم بہار کا
ہیں دیدنی بنفشہ و سنبل کے پیچ و تاب | نقشہ کھنچا ہوا ہے خط و زلف یار کا
سبزہ ہے یا یہ آب زمرد کی موج ہے | شبنم ہے بحر یا گہر آبدار کا
مرغان باغ زمزمہ سنجی میں محو ہیں | اور ناچ ہو رہا ہے نسیم بہار کا
ابر تنک نے رونق موسم بڑھائی ہے | غازہ بنا ہے رُوئے عروس بہار کا
افسوس اس سماں میں بھی اکبر اداس ہے | سوہانِ رُوح ہجر ہے اک گلعذار کا

رسمی شاعر بیچارے حقیقت سے بے نیاز، محض الفاظ کی تراش و خراش میں لگے رہتے ہیں۔ انکی شاعری پر یہ حقیقی شاعر کیسی جنچی تلی رائے کا اظہار کرتا ہے، رائے شاعرانہ بھی اور صحیح بھی ؎

معنی کو چھوڑ جو ہوں نازک بیانیاں | وہ شعر کیا ہے رنگ ہے لفظوں کے خون کا

ذیل کی غزل میں تغزل کے پامال مضمونوں کو زمین سے اُٹھا کر آسمان پر پہونچا دیا ہے آخری شعر اس پایہ کا ہے کہ کہنے والے کی نجات کے لئے بس کرتا ہے ؎

گھٹتا جاتا ہے مری نظروں میں مقدور مرا | بڑھتا جاتا ہے شمار انکے خریداروں کا
بحث میں عفو و سزا کے یہ لڑے مرتے ہیں | فیصلہ کر ہی دو اب اپنے گنہگاروں کا
بے خطر پھرتا ہوں بازار جہاں میں ہر سو | کیسہ خالی ہے تو کیا خوف ہے عیاروں کا
فطرت اُٹھی ہے شفاعت کو، ملائک ہیں خموش | حشر ہے عشق و محبت کے گنہگاروں کا

غزلیہ شاعری کا سب سے زیادہ پامال مضمون عشق ہے۔ ہر سخن گو کا تختۂ مشق یا تکیہ کلام۔ دفتر کے دفتر اسکی شرح میں سیاہ ہو چکے ہیں اور عاشقوں کی تعداد کا کوئی شمار و حسا

ہی نہیں لیکن کیفیتِ عشق، لفظ و عبادت کی مدد سے کچھ بھی واضح ہو پائی ہے؟ اکبر اس گونگے کے خواب کی مصوری اپنے مرقع میں کرتے ہیں ؎

عشق میں حسنِ بیان وجہ تسلی نہوا   لفظ چمکا مگر آئینہ معنی نہوا

اکبر کے دورِ آخر کی اکثر غزلوں کی تان یاس و افسردگی کی آہوں پر آکر ٹوٹتی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور اس سے اپنی بے تعلقی، لذات دنیا کی بے حقیقتی، یہ موضوع اکثر غزلوں میں مشترک ہو۔ ذیل کی غزل انہی جذبات کی ترجمان ہو بعض تشبیہوں کی ندرت پر لطافت لوٹ لوٹ جاتی ہے ؎

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں   بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں
زندہ ہوں مگر زیست کی لذت نہیں باقی   ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں
اس خانۂ ہستی سے گزر جاؤنگا بے لوث   سایہ ہوں فقط نقش بہ دیوار نہیں ہوں
افسردہ ہوں عبرت سے دوا کی نہیں حاجت   غم کا مجھے یہ ضعف ہو، بیمار نہیں ہوں
وہ گل ہوں خزاں نے جسے برباد کیا ہے   الجھوں کسی دامن سے وہ خار نہیں ہوں
یارب مجھے محفوظ رکھ اس بت کے ستم سے   میں اسکی عنایت کا طلبگار نہیں ہوں
گو دعوئ تقوی نہیں درگاہ خدا میں   بت جس سے ہوں خوش ایسا گنہگار نہیں ہوں
افسردگی و ضعف کی کچھ حد نہیں اکبر   کافر کے مقابل میں بھی دیندار نہیں ہوں

دنیا میں رہ کر دنیا سے بے لوث و بے تعلق رہنے کو بہت سے شاعروں نے باندھا ہے لیکن یہاں پہلے اور تیسرے شعر میں جن لطیف و دلنشین تشبیہات کی مدد سے جو مضمون باندھا گیا ہو، وہ اکبر ہی کا حصہ ہو۔ ضعف کا مضمون بھی پامال ہو چکا ہے، لیکن اکبر چوتھے شعر میں ایک نیا پہلو یہ نکال لیتے ہیں کہ غم و افسردگی میں اسقدر لاغر ہوں کہ لوگ مجھ

بیمار سمجھ رہے ہیں اور دوا کی فکر میں ہیں۔ چھٹے اور ساتویں شعر میں سیاسی مراد و کنائے ہیں۔
عشق کا دم بھرنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہوں، لیکن واقعی عشق رکھنے والے دو چار ہی ملیں گے۔ آہیں سب کرتے ہیں لیکن مجنوں کا سوز کسی کی آہ میں نہیں ملتا۔ سوزِ عشق کی اہلیت بس مخصوص ہی اشخاص میں ہوتی ہے۔ عام خلقت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ اس مفہوم کو یہ شاعر یوں ادا کرتا ہے ؎

باطن بہت ہیں ایسے جو مشتعل نہیں ہیں
سینہ میں سب کے دل ہیں سب اہلِ دل نہیں ہیں

اس مضمون کو ایک مطلع میں بھی ادا کیا ہے ؎

مقبول جو ہوں شاذ ہیں، قابل تو بہت ہیں
آئینہ کے مانند ہیں کم، دل تو بہت ہیں

یہ "مقبول" و "قابل" کا تقابل بھی کیا خوب!

وہ کم ہیں تڑپنے میں جنھیں ملتی ہو لذّت
یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں

تیغ کے بسمل تو ہزاروں نکل آئیں گے، لیکن اس تڑپ میں لذّت پانے والے کتنے نکلیں گے، مجاز پر محمول کیجیے یا حقیقت پر، سیاست میں لے جائیے یا معرفت میں۔ بہر حال ہر پہلو سے سمجھا جائیے، الٹ پلٹ کے اس شعر کو تیجیے واقعیت سے خالی کوئی بھی پہلو نہ نکلے گا۔

عاشق خوب جانتا ہے کہ کوئے قاتل میں پھرنا، جان سے ہاتھ دھونا ہے، لیکن اگر انجام بینی اس قصد سے باز رکھے اور دل پر اسے اتنا ہی قابو حاصل رہے تو پھر عاشق کیوں کہلائے ؎

ذوق ہوائے کوچہ قاتل کو کیا کروں
مہلک سہی یہ شوق مگر دل کو کیا کروں

اضطراب، جوش و خروش، کوئی بھی شے آپ کے اپنے قصد و اختیار سے

پیدا نہیں، یہ ساری کیفیات اضطراری ہیں۔ تاثر قلب اس سے خود بخود یہ سب کچھ کراتا رہتا ہے۔

اظہار اضطراب کا شائق نہیں ہوں میں — پہلو میں لیکن اس دل بسمل کو کیا کروں

ناصح کہتے ہیں کہ نظارۂ گل ترک کرے تو دل قابو میں آجائیگا۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ ہوا کی مستی اور دوسرے عاشقوں کی صدائیں کب دل پر قابو رہنے دیں گی ؎

قطع نظر گلوں سے نہیں مانع جنوں — بوئے بہار و شور عنادل کو کیا کروں

داغ کی ایک غزل ہے ؎

بات میری کبھی سنی ہی نہیں — جانتے وہ بُری بھلی ہی نہیں

اسکا یہ شعر زندہ و معروف ہے ؎

لطف مے تجھسے کیا کہوں زاہد — ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اس زمین میں اکبر نے جو گل بوٹے کھلائے ہیں، ذرا اسکی بھی سیر ہو جائے ؎

چرخ سے کچھ امید تھی ہی نہیں — آرزو میں نے کوئی کی ہی نہیں
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں — فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
چاہتا تھا بہت سی باتوں کو — مگر افسوس اب وہ جی ہی نہیں
جرأت عرض حال کیا ہوتی — نظر لطف اُسنے کی ہی نہیں
اس مصیبت میں دل سے کیا کہتا — ایسی کوئی مثال تھی ہی نہیں
آپ کیا جانیں قدر "یا اللہ" — جب مصیبت کوئی پڑی ہی نہیں
شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا — میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں
پوچھا اکبر ہے آدمی کیسا — ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں

"فالتو" کو کس خوبی سے کھپا دیا ہے اور "سوسائٹی" کا قافیہ لانا تو اکبر ہی کا حصہ تھا۔

گردش چرخ کا شکوہ سب ہی شاعر کرتے آئے ہیں، اکبر نے دوسروں کے تجربہ سے فائدہ یہ اٹھایا کہ سرے سے کوئی آرزو ہی فلک سے قائم نہ کی، اور مزے میں رہے۔ پانچویں شعر میں ایک نادر مضمون باندھا ہے مصیبت زدہ کی تسکین کے لیئے دوسروں کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں، لیکن ہمارے شاعر کو جن مصائب کا سامنا ہوا ہے انکی کوئی نظیر اتک موجود ہی نہ تھی۔ وہ کس کی مثال سے اپنے دل کو تسکین دے مصائب کے فوق الحد ہونے کا یہ ایک نادر پیرایہ اظہار ہے چھٹے اور ساتویں شعر کا تعلق ذاتی تجربہ سے ہے انکی داد دینا، بغیر آپ بیتی کی مدد کے ممکن نہیں۔ ایک اور غزل ملاخطہ ہو ؂

جلوۂ ساقی و مۓ جان لئے لیتے ہیں
شیخ خوش ہوں کہ خفا ہم تو پئے لیتے ہیں

دل میں یاد انکی جو آتی ہوئی شرماتی ہے
درد اُٹھتا ہے کہ ہم آڑ کئے لیتے ہیں

دورِ تہذیب میں پریوں کا ہوا دُور نقاب
ہم بھی اب چاک گریباں کو سیئے لیتے ہیں

خودکشی منع، خوشی گم، یہ قیامت ہے مگر
جینا ہی کتنا ہے اب خیر جیئے لیتے ہیں

لذت وصل کو پروانہ سے پوچھیں عشاق
وہ مزہ کیا ہے جو بے جان دیئے لیتے ہیں

دوسرا شعر عاشقانہ رنگ میں لاجواب ہے۔ عارفانہ پہلو بھی ہے مضمون کتنا سچا ہے کہ بغیر درد کے انکی یاد ہی نہیں ہو سکتی اور اسے کس بانکپن سے ادا کیا ہے۔ آخری شعر بھی اسی رنگ میں ہے تیسرے اور چوتھے شعر میں شاعر پھر اپنے اصل عالم میں چلا گیا ہے۔

نامانوس قافیہ لاکر کلام میں شعریت باقی رکھنا، بلکہ اسکے لطف و ذوق کو دوبالا کر دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ازل سے یہ دولت اکبر کے حصہ میں آچکی

تھی۔ فرماتے ہیں اور کس بے تکلفی کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

اس دور میں شاعر کیلئے قوت نہیں ہے — اس باغ میں طوطی کیلئے توت نہیں ہے
نیچر میں جوانی کو تو موجود ہی پایا — سائنس سے سنتے تھے کہیں بھوت نہیں ہے
لفظوں ہی کی حکمت میں ہیں اب افعل و فعلن — چرخا ہی چلا جاتا ہے اور سوت نہیں ہے
نیچر ہی کا مطبخ ہے بہت معتبر اکبر — تم دیکھتے ہو کھیل میں کہیں چھوت نہیں ہے

اکبر کا اصلی مقام معرفت و حقائق کا "لاہوت" ہے لیکن جب قافیہ پیمائی کی "ناسوت" میں اترتے ہیں تو دیکھنے والوں کو "مبہوت" کر دیتے ہیں اب مزید توصیف سے "سکوت" ہی اولیٰ ہے۔

خالص عاشقانہ رنگ کے شیدائی اپنے ذوق کی تسکین کا سامان عجیب نہیں کہ ان غزلوں میں پاسکیں ؎

عشق کہتا ہے بیان حال کی پروا نہ کر — تیرے دل کی خود بخود انکو خبر ہو جائیگی
میں شب فرقت میں تڑپوں اور وہ سوئیں چین سے — کس طرح مانوں محبت بے اثر ہو جائیگی

تجھے اے امید فردا دل و جان سے پیار کرتے — مگر اپنی زندگی کا نہیں اعتبار کرتے
ہے بتوں کی خود نمائی مری غفلتوں سے قائم — میں اگر نظر نہ کرتا تو وہ کیوں سنگار کرتے
تیرے ہاتھ کی نہ نیت تو ہے شاخ گل سے افزوں — ہمیں دسترس جو ہوتا تو گلے کا ہار کرتے

صبر رہ جاتا ہے اور عشق کی چل جاتی ہے — ضبط کرتا ہوں مگر آہ نکل جاتی ہے
کچھ نتیجہ نہ سہی عشق کی امیدوں کا — دل تو بڑھتا ہے طبیعت تو بہل جاتی ہے
شمع کے بزم میں جلنے کا جو کچھ ہو انجام — مگر اس عزم سے سانچے میں تو ڈھل جاتی ہے

کتمان راز عشق مرے آب و گل میں ہے — خاموش ہے زباں جو کچھ ہے وہ دل میں ہے
افعی و زلف مس کا تو سودا ابھرا نہیں — پیچیدگی جو کچھ ہے فقط اسکے بل میں ہے

بل افراد حساب کا تعلق "سودے" سے خاص انگریزی دوکانداری کا ضلع ہے۔ لکھنؤ کا ذوق قدیم اسکی زیادہ قدر نہ کرسکیگا۔ البتہ "یہ افعی" و "زلف"، اور پھر دونوں کیلئے "پیچیدگی"۔ عجب نہیں جو اہل لکھنؤ ان مناسبتوں پر "لوٹ پوٹ" جائیں۔ اکبر کے سارے قصور معاف کردیں۔ داد میں "دفتر کے دفتر" سیاہ کردیں۔ لفظ لفظ کیا "نقطہ نقطہ" کی تشریح "موبمو" کرنے لگیں "بال" کی کھال نکالنے لگیں اور "سلسلہ بیان" دیر تک "برہم" نہونے پائے۔

کہیں کہیں شعر اس رنگ کا بھی فرماگئے ہیں جو استاد امانت کی روح کو وجد میں لے آئے مثلاً ؎

اس سرو قد پہ اکبر مدت سے مر رہا ہوں
اللہ راست لائے کوشش تو کر رہا ہوں

بےساختگی تو یہاں بھی ہے، لیکن اسکے باوجود بھی ایسی مثالیں شاذ ہی ملیں گی۔ عموماً کہتے وہی ہیں جو دل میں محسوس کرچکے ہوتے ہیں۔ انکی شاعری اکھاڑے کا کرتب نہیں، واردات قلب کا عکس ہے اپنے پر جو گزرتی ہے وہی دوسروں کو بھی سناچلتے ہیں۔ خود بھی اپنے اس ہنر سے واقف ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ بجز اسکے اور اپنے کلام میں رکھا ہے کیا؟ ؎

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

اپنے میں اور رسمی شاعروں میں جو فرق پایا اُسے بھی صاف صاف بیان کردیا ہے ؎

میں اپنے آپ میں ان شاعروں میں فرق پاتا ہوں
سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں

اتنا نمونہ حضرت اکبر کی آخری دور تغزل کا کافی ہوگا۔ ضمناً ابتدائی اور وسطی دور کے کلام سے بھی تعارف ہوگیا۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر کی عظمت کی بنیاد انکے عاشقانہ کلام پر نہیں، دوسرے اصناف سخن پر ہے لیکن اسکے باوجود خاص تغزل میں بھی انکا مرتبہ اردو شاعروں میں کچھ گیا گزرا نہیں۔ گو انکے لئے باعث توہین اور انکے پرستاروں کیلئے باعث شرم ہو، روزمرہ، شیرینی اور زبان کی صفائی میں انکی اکثر غزلوں پہ داغ کے کلام کا دھوکا ہوجاتا ہے اور معنوی بلند پروازیوں میں اگر وہ غالب کے ہم سطح نہیں تو بھی مومن و شیفتہ وغیرہ کے طبقہ میں تو انھیں بے تکلف جگہ مل ہی سکتی ہے۔ مثالیں کلام کے ابتدائی اور درمیانی دور میں بکثرت ملیں گی۔ آخری دور

(د) اخلاق و معاشرت

اکبر کے صحیفہ کمال کا روشن ترین عنوان اخلاق و معاشرت ہے۔ اُن کی شاعری کی روح یا جان انکی اخلاقی و معاشری تعلیمات ہی ہیں ابتدائی دور میں تغزل کی شوخیاں غالب تھیں آخری دور میں تصوف کے خرقہ پوش ہو گئے تھے لیکن دو چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے اول سے آخر تک کبھی ساتھ نہ چھوڑا، بلکہ ہر دور میں رفاقت قائم رکھی۔ پیرایۂ ادا کی حد میں انداز بیان کی لطافت و ظرافت اور مفہوم سخن و موضوع کلام کے حدود میں اصلاح معاشرت و تزکیہ اخلاق۔

اکبر کی شاعری کے کمال عروج و شہرت کا زمانہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی ہے۔ لیکن انکی اصلاحی شاعری کی بنیاد انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں پڑ چکی تھی۔ اور خاصے مشہور وہ بیسویں صدی کے شروع ہی سے ہو چکے تھے۔ ہندوستان خصوصاً مسلمانان ہندوستان میں عین یہی زمانہ، مغربی تمدن، مغربی معاشرت مغربی علوم، غرض مغربیت کے ہر شعبہ کے انتہائی عروج مقبولیت و فروغ کا ہے۔ اکبر جب دنیا میں روشناس ہوئے ہیں تو اسوقت کی صورت حال کا نقشہ ذرا تفصیل کے ساتھ تصور میں لے آیئے۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کو فرد ہوئے ابھی چند سال ہوئے ہیں اور ہندوستان[1] اسکا پوری طرح مزہ چکھ چکا ہے کہ زبردست کے مقابلہ میں کمزور کے سر اُٹھانے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے ملت اسلامی خصوصیت کے ساتھ اپنی غفلتوں اور عشرت پرستیوں کے نتائج

---

[1] لفظ "ہندوستان" کتاب میں جہاں جہاں آیا ہے، مراد قبل تقسیم کے ہندوستان بشمول پاکستان سے ہے۔

بھگت رہی ہے۔ صدیوں تک جس ملک میں حکومت کی، بڑے کر و فر کے ساتھ، بڑی شان شوکت کے ساتھ کی، کبھی غوریوں کے نام سے، کبھی خلجیوں کے لقب سے، کبھی سیدوں کے لباس میں اور کبھی تغلقوں کا جھنڈا اڑا کر، اور آخری دو صدیاں مغلوں کے نام سے، اسی ملک میں مسلمان، اب حقیر و ذلیل تھے۔ ہر سمت سے پٹے ہوئے چاروں طرف سے مار کھائے ہوئے۔

اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعائر کو رخصت ہوئے مدت ہو چکی۔ وہ اگر زندہ ہوتے تو مغلوبیت کی یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ ثروت و خوشحالی اول تو باقی ہی کہاں، جائیدادیں بار قرض سے دبی ہوئی، مکان اور زیور مہاجنوں، اور ساہوکاروں کے یہاں رہن۔ اور پھر جو کچھ روپیہ پیسہ رہا بھی وہ ناچ رنگ کھیل تماشا، ٹیم ٹام کی نذر۔ نہ تعلیم و تربیت نہ اتحاد و تنظیم، نہ ہمت و خودداری، نہ جوش توحید و ولولہ، دینی نہ قناعت و ایثار عقیدے مشرکانہ۔ اخلاق جاہلانہ، عادتیں مسرفانہ آپس میں حسد و بغض، ایک کی تاک میں ایک لگا ہوا۔ عجمیت اور ہندویت کے حملے تو سیکڑوں سال سے جاری تھے۔ اب آخری زبردست ٹکر فرنگیت کی چٹان سے ہوئی اور اس نے کہنا چاہیے کہ پرانے عربی جہاز کی چول چول ڈھیلی کر دی۔

ادھر مغرب کی اس زیرک و زمانہ شناس اور اقبال مندی کے لحاظ سے پُر شباب قوم انگریز نے تیر و تبر، توپ و تفنگ سے کہیں زیادہ بے پناہ حربہ پروپگنڈا کا استعمال شروع کر دیا۔ اور اپنے ایجنٹوں، گماشتوں، کارندوں، کو اسکول اور کالج کے مادی قالب میں بنا کھڑا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دل پر برطانیہ کی عظمت کا نقش، ہر زبان پر اقبال سرکار کا کلمہ، داد خواہی کے لئے گھر سے نکلئے تو قانون انگریزی، کتابیں

انگریزی، عدالتیں انگریزی، لڑکوں کو پڑھنے بٹھائیے تو اسکول انگریزی، کالج
انگریزی، کتابیں انگریزی، زبان انگریزی، سفر کے لئے باہر نکلئے تو سڑکیں انگریزی۔
سواری (ریل)، انگریزی، ٹکٹ انگریزی، سفر کی منزلیں (اسٹیشن) انگریزی۔ دکھ درد
میں مبتلا ہو جیئے، تو علاج کیلئے دوائیں انگریزی، تشخیص انگریزی، شفاخانے انگریزی
مرہم پٹی انگریزی، خط بھیجئے، یا پارسل منگائیے تو ڈاک انگریزی، ڈاکخانہ انگریزی۔ روپیہ
جمع کرنے، یہی کھاتہ کھولنے کا شوق ہو تو بینک انگریزی، سیونگ بینکس انگریزی۔
ناول اور ڈرامے انگریزی، ورزشی کھیلوں کیلئے دل للچائیے تو کھیل انگریزی رکٹ یا
گرکٹ، ٹینس اور انٹا[1]۔ شام کو سیر و تفریح کیلئے قدم اٹھائیے تو سامان تفریح انگریزی
پارک میں، لان میں، کلب میں، ہوٹل اور ریسٹوران میں، رات کو رنگ رلیاں منانے کو جی
چاہے تو تماشے انگریزی، تھیٹر، کنسرٹ، آپیرا۔ ماضی کو جاننا چاہیئے تو تاریخیں
انگریزی۔ حال سے باخبر رہیئے تو اخبارات انگریزی، تار برقیاں انگریزی۔ پیشے
انگریزی، بیرسٹری، وکالت، ڈاکٹری، انجینیری، عہدے انگریزی، علوم انگریزی
فنون انگریزی، صنائع انگریزی۔ خلاصہ یہ ہے کہ زمین انگریزی آسمان انگریزی۔

اپنی پستی اور "صاحب" کی بلندی، اپنی خاک نشینی اور صاحب کی فلک پیمائی
دیکھ، حواس بجا کس کے رہ سکتے تھے؟ خصوصاً جبکہ اپنے دل و دماغ کا سرمایہ پہلے

---

[1] ایک بہت پرانا انگریزی کھیل۔ اب مدت ہوئی متروک ہو گیا ہے۔ شروع انگریزی راج میں اس کا بہت
رواج تھا۔ جن شہروں میں شروع شروع انگریزی چھاؤنیاں قائم ہوئیں تھیں۔ وہاں انٹا گھر کے نام سے عمارتیں
اب بھی موجود ہیں۔ میاں منیر شکوہ آبادی ایک پرانے اردو شاعر ہوئے ہیں صاحب دیوان۔ وہ بھی ایک جگہ باندھ گئے ہیں۔

جیت جاتے ایک مہینہ بھر کے لیے بازیاں
ہم جو انٹا اس قمر سے نیں دیکے کھیلتے۔

ہی لٹ چکا ہو۔ ہوش گم، نگاہیں خیرہ، عقل دنگ، مرعوبیت غالب، دماغ مفلوج ڈوبتے کو گھاس کے تنکے کا سہارا کافی نظر آیا۔ اندھیرے میں اپنے ہی سایہ پر بھوت کا گمان گزرا، التباس حواس میں دیو پری کا حسن و جمال معلوم ہوا۔ دیر میں حرم کا تقدس دکھائی دینے لگا۔ اچھے اچھے ہوشمند اور مخلص، سید احمد خاں اور انکے سارے رفیق یک زباں ہو کر پکار اُٹھے کہ "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" بھائیو بجز مذہب کے ہر چیز میں انگریز بن جاؤ فلاح اور زندگی کا سہارا بس اسی میں ہے

حالی بڑے خشوع و خضوع سے مسدس اسلام کھول بیٹھے لیکن مناجات کا خلاصہ بس یہی کہ اے پاک پروردگار ہمکو عمل میں انگریزوں سا بنادے! شبلی نے بڑے ٹھاٹھ سے نامورانِ اسلام کا دربار سجایا۔ لب لباب اسکا بھی یہی کہ ہمارے اکابر سلف دانایانِ فرنگ سے کیا کچھ کم تھے۔ اور نذیر احمد، ذکاء اللہ، محسن الملک، چراغ علی بیچاروں کا تو ذکر ہی نہیں۔

اب قوم تھی اور اسکے سر پر جادوئے فرنگ! ہر طرف سحر سامری کا دور دورہ ہر سمت سے دجالی تہذیب کا حملہ معیار کمال یہ ٹھہرا کہ انگریزی بولنا آجائے۔ لب لہجہ "صاحب" کا سا ہو جائے۔ ڈگریاں اور امتحانات سرکاری نصیب میں آجائیں۔ اپنی زبان بگاڑ کر بولی جائے! اپنی زبان، اپنے علوم، اپنے یہاں کے کھانے پینے اپنے طرز کے پہننے اور رہنے، اپنی ساری معاشرت، اپنے خاندان، اپنی برادری، یہاں تک کہ اپنے ماں باپ کو بھی شرم آنے لگے، اپنے ہاں کی ایک ایک چیز میں ذلت و حقارت نظر آنے لگی۔ مغز زہر فقط "صاحب" اور "میم صاحب" ٹھہر جائیں۔ اپنے ہاں کی شرم و حیا، حجاب و نقاب اسلئے قابل نفرت کہ میم صاحب کھلے بندوں

دیکھتی دکھائی پھرتی ہیں۔ جن و فرشتہ کا شمار اسلئے اوہام میں کہ ٹل اور اسپنسر انکے قائل نہیں۔ عرش کا وجود اسلئے باطل کہ جغرافیہ کی کتابوں میں اسکا ذکر نہیں۔ وحی، نبوت، توحید، کے بنیادی مسائل اس لئے فرسودہ اور متروک کہ پادری صاحب اپنی گڑھی ہوئی مشرکانہ مسیحیت میں ان پر دلائل عقلی نہ قائم کرسکے۔ داڑھی منڈانا اسلئے واجب کہ "صاحب" منڈاتے ہیں۔ سود جیسی حرام کمائی اسلئے جائز کہ صاحب کے دیس میں شہر شہر بینک کھلے ہوئے ہیں۔ "سرا" ذلیل "ہوٹل" معزز۔ "مختار کار ندہ" حقیر "ایجنٹ" قابل عزت، حکیم، غریب کس مپرسی میں پڑے ہوئے۔ "ڈاکٹر" ہاتھوں ہاتھ لئے جارہے ہیں۔ "گلی ڈنڈا" کے نام سے شرم، کرکٹ، باعث فخر۔ "بھانڈوں کا طائفہ" پستی کی مثال، تھیٹریکل کمپنی اعزاز کا نشان!

غرض عرش سے لیکر فرش تک ذرہ سے لیکر آفتاب تک، علم و عمل، معاشرت اخلاق، عقائد کے دائرہ میں کوئی شئے ایسی نہ تھی جو "صاحب" کے نام کا کلمہ نہ پڑھ رہی ہو۔ ساری فضا اسی مرعوبیت سے معمور، "دانش فرنگ"، "حکمت مغرب"، "عقلائے فرنگ"، "اقبال سرکار"، "دانایان مغرب" وغیرہ خدا جانے کتنے فقرے دور مرعوبیت کی یادگار، علوم متعارفہ کی طرح بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے اور ہماری زبان وادب کا گویا جزو ہوگئے۔ "فرنگی" کا لفظ اس سے قبل ذم و ہجو کا پہلو لئے ہوئے تھا اس "دور فرنگ" میں محل مدح و عظمت میں استعمال ہونے لگا۔

دنیا کی تاریخ میں یہ واقعہ انوکھا نہیں، زبردست جب کمزوروں پر غلبہ پاجاتے ہیں تو یہی ہونے لگتا ہے، ہر چیز انھیں کی عینک سے یہ خود بھی دیکھنے لگتے ہیں اور اب نہ اپنی عقل باقی رہ جاتی ہے نہ اپنی نظر اور تاریخ والوں کا بیان ہے کہ

قوموں کی قسمت میں یہ دستور ازل سے لکھا چلا آ رہا ہے ؎

وفا جفا کی طلبگار ہوتی آئی ہے
ازل سے یوں ہی مرے یار ہوتی آئی ہے

تو یہ تھی وہ فضا جس میں اکبر نے آنکھیں کھولیں، یہ تھا وہ ماحول جس کے اندر انہیں اپنا پیام پہنچانا تھا۔ رسمی شاعر نہ تھے، ہوتے تو پھر کوئی ایسی بات نہ تھی جس طرح اور اُن کے ہمعصر اچھے اچھے خوش فکر زینت مشاعرہ ہو رہے تھے، یہ بھی آراستہ پیراستہ طرحی غزلیں کہتے رہتے یا بے طرح بھی قافیہ پیمائی میں لگے رہتے، لیکن مشکل یہ تھی کہ صاحب نظر تھے۔ ایک خاص دل و دماغ رکھتے تھے، اور ایک خاص مقصد حیات لیکر آئے تھے۔ ایک مخصوص پیام کی تبلیغ کا بار انکے شانہ پر تھا۔ یوں کہئے کہ فطرت کی جانب سے ایک "رسول" بنکر آئے تھے۔ "صاحب کتاب" حقیقی رسولوں کے جانشین اور ادنیٰ خادم۔ دل کڑھا۔ دماغ متاثر ہوا، آنکھوں نے بہت کچھ دیکھ لیا جو دوسروں کی نظر سے اوجھل تھا۔ انکا پیام اس تحریک مغربیت کے خلاف ردِ عمل تھا۔ انکی شاعری اول سے آخر تک اسی مادیت و فرنگیت کا جواب ہے انکے ترکش کا ایک ایک تیر اسی نشانہ پر آکر لگتا ہے۔ انکے فلسفہ، انکی ظرافت، انکی سیاسیات کے دائرہ کی معمولی سی بھی پیمائش ممکن نہیں، تاوقتیکہ نظر اسی مرکزی نقطہ پر نہ جمائی جائے۔

یہ رنگ موجود شروع ہی سے تھا سن و تجربہ میں پختگی کے ساتھ نکھرتا گیا۔ یہانتک کہ آخر میں ہر ساز سے یہی نغمہ پیدا ہونے لگا۔ عورتوں کی بے پردگی سے متعلق انکا مشہور و معروف ضرب المثل قطعہ انکے آخر زمانہ کا نہیں شروع ہی کا ہے اور کلیات سوم میں نہیں کلیات اول میں درج ہے۔

کل بے حجاب آئیں نظر چند بیویاں — اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو انسے آپکا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

"عقل پر پردہ پڑ جانا" اس محاورہ کا استعمال اس حسن و خوبی سے اس سے قبل کبھی کیوں ہوا ہوگا۔

قوم کی انتشاری اور اضطرابی حالت، خود اپنی ہی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہے اسکا نقشہ بھی انکے قلم کا کھینچا ہوا بہت مدت کا ہے ؎

مذہب کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا — چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبرؔ — اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

کلیات سوم میں اصلاح معاشرت ہے۔ تزکیہ اخلاق ہے، شعائر اسلامی کا احیاء ہے۔ تہذیب اسلامی کی تجدید ہے، اور یہ وعظ سطر سطر میں موجود ہے۔ لیکن ہاں وہ حالی کی طرح خشک واعظ نہیں وہ پہلے شاعر ہیں پھر کچھ اور۔ پہلے ظریف ہیں پھر مصلح پہلے نقاش فطرت ہیں پھر معلم اخلاق، انکی مجلس میں شراب کے گلاس گردش میں رہتے ہیں، خوش رنگ، خوش مزہ۔ سخنی کے پیالے تقسیم نہیں ہوتے۔ یہ اس رند پاک باز کی کرامت ہے کہ حلق سے اترتے ہی وہ شراب خانہ خراب نہیں رہ جاتی شراب طہور ثابت ہوتی ہے۔ لا فیھا غول ولا ھم عنھا ینزفون

اکبر سے قبل بنگال کا ایک نامور فرزند بنکم چندر چٹر جی یہی مشن لیکر پیدا ہوا تھا۔ تہذیب جدید کے خطرات کا اس نے پوری طرح اندازہ کر لیا تھا اور

لہ یہ تشبیہ بھی خود حضرت اکبر کی سمجھائی ہوئی ہے کہیں فرما گئے ہیں، افسوس ہے کہ کلیات میں کہیں وہ قطعہ نہ ملا کہ لوگ مجھ اور حالی میں فرق دریافت کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ..... وہ سخنی ہیں میں شراب"

بنگالی زبان میں اُسنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ سے اس سیلاب کے روکنے کی اپنے امکان بھر کوشش کی تھی۔ اردو میں ایک ناول کا ترجمہ درگیش نندنی وغیرہ کے نام سے آچکا ہے۔ بنکم نے اپنا حربہ نثر کی شمشیر عریاں کو رکھا تھا۔ اکبرؔ نے اسکے بجائے نظم کے نشتر کو اختیار کیا۔ بنکم کی تلوار کا کاٹ سب نے دیکھا۔ اکبر کا نشتر عموماً زیر آستیں رہا۔

جدید تہذیب و تمدن کا ایک بہت بڑا مظہر "آزادی نسواں" ہے اسی شاندار لفظ کے عقب میں حقیقت عریانی، بے پردگی، بے حجابی، بے عصمتی کی ہے۔ اکبرؔ کے ترکش کے اکثر تیروں کا ہدف یہی ہے۔

اس تہذیب کا ایک نمایاں کرشمہ یہ ہے کہ جہاں بیوی سے شرم و حیا رخصت ہو چکی ہے، وہاں شوہر سے بھی حمیت و غیرت سلب ہو جاتی ہے۔ اکبر کے نگارخانہ میں یہ مرقع ایک ممتاز مقام پر آویزاں ہے ؂

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں　　حجاب اِنکو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

یورپ کی عدالتوں میں مقدمات طلاق جس افراط سے دائر ہوتے رہتے ہیں اور شہادتوں میں جیسے جیسے حیا سوز واقعات کا انکشاف ہوتا رہتا ہے وہ وہاں کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں اور "صاحب" کے قدموں کے طفیل ہندوستان بھی ان برکتوں سے مستفید ہو چلا ہے۔ اب یہاں بھی ایسے واقعات الشاذ کالمعدوم کے حکم میں نہیں رہے ہیں، لیکن یہاں ابھی احساس حمیت و غیرت بہرحال کچھ نہ کچھ زندہ ہے اسلئے واقعہ ہو چکنے کے بعد حسرتیں بھی ہوتی رہتی ہیں اور ندامتیں بھی۔ یہ کیفیت اکبر کی زبان سے سُنئے ؂

کیا گزری جو اک پردے کے عدو ورو کے پولس سے کہتے تھے
عزت بھی گئی، دولت بھی گئی، بیوی بھی گئی زیور بھی گیا

اس غزل کے چند اور شعر بھی ہیں، درد و عبرت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے کچھ ایسے بے محل اس موقع کے لئے نہیں ہے

اکبر نہ تھما بت خانے میں زحمت بھی ہوئی اور زر بھی گیا
کچھ نام خدا سے انس بھی تھا، کچھ ظلم بتاں سے ڈر بھی گیا

پروانہ کا حال اس محفل میں ہے قابل رشک اے اہل نظر
اک شب ہی میں یہ پیدا بھی ہوا۔ عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

کعبہ سے جو بت نکلے بھی تو کیا، کعبہ ہی گیا جب دل سے نکل
افسوس کہ بت بھی ہم سے چھٹے اور چھوٹ خدا کا گھر بھی گیا

جو گونج رہا تھا خوشیوں سے اس قصر پہ کل میں رویا بہت
کوئی متنفس تھا نہ وہاں، اندر بھی پھرا باہر بھی گیا

آخری شعر میں شاعر جگ بیتی سے زیادہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے۔ اکبر مالی حیثیت سے بھی ایک خاصے بڑے آدمی تھے سیشن ججی سے پنشن لی تھی۔ وطن (الہ آباد) میں عشرت منزل کے نام سے کوٹھی اپنے صاحبزادے کے نام پر بنوائی ایک زمانہ میں وہ واقعی عشرت منزل ہی تھی، دعوتیں، جلسے۔ اسپیچیں، شعر و سخن، چہل پہل، فرنیچر اور سامان آرائش سب ہی کچھ۔ آخر زمانہ میں حالت ٹھیک اسکے برعکس ہو گئی تھی پہلے چہیتی بیوی نے داغ مفارقت دیا پھر نوجوان محبوب بیٹا ہاشم رخصت ہوا۔ جج صاحب کی پنشن ہو چکی تھی۔ آنکھیں خراب ہوئیں۔ عام صحت نے جواب دیا۔

بڑے صاحبزادے پردیس میں ملازم۔ مکان سنسان، پائیں باغ ویران، سامان آرائش غائب۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا۔ ہو کا عالم، ایک حضرت اکبر خود، ایک یا ڈیڑھ مرد ملازم، ایک بوڑھی ماما، بس کل اتنی آبادی!

خیر یہ ایک جملہ معترضہ آگیا تھا۔ اب پھر پہلے شعر کیا گزری جو...الخ کو دہرا کر آگے چلئے۔ ایک جگہ بے پردگی اور تعلیم نسواں کو لازم وملزوم بتاتے ہیں اور مختلف مفہوموں (پردہ "اُٹھنے" اور تعظیم کے لئے اُٹھنے) کیلئے لفظ "اُٹھنے" کے اشتراک سے پورا شاعرانہ فائدہ اُٹھاتے ہیں ؎

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو   پردہ اُٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

تخیل ہے تو بڑا شاعرانہ لیکن اس واقعیت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے کہ پردہ شکنی کی حمایت میں بڑی سے بڑی دلیل ہے بھی یہی کہ پردہ کی چار دیواری کے اندر رہ کر علم کی تازہ ہوا نصیب ہونا ممکن کہاں؟ اور علم وتعلیم کے جو معنی اس گروہ کے ذہن میں ہیں، انکے لحاظ سے یہ قول بیجا نہیں۔

ہمارے یہاں بہترین عورت کا تخیل یہ تھا کہ شروع سے دبی لجی رہے۔ خانہ داری کے طور طریقے سیکھے کہ آگے چلکر اُسے گھر کی ملکہ بننا ہے۔ بچپن میں والدین کی اطاعت اور شادی کے بعد شوہر کی رضامندی کو پروانۂ جنت خیال کرے۔ خانگی شیرازہ اسکی ذات سے بندھا ہوا رہے۔ خاندان کی مسرتیں اسکے دم سے قائم رہیں۔ صحیح معنی میں "اہل خانہ" ثابت ہو۔ اولاد کو تربیت کے بہترین راستہ پر ڈال سکے۔ شوہر کی عزت ومحبت، بڑوں کی تعظیم وخدمت گزاری، اور چھوٹوں کی الفت وشفقت کے جذبات لیکر دنیا میں آنکھ کھولے اور انہی جذبات سے بھرپور

دنیا سے رخصت ہو۔ فرنگیوں کے یہاں عورت کی عزت کا معیار ہی کچھ دوسرا ہے۔ انکے نزدیک عورت کا یہ مشرقی تخیل عورت کیلئے باعث توہین ہے۔ موجب تحقیر ہے۔ انکی فرہنگ میں ادب و تعظیم، اطاعت و خدمتگذاری، مرادف ہیں محکومی اور غلامی کے۔ انکا قول ہو کہ عورت اپنے کو چھپانے کیلئے نہیں، دکھانے کیلئے آئی ہے۔ اُسکا کام یہ نہیں ہو کہ جب دیکھئے گھر ہی کے اندر، شوہر کے یا ساس نند کے پہلو سے لگی بیٹھی ہو۔ وہ عورت ہی کیا جسکے حسن گفتار، حسن رفتار، حسن صورت، زیب و زینت، خوش لباسی، گلے بازی، رقاصی، کے چرچے "سوسائٹی" میں عام نہوں؟ اخبارات میں اس کے فوٹو شائع ہوں۔ زبانوں پر جب اسکا نام آئے تو لذت پیدا کردے۔ اسکا جلوہ آنکھوں میں چمک پیدا کردے اور اسکا تصور دلوں میں شوق۔ بہترین عورت وہ نہیں جو بہترین بیوی ہو یا بہترین ماں، بلکہ وہ ہو جسکی ذات دوست احباب کی خوش وقتیوں کا دلچسپ ترین ذریعہ ہو، اور ایسی ہو کہ اسکی رعنائی و دلربائی کے نقش ثبت ہوں۔ کلب کے در و دیوار پر، پارک کے سبزہ زار پر، اور ہوٹل کے کوچ اور صوفوں پر۔

"ہمارے" اور "انکے" تخیل کے اس بعد المشرقین کو اقلیم لفظ و معنی کا یہ تاجدار دو لفظوں میں جس جامعیت اور جس بلاغت کیساتھ بیان کرجاتا ہے، یہ اسیکا حصہ تھا۔

جاذبہ چمکی نہ تھی، انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

"چمکی" میں وہ بے پناہ بلاغت ہو کہ سننے والا لوٹ لوٹ جائے۔ یہ "چمک" مخصوص ہے "نئی روشنی" کی چمنیوں کے ساتھ۔ پرانے فانوسوں میں، ڈیوٹ والے چراغوں میں چمک سادنگ بھلا کہاں! شرم و حیا سے آزادی، دنیا کی دلستانی کیلئے ناز و انداز،

قابلیت کے جوہر کی جلا سب کچھ اس ننھے سے لفظ "چمکی" سے ظاہر و آشکارا اور "شمع انجمن" اور "چراغ خانہ" کی مثال کسقدر روشن کیسی ضیا بار! ــــ تشبیہ کی تشبیہ اور پھبتی کی پھبتی۔ شعر کیا ہے بیسویں صدی کی "کالج گرل" کی قد آدم تصویر۔

حسن و ناز کی دنیا میں قابل داد ابتک کم سخنی، کم گوئی، بے زبانی تھی۔ مشرقی شوہر "چاند سی دلہن" بیاہ کر اس لئے لاتا تھا کہ وہ اُسے اپنے اندھیرے گھر کا چراغ بنائیے اور تخیل "خانہ آبادی" کا غالب رہتا۔ اب جو جا کر دیکھتے ہیں تو محفل کے طور ہی کچھ اور ہیں نقشہ بدلا ہوا ہے۔ ٹھاٹھ بزم آرائیوں کے جمے ہوئے، حجاب کی جگہ بیحجابی، سکوت کی جگہ طوفان تکلم مستوری کی جگہ نمایش۔ عاشق بیچارہ اس کایا پلٹ پر دنگ، حیران، گم صم، کل تک جو نقش تصویر تھا، وہ آج گراموفون کی طرح مسلسل و نفت تکلم۔

خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق	اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں اسپیچ کا شوق
شان سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں	بُت جو تھے دَیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

چوتھا مصرعہ اپنی لطافت، بلاغت، جامعیت کے لحاظ سے اپنا جواب آپ۔ تیسرا مصرعہ اس پہلو کی جانب رہنمائی کر رہا ہے کہ جو کچھ ہوا ہے قدرتی نتیجہ ہے تغیر ماحول کا جب فضا میں آسائش کی جگہ آرائش نے لے لی۔ راحت پر لذت مقدم ہوگئی۔ مردوں کا مطمح نظر بجائے تسکین قلب کے ہیجان نفس قرار پا گیا، تو قدرۃً عورتوں نے بھی اب محبوبیت کے انداز بدل دیئے مردوں کے دل میں جگہ پانے کے طریقے بھی دوسرے ہو گئے۔

اکبر کے اسی مرقع کا ایک اور منظر:

اعزاز بڑھ گیا ہے، آرام گھٹ گیا ہے	خدمت میں ہے وہ لیزی[۱] اور ناچنے کو ریڈی[۲]

---

[۱] LAZY سست کاہل۔ [۲] READY آمادہ، تیار، مستعد۔

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی با لآخر — شوہر پرست بیوی، پبلک پسند لیڈی

"شوہر پرست بیوی" اور "پبلک پسند لیڈی" ان دو لفظوں کے کوزہ میں کیسا مشرق ومغرب کے سمندر کو سمو دیا ہے۔ مشرق کا منتہائے نظر تو خدمت تھا "زچہ خانہ تھا" اور باورچی خانہ، تھا۔ مغرب کے ہاں منتہائے نظر مساوات اور "نمائش" ہے "بال روم، اور "کنسرٹ، ہے اور عورت غریب کرے بھی کیا۔ نظام تعلیم بنا ہی اسی ڈھنگ کا ہے شروع سے سکھایا ہی جاتا، دل میں بٹھایا ہی جاتا ہے۔

آج یورپ وامریکہ کے بڑے بڑے ماہرین نفسیات (سائیکالوجی) و حیاتیات بشری (ہیومن بیالوجی) کہہ رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں کہ دونوں صنفوں کے درمیان کشش جنسی بالکل طبعی ہے، دونوں جب باہم ملیں گے اور کوئی مانع موجود ہوگا نہیں تو رگڑ سے بجلی کا اکبارگی پیدا ہو جانا بالکل قدرتی ہے۔ شریعت اسلامی نے اس گہری اور بنیادی حقیقت کے پیش نظر، بدکاری کے نفس عمل ہی کو حرام نہیں قرار دیا، بلکہ اس منزل تک پہنچنے کی جتنی راہیں ہیں ان پر بھی پہرے بٹھا دیئے ہیں۔ گویا دشمن کی پوری "ناکہ بندی" کردی۔ بانس ہی نہ ملیگا تو بانسری کہاں سے بجے گی۔ بیگانہ عورت ومرد کو اختلاط کے جب موقع ہی نہ ملیں گے تو پینگ بڑھنے ہی کیسے پائیں گے۔ بالکل بچپن کو چھوڑ کر باقی آگے بڑھکر مشترک پڑھنا لکھنا ممنوع، مشترک کھیل کود ناجائز۔ بلا ضرورت یکجائی پر حکم امتناعی، تاک جھانک حرام۔ تاکہ سوسائٹی میں مفاسد کا زہر سرے سے پھیلنے ہی نہ پائے، معاشرت ہمیشہ بے داغ رہے۔ تعلیم جدید نے اور تہذیب جدید نے انہیں سے ایک ایک بند کو توڑا۔ نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا تھا۔ آزادیاں بڑھیں، بے حیائیاں آئیں۔ بے حجابیاں دلیل ترقی بنیں۔ جو باتیں کل تک ان ہونی تھیں آج گزر کر رہیں۔

بھولے بھالے لوگوں نے کہا کہ "محافظ عصمت خود یہ تعلیم ہو گی نہ" سبحان اللہ! زنگی کا نام اگر کافور رکھ دیا گیا تو گویا چہرہ کی سیاہی بھی دور ہو جائے گی؟ توقع لٹیروں سے پہرہ داروں کے کام کی کی جانے لگی! ـــــ اب تو خیر مثالیں بھی کوئی کہاں تک گن سکتا ہے لیکن اکبر کے زمانہ میں بھی فرانس کی میڈیم ڈی اسٹیل[۱] اور انگلستان کی جارج ایلیٹ[۲] کی سی ہستیاں خال خال نہ تھیں۔

اکبر کے توسط سے ایک مختصر سا مکالمہ ایک صاحب اور ایک صاحبہ کے درمیان سنئیے:

میں بھی گریجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ ۔۔۔ علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آکے لیٹ
دونوں نے پاس کر لیے ہیں سخت امتحان ۔۔۔ ممکن نہیں کہ اب ہو کوئی ہم سے بدگماں
بولی یہ سچ ہے، علم بڑھا اور جہل گھٹ گیا ۔۔۔ لیکن یہ کیا خبر ہے کہ شیطان ہٹ گیا

یہ سب سچ لیکن پھر بھی یہ کہتے اور سوچتے ہیں کہ حیا و حجاب کے قیود و احکام تو مسلمان عورت کیلئے ہیں جب دین ہی سر سے غائب ہو گیا تو اب اس اخلاقی جکڑ بند سے آخر حاصل کیا؟ پردہ تو بقائے ناموس کیلئے ہے، جب ناموس ہی نہیں تو اسکی بقا کیسی؟ کھانا پینا زندہ جسم کی ضرورت کیلئے ہے۔ لیکن جب زندگی ہی رخصت ہو چکی تو مردے کو کوئی نہیں کھلاتا پلاتا۔ صندوق میں اسوقت تک قفل پڑے رہتے ہیں جبتک اسمیں قیمتی مال محفوظ ہے۔ لیکن صندوق جب خالی ہو گیا تو اسکی حفاظت خود ایک دردسر ہے۔ پھولوں کی قدر جب ہی تک ہے جبتک وہ تازہ و شاداب ہیں۔ باسی، سوکھے، مرجھائے ہوئے پھولوں کو گلے کا ہار بنانا کوئی کیوں پسند کرنے

---

۱ فرانس کی مشہور ادیبہ۔ اخلاق و عصمت کے قانون سے آزاد ۲ انگلستان کی مشہور ناول نویس، مردانہ نام رکھنے والی خاتون۔ ایک اہل قلم مرد، جارج ہنری لوئیس کے ساتھ مدتوں بے نکاحی بیوی کی طرح بسر کی۔

لگا۔ فرماتے ہیں ؎

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید — بے حجابی جو ہوا سمیں تو قباحت کیا ہے
نور اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ — شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

چوتھے مصرعہ کی تشبیہ اکبر ہی کا حصہ ہے۔

خاتون مشرق کو مغربی میم بنا دینے کا اب نتیجہ کیا نکلا ہے! خود مردوں ہی نے شیکسپیر اور ملٹن کی ورق گردانی اور مل و اسپنسر پر دماغ سوزی کر کے ابتک دنیا بلکہ ہندوستان ہی کی محدود دنیا میں کون سے امتیازات حاصل کر لئے ؎

شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا عیب و کمال — کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

خیر یہاں ذکر مردوں کی نہیں عورتوں کی تعلیم کا ہے۔ مرد جس طرح پڑھ پڑھ کر "صاحب" کے بیرے بنتے گئے "صاحبیت" میں ضم ہوتے گئے، اپنوں کے ہاتھ سے نکلتے گئے۔ اسی طرح عورتیں بھی پڑھ پڑھ کر "میم صاحبیت" میں گم ہوتی گئیں۔ ہاتھ سے نکلتی گئیں، کلیات اول میں انکا قدیم ترین کلام ہے اس حقیقت کو اسمہ دور کی ظرافت کی کشتی میں لگا کر پیش کرتے ہیں ؎

ترقی کی نئی راہیں ہم پہ جو چڑھا گئیں — گھٹا کی دولت اپیچیں بڑھا گئیں
رہیں بھر بھر کے آیا بی نصیبن! — وہ گو اسکول میں بہمول پڑھا گئیں

کلیات سوم میں اس مرقع میں آب و رنگ ذرا اور زیادہ بھر دیتے ہیں ؎

اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو سنوارا — اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
کچھ جوڑ تو انہیں کے ہوئے بال میں رقصاں — باقی جو تھے گھر انکا تھا افلاس کا مارا
بیرا وہ بنا کمپ میں، یہ بن گئیں آیا — بی بی نہ رہیں جب تو میاں بن گئے ہمارا

دونوں جو کبھی ملتے ہیں گاتے ہیں یہ مصرعہ — آغاز سے بدتر ہے سرانجام ہمارا

خیال نہ گزرے کہ اکبر سرے سے تعلیم نسواں کے مخالف تھے اور لڑکیوں کے بالکل ہی ناخواندہ رکھنے کے حامی۔ وہ تعلیم نسواں کے حامی و ہمدرد اپنی جگہ پر تھے لیکن تعلیم تعلیم میں بھی تو زمین آسمان کا فرق ہے وہ تائید میں اس تعلیم کے تھے جو قوم نمونہ رابعہ بصریہ کے نہ سہی دور مغلیہ کی جہاں آرا بیگم کے پیدا کرے، نہ اس تعلیم کے جو زینت ہو ہر آپیرا ہاؤس کی، ہر تھیٹر پیلس کی، اس تعلیم کو وہ رحمت نہیں خدا کا قہر سمجھتے تھے جس پر بنیادیں تعمیر ہوں ہالی وڈ[1] کی وہ آرزومند تھے اس نظام تعلیم کے

[1] HOLLYWOOD امریکہ کا مشہور شہر، فلمی دنیا کا کہنا چاہیئے کہ دارالسلطنت۔ ہزارہا کی آبادی روزانہ فلمسازی کی مختلف شاخوں، محکموں میں سرگرم۔

[2] سنہ ۱۹۱۳ء کے آخر کا ذکر ہے کہ ایک برطانوی "مس صاحبہ" ماڈ ایلن (MAUDALLEN) نامی مشہور آرٹسٹ ہندوستان تشریف لائیں بڑی دھوم دھام کیساتھ انگریزی اخبارات روز ہی انکے تذکروں اور کارناموں سے بھرے رہتے تھے۔ آپکا آرٹ "ناچ" تھا ایک خاص ناچ کے وقت جسم پر ہلکا سا لباس جھل جھل کرتا ہوا۔ غالباً موتیوں کی لڑیوں کا رہتا تھا۔ یہ نیم برہنگی تو خیر شروع ہی سے رہتی تھی۔ رقص جب شباب پر پہونچتا تو گردش اس تیزی سے کرتیں کہ گویا جسم نہیں کوئی مشین ہے جس میں کمانی لگی ہوئی ہے۔ لباس کی لڑیاں ایک ایک کرکے ہوا میں اڑنے لگتیں، یہانتک کہ جسم پر ایک تار بھی باقی نہ رہ جاتا اور مس صاحبہ برہنہ مادرزاد ہوجاتیں۔ گو یہ ضرور ہے کہ گردش رقص اس مسلسل تیزی کے ساتھ ہوتی کہ دیکھنے والے کی نظر کا جمنا ناممکن تھا اور یہی اسکے آرٹ کا کمال تھا۔ حضرت اکبر نے اپنے ایک مکتوب میں مجھے تحریر فرمایا کہ "مس ماڈ ایلن آئی ہوئی ہیں سنا ہے کہ برہنہ ہوکر اس طرح ناچتی ہیں کہ شائقین سائنس کو وجد آجاتا ہے"۔ یہ ذکر دسمبر سنہ ۱۹۱۳ء کا ہے اسوقت تک یہ کمالات بہرحال بعض پیشہ ور بیسواؤں ہی تک محدود تھے۔ اور اب؟ — حدیث نبوی میں جو الکاسیات العاریات آیا ہے، یعنی عورتیں لباس پوش مگر برہنہ، اسکی صحیح تفسیر اس دور سے قبل کیونکر کسی کی سمجھ میں آسکتی تھی!

کے جو مہربان مائیں وفا سرشت بیویاں، اطاعت شعار لڑکیاں پیدا کرے۔ نہ اسکے جو تھیٹر میں ایکٹری اور برہنہ رقاصی کے کمالات کی جانب لے جائے۔ وہ ملک میں حوریں پیدا کرنا چاہتے تھے کہ دنیا نمونہ جنت بن جائے۔ پریوں کے مشتاق نہ تھے کہ ملک کا ملک راجہ اندر کا اکھاڑا ہو کر رہ جائے انکا قول تھا ؎

دو شوہر و اطفال کی خاطر اُسے تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

مزید توضیح سُنئے ؎

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہوں

ذی علم و متقی ہوں، جو ہوں انکے منتظم
استاد ایسے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

(استاد جی محاورہ لکھنؤ میں ارباب نشاط کے "تعلیم" دینے والوں کو کہتے ہیں، خود لفظ "تعلیم" لکھنؤ کی زبان میں ایک خاص معنی میں مستعمل ہے)، ایک طویل نظم میں اپنا پورا مسلک وضاحت کیساتھ بیان کر دیا ہے (صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۲) چند شعروں سے اندازہ کیجیے ؎

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو وہ بے شعور ہے

ایسی معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اسمیں والدین کا بیشک قصور ہے

لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت
جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت

آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت
ہو وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت

ہر چند ہو علوم ضروری کی عالمہ
شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ

عصیاں سے محترز ہو۔ خدا سے ڈرا کرے
اور حسن عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے

آگے حساب کتاب، نوشت و خواند، اصول حفظ صحت، کھانا پکانے، کپڑے سینے وغیرہ

کو درسِ نسوانی کا لازمی نصاب بتا کر فرماتے ہیں۔ اور ہاں خیال میں رہے کہ اس نظم کی محرک اور مخاطب ایک غیر مسلم خاتون تھیں[۱]

داتا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر میں دیوی بنی رہو

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

دنیا میں لذتیں ہیں نمائش ہے شان ہے
انکی طلب میں حرص میں سارا جہان ہے

اکبر سے یہ سنو کہ جو اسکا بیان ہے
دنیا کی زندگی فقط ایک امتحان ہے

حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اسکا عمل خراب
آج اسکا خوشنما ہے مگر ہوگا کل خراب

عجب دقیانوسی خیال کے تھے آخر تک "آج اور کل" کے چکر میں پڑے رہے۔ "آج" تو خیر آج ہی ہے "یہ کل" آخر کیا بلا ہے! خواہ مخواہ عیش کو منغص کر دینے والا! فرماتے جاتے سب کچھ تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانے ہوئے سمجھے ہوئے تھے کہ رفتار زمانہ کا رخ پھیرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، انبیاء تک کو یہ قدرت نہیں مشیت تکوینی ہر صورت میں اپنا چکر، اپنا دورہ پورا کر کے رہتی ہے۔ ابراہیمؑ و موسیٰؑ کی نصیحت کس نے سنی؟ یحییٰؑ و عیسیٰؑ پر کتنے ایمان لائے؟ یونسؑ و لوطؑ کی تصدیق کتنوں نے کی، بے چارے ہر دور میں طعنے ہی سنا گئے شاعر ہونے، ساحر ہونے، مجنون ہونے کے۔ آج کی اصطلاح میں VISIONARY۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد ہی عذاب الٰہی کے زلزلہ نے یک بیک دھر پکڑا، اور سارا نظام تہذیب و تمدن کی بنیادیں تک ہلا ڈالیں زار روس کی جبارت و شہنشاہیت مطلقہ کا چشم زدن میں مٹ کر رہنا، اس غیبی گرفت کی تازہ جدید مثال ہے اور پھر اس سے

---

[۱] ۱۹۱۷ء میں۔

بھی بڑھ چڑھ کر یورپ کی پہلی مہا بھارت اور یہ دوسری مہا بھارت ان سطروں کی تحریر کے وقت تک نا تمام و غیر مختتم ہے۔[1]

حضرت اکبر بھی اپنے مشن کی کامیابی سے مایوس تھے اور بارہا اسکا اظہار فرمایا ہے۔ کلیات دوم ایک قطعہ میں آزادی نسواں کے مستقبل کا مرقع کھینچتے ہیں۔ حسب معمول دلکش فرماتے ہیں کہ ضبط نفس اور تقویٰ و ایمان رکھنے والے تو گزر گئے اب دور دورہ ہے "صاحب" کے قائم کئے ہوئے کالج کے نوجوانوں کا ؎

اٹھ گئے وہ جنھیں مقدور تھا خودداری کا
نہ وہ تقویٰ نہ وہ تعلیم نہ وہ دل کی امید

ولولہ لے کے نکلنے لگے کالج سے جوان
شرم مشرق کے عدو، شیوۂ مغرب کے شہید

کرکٹ فیلڈ انکی مسجد، تھیٹر انکی عیدگاہ۔ اس تمدن کے لازمی نتیجہ کے طور پر ؎

بحث میں آہی گیا فلسفۂ شرم و حجاب
دور گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید

عورتوں کو "حقوق" سیاسی حقوق مل گئے "مطالبات" منظور ہو گئے؛ کام وہ مردوں کے دوش بدوش کرنے لگیں ؏

زہرہ ممبر ہوئیں ووٹر تھیں جناب خورشید

کچھ پرانے بڈھے ٹھڈے زندہ تھے، ڈرے ہوئے سہمے ہوئے، تو لے کہ گل کھلانے کیلئے صاحبزادے کچھ کم تھے، جواب صاحبزادیوں کو بھی اس میدان میں لایا جا رہا ہے ؎

شیخ صاحب ہی کا ہی بزم میں کیا رعب و قار
کہ خواتین کو سیلاب میں ہو وقعت کی امید

روشن خیال دنیا کی لعنتوں، متمدن دنیا کی ملامتوں کی بجلیاں ان دقیانوسیوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر گریں ؏

---

[1] زمانۂ تحریر ۱۹۴۵ء

نعرۂ تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند

اور تو اور گھر گھرانوں کی کنواریاں، المومنات الغافلات نہیں شوخ و بیباک کھیلی کھائی ہوئی ؎

لڑکیاں بول اٹھیں خود بہ طریق تائید

دولھا بھائی کی یہ ہے رائے نہایت عمدہ — ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اور شعر تو یہ ہوا ہے، بیت الغزل، سارے قطعہ کی جان ؎

خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دیئے دیتے ہیں — ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

شیخ بیچارہ اس حملہ کی تاب کہاں سہہ لاتا، بھاگ کر حجرہ میں پناہ لی، کنڈی اندر سے چڑھا لی ؎

اکبر افسردہ شد از گرمیٔ ایں طرز سخن — شیخ بگریخت و در صومعہ خویش خزید

تجدد کی جے تالیوں کی گونج میں پکاری گئی اور آدمؑ کے بیٹوں اور حواؑ کی بیٹیوں دونوں نے ملکر حصول آزادی کی مبارکباد منائی ؎

کھل گیا، ورنہ رہا شاہد مشرق کو حجاب — غل مچا ہر طرف کا بول اٹھے یہ مغرب کے مرید

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست — آخر آمد ز پس پردہ تقدیر پدید

ایک پرانی غزل میں بھی مضمون اس آزادی نسواں کا آگیا ہے ؎

بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کبتک — بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کبتک

جو منہ دکھائی کی رسم پہ ہے مصر ابلیس — تو منہ چھپائیں گی حوا کی بیٹیاں کبتک

مقطع میں انجام کی پیشین گوئی ہے ؎

سنا ہے حضرت اکبر ہیں حامی پردہ — مگر وہ کبتک اور انکی رباعیاں کبتک

اسلامی نظام تہذیب کے جوہر لطیف یہی عصمت، عفت، شرم و حیا کے جذبات ہیں، اور فرنگیت کی زد بھی سب سے پہلے اخلاق کے انہی ستونوں پر پڑتی ہے۔ اسلئے قدرتاً اکبر نے بھی طبع آزمائی اس موضوع پر بہت زائد کی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی مغربیت و فرنگیت کے جو نمایاں مظاہر ہیں انھوں نے تقریباً ان سبھی پر کم و بیش توجہ کی ہے، عبرت پذیری انکے قلب کا، اور عبرت آموزی ان کے قلم کا جوہر ہے، اس ایک قوت کے سہارے ہر تختۂ زمین میں نئے نئے شگوفے کھلاتے ہیں اور یہ کھیتیاں کو لالہ زار بنائے چلے جاتے ہیں، کمیٹی سازی اور جلسہ بازی کے مشغلوں میں پڑکر دین کی طلب اور روح کے تعلق کے ضعف کا عکس ذرا اکبر کے جام جم میں ملاحظہ ہو:

نفس کو تو انھیں باتوں میں مزا آتا ہے
جن میں ہر گام پہ اک دام بلا ہے درپیش

ممبر اٹھ جاتے ہیں جب ذکر خدا آتا ہے
اس کمیٹی میں نہیں روح کی لذت کا خیال

خالص دوستی، بے غرضانہ محبت، کے لفظ سیاسیات حال کی لغت میں بے معنیٰ ہیں۔ ہندو اگر اتحاد کا ہاتھ مسلمان کی طرف بڑھا رہا ہے تو صرف اسلئے کہ دونوں ملکر انگریز سے مقابلہ کریں۔ انگلستان اگر روس سے لگاوٹ کر رہا ہے تو محض اس غرض سے کہ جرمنی سے لڑنے کے لئے ایک زبردست حلیف ہاتھ آجائے۔ خود مطلبی کا نام مہذبوں کی اصطلاح میں ڈپلومیسی ہے، دل سے نہ یہ انکا شریک نہ وہ انکا۔ دلوں میں زہر کے انگارے بھرے، لبوں پر میٹھے بول۔ اسلام کے شاعر کو عبرت کا یہ منظر دیکھ کر اپنے یہاں کا کھولا اور بھلایا ہوا سبق الحب للہ والبغض للہ کا یاد آجاتا ہے اور اسکے منہ سے نالہ موزوں نکلتا ہے۔

جسکا تو حاسد ہے اسکا جو ہو حاسد، تیرا یار
اب تو یاری کا اسی پر رہ گیا ہے انحصار

اب تو ہر اک ہے جدا اور اک جدا درگاہ کا
جنگ جبتک تھی تو ان سے نام تھا اللہ کا

واسطے اللہ کے ہو دوستی اب وہ کہاں

چند روزہ متفق ہوں ورنہ یہ شیخ و ہنود — ہال تجارت اور پالٹکس میں دیکھیں جو سود

واسطے اللہ کے ہو دوستی اب وہ کہاں

۱۹۱۰ء کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے اخباری میدانوں میں بحث طریقت و شریعت کے درمیان چھڑ گئی۔ شریعت کا جھنڈا لاہور میں دفتر زمیندار سے بلند ہوا طریقت والوں نے جوار دہلی کی ایک درگاہ میں پناہ لے ہیں سو ضربیں لگانا شروع کیں۔ اور جب دیکھا کہ حریف کی گستاخیاں بڑھتی ہی جارہی ہیں تو جھٹ حکومت سے فریاد نقض امن عامہ کے نام پر کردی۔ اکبر نے عین اسوقت جبکہ اشتعال جذبات کا شباب تھا مصلحت شناسی و مصلحت جوئی کے چھینٹے ڈالنے شروع کیے۔ آگ اپنے وقت پر بہرحال بجھتی ہی ہے اور مدت ہوئی کہ اب اسکی خاکستر بھی باقی نہیں، البتہ اکبر کے چشمۂ اصلاح کے وہ قطرے یادگار رہ گئے جو کبھی انشاءاللہ خشک نہ ہونگے۔ پوری نظم ذرا طویل ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو

اسوقت مولویت صوفیت سے بگڑ گئی ہے — اغیار کو ہو مژدہ آپس میں چھڑ گئی ہے
ملّا کو زعم ہے یہ دانم چرا نہ گویم — صوفی کو یہ کہ دارم پائے چرا نہ پویم
ملّا یہ کہہ رہے ہیں قرآن ہی بس پڑھئے — صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑھئے
کہتے ہیں کر رہے ہیں باہم یہ رفارمیشن — دیکھا نہیں تھا لیکن مُردوں پر آپریشن
اسوقت کیا تمھاری یہ خوش خیالیاں ہیں — آپس کی گالیاں ہیں غیروں کی تالیاں ہیں
شیعہ ہوں خواہ سنی، ملّا ہوں خواہ صوفی — بے سود جنگ باہم ہے سخت بے وقوفی
دیکھو ذرا تنزل خود ہی زور پر ہے — موقوف کب یہ حالت آپس کے شور پر ہے
وقت نزاع باہم ہرگز نہیں ہے یارو — اللہ کو پکارو، اللہ کو پکارو

سب سے گہرا دام لفظ "ترقی" کا ہے۔ مغرب کا ہر عیب آج ہماری نظر میں ہنر ہے اسکی ہر بدروئی ہماری نگاہ میں حسن ہے۔ اگر ہم عیب کو عیب ہی سمجھ لیں جب ہی کوئی صورت تو اس سے بچنے کی بھی نکالیں، سوچیں، لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ معائب کو مناقب، نقائص کو کمالات سمجھ رہے ہیں اور زہر کو تریاق کے درجہ میں رکھ رہے ہیں۔ "ترقی" "تہذیب" "شائستگی" "ارتقا" "روشن خیالی" وغیرہ چند الفاظ کان میں پڑ گئے ہیں، الٹ پلٹ کر یہی ہماری زبان پر آرہے ہیں۔ یہی ہمارے دلوں میں بسے ہوئے ہیں۔ شوق انہی مقصدوں کی تکمیل کا دلا دیجئے فرشتوں کے روایتی معلم کی ذہانت کی، شکار کو پھانسنے کے لئے کیا افسوں کان میں پھونک گیا ہے ؎

شیطان نے ترکیب تنزل یہ نکالی ان لوگوں کو تم شوق ترقی کا دلا دو

شکاریوں کا بیان ہے کہ جب شیر کا شکار منظور ہوتا ہے تو درختوں میں بھینسے باندھ دیئے جاتے ہیں شیر انکی خوشبو پاکر، اُنھیں نوش جاں کرنے جلدی جلدی لپکتا ہوا جھپٹتا ہوا آتا ہے اور شکار کرنے کے عوض خود ہی شکار ہو جاتا ہے۔ شاعر اس تشبیہ کو بھی اپنے کام میں لاتا ہے ؎

شیران شرق کا انھیں منظور ہے شکار بھینسے بندھے ہوئے ہیں ترقی کے شوق کے

ہم حقوق سیاسی کی توسیع پر مسرور ہیں اور خوش ہو رہے ہیں کہ اب ہمارے نمائندے اتنوں کے بجائے اتنے ہو گئے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس طرز انتخاب نے خود ہماری جماعت کے اندر کیسی پھوٹ پیدا کر دی ہے۔ باہمی رشک و حسد بدگمانیاں و نفسانیت خود غرضی و نااتفاقی میں کتنی ترقی دیدی اور طرح طرح کے ناجائز لالچوں ترغیبوں کا دامن ہمارے نفس کیلئے کتنا وسیع کر دیا ہے عذاب عقبیٰ کو چھوڑیئے یہ عذاب دنیوی آخر ہاتھوں ہاتھ لیا ہوا ہے کچھ کم ہے؟

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے ـــ خدا کی مار سے ووٹوں کی مار کم کیا ہے

یہی راگ ایک دوسری دھن میں سُنئے ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا ـــ اچھے اچھے ہیں ووٹ کے شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ ـــ سمجھیں اسکو فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی ـــ سلف گورنمنٹ آگے آئی
پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر کی[1] ـــ ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی

اس جدید نظامِ اخلاق کو تعلق نہ والدین کی خدمت و تعظیم سے نہ بزرگوں کی بزرگداشت سے نہ اللہ اور رسول کے احکام حقوق سے فضا ہی ایسی تیار ہو گئی ہے ماحول ہی ایسا بن گیا ہے ؎

باپ ماں سے شیخ سے اللہ سے کیا انکو کام ـــ ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے

یہ شاعری نہیں حقیقت کی ترجمانی ہے ؎

آخرت کا خیال جانے دیجئے یہ ارشاد ہو کہ تہذیب جدید نے اس دنیا کی زیست کی سہولتیں کہاں تک پیدا کیں، جینا آسان کر دیا ہے یا اور مشکل؟ جنگ، ہلاکت، غارتگری سفاکی، کے وہ حیرت انگیز آلات و وسائل جو چنگیز و ہلاکو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے کسکے ایجاد کیے ہوئے ہیں؟ موٹر، موٹر سائیکل، ریل، لاری، ٹریم کے روزانہ ناگہانی حادثوں نے ہر بڑے اور متمدن شہر میں موت و ہلاکت کا اوسط کچھ گھٹا دیا ہے یا اور بڑھا دیا ہے؟ روزمرہ کی ضروریاتِ زندگی کی اس کمیابی (اور اب تو نوبت نایابی تک پہنچ چکی ہے) کی کوئی مثال پچھلی تاریخ میں ملے گی؟ ملوں کی بھرمار، مشینوں کی افراط، انجنوں کی ریل پیل، مل کے مزدوروں کی آبادی کی گنجانی، ہر وقت کی گھڑگھڑاہٹ، ہر گھڑی کے شور و ہنگامہ

---

[1] لفظ "سر" کا تلفظ لکھنؤ اور دہلی کی بول چال میں "سِر" (بالکسر) ہے نہ کہ سَر (بالفتح)۔

دم بدم کے دھوئیں نے بڑے بڑے متمدن شہروں کی صحت کا کیا حال کر دیا ہے۔ بڑے بڑے شہروں کے شہریوں میں فیصدی کتنوں کے دانت درست ہیں؟ معدے ٹھیک ہیں؟ آنکھیں عینک سے بے نیاز ہیں۔ جو سکون قلب آسائش و راحت تمدن بیگانہ دیہاتیوں کو حاصل ہے اسکا کوئی حصہ کبھی تمدن جدید کے پر آشوب ہنگامہ پرور ہیجان آفریں مرکزوں میں رہنے والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اس قسم کے سوالات کا حل اکبر کی ترجمان حقیقت زبان یوں پیش کرتی ہے ؎

تہذیب تو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبر — دنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے
نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت سے مل کے دیکھو — کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گذر رہی ہے
دل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردد — کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

سنتے آئے ہیں کہ ہر درد کی دوا علم ہے۔ خاک سے پاک کرنا علم کا کام ہے۔ محتاج کو غنی کرنا علم کا فیض ہے۔ بیمار کو تندرست کرنا علم کی مسیحائی ہے کہیں اور کبھی بیشک یہی ہوتا ہوگا لیکن اپنے نصیب کو کیا کہکر روئیے کہ یہی تریاق زہر بن گیا ہے ہمیں سابقہ جس علم سے اس دور میں پڑا ہے وہی تو امراض کا مورث ہے۔ مفاسد کی اصل اور بدبختیوں کا منبع۔ جسے شربت کا نام دیا گیا وہی جام زہر نکلا۔ جسے رہبر کہکر پکارا گیا وہ رہزن ثابت ہوا۔ جس نظام کو ہم نے "علم و تعلیم" کا نام دے رکھا ہے وہی تو عین جہالت ہے۔ یہ تو عین وہی "علم" ہے جس کا مقصود دلوں میں حب دنیا کو اور پختہ اور راسخ کرنا ہے۔ خیال عقبیٰ و آخرت کے لئے اس تعلیم کے نصاب میں کوئی جگہ نہیں، نصابی تعلیم کا فلسفہ خدا اور رسول کے اعتقاد سے نا آشنا، اسکا سائنس سطح مادیات کے اوپر کچھ دیکھنے سے اندھا۔ اسکی حکمت میں جنت و دوزخ، حور و ملک کا وجود عنقا۔ اس پڑھائی لکھائی کے جو نتیجے نکلنے تھے نکل کر رہے۔ انپر برہم ہونا اور ساتھ ہی اس نظام کی تائید کئے جانا تو گویا

یہ چاہتا ہے کہ آگ پیدا ہو جائے لیکن اس میں جلانے کی قوت نہ ہو۔ پانی کا وجود ہو لیکن وہ کسی شے کو تر نہ کر سکے۔ آفتاب نکل آئے لیکن کوئی شے اس سے منور نہ ہونے پائے۔ اکبر کی تشخیص میں یہی نظام تعلیم تو ہے جس نے ابتری ہمارے اخلاق میں معاشرت میں مذہب میں پیدا کر رکھی ہے ؂

اک علم تو ہے بُت بننے کا اک علم ہے حق پر مٹنے کا
اِس علم کی سب دیتے ہیں سند اُس علم میں ماہر کون کرے

جب علم ہی عاشق دنیا ہو پھر کون بتائے راہ خدا
جب خضر اقامت پر ہوں فدا نا ئید مسافر کون کرے

شوا بھی ہے رنگ طبع بشر فطرت ہی میں ہیں اسباب جنوں
اکبر کو بھی ہوش آ جائے تو پھر اس کام کو آخر کون کرے

اس حقیقت کی ترجمانی ایک دوسرے وزن و قافیہ میں ؂

مسٹر نقلی کو عقبیٰ میں سزا کیسی ملی
شرح اسکی نامناسب ہے ملی جیسی ملی

اس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ التماس
چارہ کیا تھا اے خدا تعلیم ہی ایسی ملی

یہی مضمون ایک تیسری جگہ ؂

اس چیز کا کیا کہنا اکبر تھا جس نے دلوں کو نیک کیا
لاکھوں ہی طبائع کو کھینچا ہموار کیا اور ایک کیا

جو قوم کو ابتر کرتے ہیں اب انکا اثر پر رونا ہے
معلوم نہیں کیا مطلب ہے معلوم نہیں کیا ہونا ہے

اسکا جو سبب ہے سن لو تم وہ عیاں ہے ظاہر ہے
الفاظ صریح و واضح ہیں یہ مطلع اکبر حاضر ہے

تعلیم جو دیجاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

فرماتے ہیں کہ ملت کی شیرازہ بندی اگر مقصود ہے تو علیگڈھ اس درد کی دوا نہیں ہو سکتا۔ ملازمت اور چاکری کے سکوں کی ٹکسال کا کام تو یہ قومی کالج ضرور دیسکتے ہیں لیکن قوم کا قوام تو انگریزی سے نہیں عزنی ہی سے درست ہو سکتا ہے۔ خشک حقیقت کو ظرافت کے چٹخارے کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں ؂

یہ بات تو کھری ہی ہرگز نہیں ہو کھوٹی
عربی میں نظم ملت بی اے میں صرف روٹی
لیکن جناب لیڈر یہ شعر سن کے بولے
بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی
اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہی
کس کی نظر ہو غائر کس کی نظر ہی موٹی

لیکن نظم ملت و اصلاح امت کی اب پروا ہی کسکو ہی۔ دین کا اب سوال ہی کیا؟ پیش نظر تو صرف دنیا اور اسکی ترقیاں ہیں، کاونسل اور اسمبلی، اسکول اور کالج، جاہ اور منصب مشاہرہ و اعزاز، خودی کی پرستش سے اب فرصت کسکو جو خدا کی پرستش پر توجہ کرے۔ شاعر یہ منظر دیکھ کر یہ صدا لگاتا ہے ؎

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

نظام کائنات میں اذیت و تکلیف کا وجود رکھا ہی اس غرض سے گیا ہو کہ اس سے نفس میں شکستگی و تضرع پیدا ہو۔ ذہن بجائے اسباب کے مسبب الاسباب کی جانب متوجہ ہو مخلوق اپنے ہم جنسوں سے بے آس ہو کر خلوص و خضوع کے ساتھ اپنے خالق کی جانب رجوع کرے چنانچہ دنیا میں جو عذاب نازل ہوتے رہتے ہیں انکا فلسفہ یہی ہی۔ فطرت سلیم ایسے موقعوں پر راہ ہدایت پا جاتی ہے لیکن ایسی مخلوق کی بھی کمی نہیں جو الٹا اثر لیتی ہی۔ اسکی شقاوت و قساوت کے لئے یہ تمام تازیانہ بے اثر رہتے ہیں۔ ہر تازہ نشان غیبی، ہر جدید آیت الٰہی، ہر تنبیہ فطرت غفلت وجمود الحاد و اعراض میں اضافہ کرتی رہتی ہی جو تریاق ہونا چاہئیے تھا وہ اسکے حق میں زہر کا کام دینے لگتا ہی۔ ہجوم مصائب میں بھی اسے تکیہ مادی اسباب پر اور بھروسہ دنیوی وسائل پر رہتا ہی۔ دست سوال ہر بڑی کوٹھی کے مکیں پر اونچے دفتر کے سردفتر کے آگے دراز ہوتا رہتا ہے۔ پیٹ کا سوال ہر عالیشان دفتر کا طواف کراتا رہتا ہی، ہر امیر

ہر روز بر سر بڑا افسر، امیدوں کا مرکز، حاجتوں کا قبلہ بنا رہتا ہے۔ اللہ سے بے تعلقی مصیبتوں کے ہجوم کے وقت بجائے گھٹنے کے کچھ اور بڑھ ہی جاتی ہے۔ اکبر اپنے گرد و پیش یہ منظر دیکھ اپنی زبان حقیقت ترجمان سے اس پر نوحہ خوانی کرتے ہیں لیکن خوب سمجھے ہوئے ہیں کہ یاران مجلس کو درد و عبرت کے تذکروں سے واسطہ کیا یہ تو اس کے نام ہی سے وحشت کرتے ہیں۔ بزم میں قدم اس شان سے رکھتے ہیں کہ چہرے پر ظرافت کا نقاب پڑا ہوا ہے نشاط و زندہ دلی کا ساز ہمراہ ہے لیکن منہ سے صدائیں درد و عبرت کی نکل رہی ہیں اور زیر لب آواز سوز و فغاں ہی کی آرہی ہے۔ بزم میں تماشائی زیادہ ہیں اہل نظر کم۔[1] تماشائی یہ سوانگ دیکھ کر تالیاں بجاتے ہیں اور اہل نظر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ ایک جھلک دیکھتے چلئے ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں — میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

مصیبت میں بھی یاد خدا آتی نہیں ان کو — دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

فضا کی حالت یہ ہے کہ سچی بات زبان سے نکالنا مشکل۔ بس جو کچھ سب کہہ رہے ہیں وہی کہے جائیے۔ جو کچھ دوسرے کر رہے ہیں وہی کئے جائیے، جس حمام میں سبھی ننگے ہوں اسی میں آپ بھی بلا تامل بے پردہ ہو جائیے۔ جب تو آپ اچھے آپ کی باتیں اچھی آپ کی سوسائٹی اچھی۔ ادھر کلمہ حق زبان سے نکلا کہ مارے گئے۔ ہر طرف سے آوازے کسے گئے، نکالے گئے۔ اعزاز و عافیت کی تلاش ہے تو جو رنگ چھایا ہوا ہے بس اسی میں چپکے سے خود بھی رنگ جائیے ؎

یہ عجب عمل یہ عجب اثر یہ عجیب نقش ابھر گئے — جو لپے بہت تو بچے ذرا جو کھری کہی تو دھرے گئے

---

[1] حالی سے — اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی — بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

تری بزم اکبر خوش بیاں ہر محفل فرحت دوستاں
جو ملول آئے وہ خوش گئے جو فسردہ آئے ہرے گئے

مذہب و اخلاق خدا اور رسول حشر و ملائکہ کو چھوڑیئے۔ اسوقت ڈگری حاصل کرنے، گریجویٹ ہونے، ڈاکٹریٹ کی سند ہتھیانے، کونسل کی ممبری اچک لینے، ملازمت میں داخل ہو جانے کی دھن میں اتنے حواس بھی کسی کے نہیں کہ خشک عقلی و علمی بحثوں پر قوت غور و خوض صرف کی جائے اور اتنی فرصت کسے کہ رومی و رازی نہ سہی سعدی و طوسی ہی کے لئے وقت نکالا جائے؟ معیار تو صرف یہ ٹھہر گیا کہ فلاں مطالعہ جلب زر میں حصول جاہ میں کہاں تک معین ہو گا۔ اور بس۔ یہ کیسی کہانی اکبر کی زبانی دو لفظوں میں سن لیجئے ؎

اس سے تو اس صدی میں نہیں ہمکو کچھ غرض
سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا

بہر خدا جناب یہ دیں ہم کو اطلاع
صاحب کا کیا جواب تھا بابو نے کیا کہا

لڑائیاں حکومتوں کے درمیان پہلے بھی ہوتی تھیں اور اب بھی ہوتی ہیں۔ البتہ پہلے انکی بنیاد تحفظ عقائد، پاس عزت، حفظ ناموس تھی۔ غرض کوئی نہ کوئی پہلو خودداری کا لئے ہوتے۔ اب دنیا اس درجہ غالب آگئی ہو کہ یہ سب اڑا اکر جنگ کی محرک تقریباً ہر جگہ تجارتی رقابت رہ گئی ہے اور معاشی مسابقت۔ فرماتے ہیں ؎

مذہب کے واسطے نہ شرافت کے واسطے
ہے اب تو جنگ حکم و تجارت کے واسطے

لے ہی گئے گھسیٹ کے مجھکو پریڈ پر
تیار ہو رہا تھا میں جنت کے واسطے

کسی زمانے میں ہمیں تعلیم یہ ملی تھی کہ راہ خدا میں جو کچھ کرو حتی الامکان خلق کی نظر سے پوشیدہ کر کے اور جو کچھ بھی خیرات کرو اس سے مقصود بس اللہ کی رضا جوئی ہو نہ کہ بندے پر کوئی احسان۔ لیکن اب حالت یہ ہو کہ چندہ بعد کو دیا جاتا ہو اور اعلان

پھیلے گیا جاتا ہے جلسوں میں بھی تالیوں کی گونج کے درمیان اور پھر اخبارات کے ذریعہ سے بھی۔ بلکہ بہت سی صورتوں میں بس اعلان ہی اعلان، وعدہ ہی وعدہ رہتا ہے۔ اس سے آگے کی نوبت بھی نہیں آتی اور پھر اس کار خیر سے مقصود کیا ہوتا ہے؟ عموماً یہی نہ کہ فلاں انجمن کی صدارت فلاں مدرسہ کی سرپرستی ہاتھ آجائے، فلاں پارٹی پر اثر اور اقتدار قائم ہو جائے۔ یا پھر یہ کہ چندہ خان بہادری کی، آنریری مجسٹریٹی کی، نائٹ ہڈ کی، غرض کسی معزز منصب یا خطاب کی قیمت سمجھ لیا جائے۔ شاعر اپنے چاروں طرف یہ سماں دیکھ کر حسرت و یاس کی لے میں پکار اٹھتا ہے ؎

کچھ دیکھتا نہیں ہیں دل زار کیلئے جو کچھ ہو رہا ہے سب اخبار کے لئے

ایک دوسری جگہ عبرت و حسرت کے اس گنجینہ کو شوخی و ظرافت کے دو شالے میں ڈھانپ کر پیش کرتا ہے ؎

چرخ نے پیش کمیشن کہہ دیا اظہار میں قوم کالج میں اور اسکی زندگی اخبار میں
شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں بیبیاں اسکول میں شیخ بھی دربار میں

انتشار ملت کی اس سے صحیح تصویر اور کیا ہو گی؟

حمایت مذہب کے دعوے اب بھی زبانی بہت کچھ کئے جا رہے ہیں لیکن عموماً اس طبل بلند بانگ کے پیچھے حقیقت کیا ہوتی ہے؟ یہی نہ کہ ذاتی مخالفتوں، مخاصمتوں کی تسکین کا موقع ہاتھ آجائے اور مخالف کی رسوائی اور بدنامی جی بھر کر ہو رہی ہے، مخالف اگر وہابی ہے تو آپ اسکی ضد میں اپنے کو صوفی کہنے لگے اور اسکی وہابیت کو خوب خوب اچھال لئے۔ حریف اگر بدعتی ہے تو آپ اسکے جوڑ پر اتباع سنت کے مدعی ہو جائیے

لہ یہ منظر کشی ــــ انگریزی دور کی ہے۔

اور اسکے بدعتی ہونے کو خوب چمکائیے خوب پھیلائیے۔ اکبر کا قلم یہ سادہ تصویر یوں پیش کرتا ہے، بلاغت کے رنگین نقش کا اسپر اضافہ ہے

ہادی کے کبھی پیرو نہ ہوئے ہاں اسکے لئے لٹھ تان سکے
مذہب نے ہمیں پہچان لیا ہم اسکو نہیں پہچان سکے

خدا فروش نظام معیشت اور خود پرست آئین معاشرت کے اختیار کر لینے کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ امن و عافیت کا نشان نہ رہا انبساط قلب و سکون خاطر کے الفاظ بے معنی رہ گئے۔ آئین ہمدردی کے بجائے فلسفہ "تنازع" للبقا" اور "کارزار" حیات کا رائج ہو گیا۔ زندگی کی ضرورتیں گراں ہو گئیں، بدکاریاں ارزاں ہوئیں۔ ہلاکتیں بڑھیں عمریں گھٹیں، ہیجان میں بیشی، اطمینان میں کمی آئی محبتیں مٹیں، خصومتیں ابھریں خدا فروشی کا نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ زندگی تلخ ہو جائے۔ تمدن اور تہذیب کی اس زندگی سے عقبیٰ جیسی سنورتی ہے اسے تو "کل" پر اٹھا رکھئے آجکا مشاہدہ تو یہ ہے کہ دنیا برباد ہوئی جاتی ہے۔

گلشن مشرق کا باغباں اپنی آنکھوں سے اپنے چمن کی بربادی دیکھتا ہے اتنا بس نہیں کہ صیاد کا ہاتھ پکڑ سکے ہاں اپنے اوپر کسی حد تک اختیار اب بھی باقی ہے۔ زبان پر مرثیہ ہے لب پر آہ ہے آستین آنکھوں پر ہے اسے ہٹا کر دیکھئے تو کچھ بوندیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں شاید کہ مستقبل کا جوہری ان موتیوں کی کچھ قیمت لگا سکے ہے

ہمکو نئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں ۔ باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
ذاتی ترقیاں ہیں قومی ہے یا تنزل ۔ گرہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں
ٹانکے وہ لگ رہے ہیں جو کر دنوں میں ٹوٹیں ۔ بخیے جو فطرتی تھے وہ اب ادھڑ رہے ہیں

سطح زمین سے پوچھو کیا مل رہا ہے اسکو — نظروں میں پھلجھڑی ہے گو پھول جھڑ رہے ہیں
چلتی تو ہیں زبانیں اور بھرتے ہیں شکم بھی — لیکن امید کیا ہو جب دل اجڑ رہے ہیں
یہ زیور معانی کسکی کریں گے زینت — لفظوں میں یہ نگینہ کیوں آپ جڑ رہے ہیں

فلسفہ کو تو چھوڑیے کہ یہ تو خود ہی ظنیات و احتمالات کی بھول بھلیاں ہے۔ سائنس کو لیجئے، کہا جاتا ہے کہ یہ قطعیات اور یقینیات کا ہادی ہے اور سائنٹفک ترقیاں مخصوص فیض ہیں تمدن جدید کا لیکن یہ ارشاد ہو کہ یہ آلات اور نت نئی ایجادات والی ترقیوں سے دنیا میں برکتیں زیادہ پھیلی ہیں یا لعنتیں؟ مجموعی طور سے انسے ابتک دنیا کے ذخیرہ مسرت و راحت میں اضافہ ہوا ہے یا جنگ و جدال میں قتل و غارت میں جعلسازی دھوکہ بازی میں؟ ان سے تحریک و تقویت انسان کے جذبات ملکوتی کو زیادہ پہنچی ہے یا جذبات بہیمی کو؟ شاعر کے ذہن میں یہ سب واقعات و مشاہدات محفوظ ہیں، آہ سرد کے ساتھ وہ صاحب، اور صاحب کے لائے ہوئے سائنس کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ ہم نے تو اپنا اخلاق اپنا جوہر شرافت سب آپکی خوشی پر نثار کر دیا تھا، اپنوں کو بیگانہ بنالیا تھا لیکن اب جو نظر پھیر کر دیکھتے ہیں تو آپکی تشریف آوری سے الٹی مصیبتیں ہی بڑھ رہی ہیں۔

میرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں نہ بھائی خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اسکو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں

جو دیکھا سائنس کا یہ چکر دھرم پکارا کہ اے برادر
ہمارے دور میں پُن مگن تھے تمہارے دور میں پاپ خوش ہیں

مشرق و مغرب کا جو فرق ہے وہ مشرق و مغرب کا فرق نہیں بعد المشرقین ہے

جزئیات میں نہیں کلیات میں ہے فروع میں نہیں اصول میں ہے۔ عرض میں نہیں جبلت و سرشت میں ہے۔ وہ مادیت میں مست ہیں ہم روحانیت میں غرق۔ وہ تجارت و ثروت کی گھوڑ دوڑ میں سرگرم عمل ہیں ہم صبر و قناعت کے حجرہ میں فقر کی کملی لپیٹے ہوئے۔ وہ دنیا کے چپہ چپہ سے واقفیت کی دھن میں ہیں ہمیں اپنے عرفان نفس کی کوششوں سے فرصت نہیں۔ وہ اسپر تلے ہوئے ہیں کہ مادے کے ایک ایک قانون کو دریافت کر کے رہیں گے۔ ہم اپنے سفر میں کائنات مادی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ وہ عقل کی انتہائی ترقی اسے سمجھ کر اچھل پڑتے ہیں کہ انسان کی اصل بندر ہے ہم بدمستی اور بیہوشی میں بھی نعرے لگاتے تو یہ کہ انسان خدا میں گم ہے"۔ اکبر اس سارے دریا کو کوزہ میں بند کر کے پیش کرتے ہیں ؎

مشرقی کو ہے ذوق روحانی — مغربی میں ہے میل جسمانی
کہا منصور نے خدا ہوں میں — ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست — فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اکبر نرے واعظ نہ تھے حکیم اخلاق بھی تھے۔ راہ راست کی جانب اشارہ کر کے خاموش ہو جانے والے نہ تھے، راستہ کی پیچیدگیوں، راہ روکی الجھنوں سے بھی واقف تھے۔ اسلئے مسافروں کو راہ کے پیچ و خم اور منزلوں کی مشکلات کے بابت بھی ہدایتیں دے جاتے ہیں اخلاق کے اکثر مرحلے بڑے ہی پیچیدہ واقع ہوئے ہیں۔ حساب کے پہاڑے نہیں کہ چھوٹا بچہ بھی آنکھ بند کر کے رٹ ڈالے۔ جذبات کی کشش ایک سمت ہوتی ہے عاقبت اندیشی کا فتوی دوسری جانب اور پھر خود جذبات کے اندر بھی باہمی آویزش و کشمکش۔ اکبر کہیں کہیں ان گتھیوں کو بھی سلجھاتے گئے ہیں جابجا انکی حکیمانہ

فکر و عارفانہ نظر نے اخلاق و معاشرت کے محض جزئیات ہی نہیں بلکہ فلسفۂ اخلاق کے اصول کو لیا ہے اور بنیادی مسائل کو کھول کر رکھدیا ہے۔

شباب کی بدمستیاں و بے احتیاطیاں کس نوجوان اور پختہ عمر والے کو نہیں معلوم۔ ساتھ ہی مذہب و اخلاق کی عدالت کا فیصلہ بھی سب پر روشن ہے۔ اکبر کا کمال یہ ہے کہ کل چار مصرعوں کے اندر (بھلا چار مصرعوں کی بھی کوئی بساط ہے!) پہلے تو انسان کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہیں آپ ابھی اسی کو دیکھتے ہی ہوتے ہیں کہ وہ مرض کی ایک ایک علامت کو بیان کرنے لگتے ہیں آپ انکی داد ابھی دینے نہیں پاتے کہ چٹ پٹ وہ ایک نسخۂ شفا بھی تجویز کر ڈالتے ہیں مکمل تشخیص اور علاج کل چار مصرعوں میں!

نیچر کو ہوئی خواہش زن کی، اور نفس نے چاہا رشک پری
شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہے بجا اور نفس کی خواہش بھی ہے روا
شیطان کا ساتھ البتہ بُرا اور خوف خدا ہے اسکی دوا

دین و مذہب کی تحصیل بہتوں نے محض ایک علم یا فن کے طور پر کرنا شروع کی ہے یعنی بجائے اسکے کہ اسکو برتیں، اسکو اپنی زندگی میں نباہیں، اسے ایک مسلک حیات قرار دیں محض اسکے کچھ مسائل یاد کر لیتے ہیں۔ مقصود ان معلومات پر عمل کرنا نہیں ہوتا بلکہ دوسروں پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانا ہوتا ہے یا پھر دوسروں کی لتاڑ کرنا۔ اکبر کا قول ہے کہ مذہب و اخلاق سے فائدہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ انکی تعلیمات پر عمل کر کے انھیں جزو زندگی بنا لیا جائے نہ یہ کہ انکے قیل و قال سے کام محض گرمی

محفل کا لیا جائے لیکن عمل میں ظاہر بینوں کو لذت کہاں نفس کو لذت تو دوسروں
ہی کو بتانے پڑھانے سکھانے میں آتی ہے کہ اس میں نفس اپنی ایک بڑائی محسوس کرتا ہے

علم دیں حاصل کیا لیکن قباحت یہ ہوئی — صرف سکھلانے میں لذت ہے عمل میں کچھ نہیں
زیست کا مصرف بنے خود آہِ سوزاں تب ہے لطف — ورنہ اے اکبر تری نظم و غزل میں کچھ نہیں

مذہب کا لیبل چپکا لینے، مذہب کا نام محض رٹ لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل شے
ایمانیات میں عقیدہ توحید اور اعمال میں درستی اخلاق جب یہ حاصل ہے تو سب کچھ
حاصل جب یہ نہیں حاصل تو کچھ بھی نہیں حاصل باقی سب لفاظیاں اور اصطلاحی بولیاں ہیں ع

مرے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں — جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں برے جو ہیں وہ کافر ہیں
وہی ہیں پاک طینت لو لگی ہے جنکی خالق سے — نہیں ہے شرک کی جنمیں نجاست بس وہ طاہر ہیں

مذہب کی حیثیت انفرادی سے زیادہ جماعتی تو پہلے بھی تھی لیکن اب تو کہنا چاہیئے کہ
یہی جماعتی حیثیت اور سب حیثیتوں پر غالب آگئی ہے۔ کوئی شخص اگر عیسائی ہے تو
اسکے معنی اب یہی رہ گئے ہیں کہ اسکا میل جول اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا عیسائیوں کے
ساتھ ہوگا اسکے طور طریقہ فرنگیوں کی طرح ہونگے۔ سال میں بڑا دن منائے گا خوشی
کریگا، کیک کھائے گا۔ ہفتہ میں اتوار کو کام کاج بند رکھے گا ملنے جلنے میں رہے گا۔
عجب نہیں کہ گرجا بھی جائے۔ کوئی صاحب اگر شیعہ ہیں تو معنی یہ ہیں کہ محرم میں مجلس
کریں گے عزا و ماتم میں پیش پیش ہوں گے۔ آمد و رفت شیعوں کے یہاں رکھیں گے۔
کوئی بزرگ اگر سنی ہیں تو میل جول اہل سنت سے رکھیں گے۔ مدح صحابہ کے جلوس
میں شریک ہونگے۔ گھر کی ریت رسم سنیوں کی سی رکھیں گے۔ کسی شخص نے تبدیل
مذہب کر دیا تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اپنی سوسائٹی بدل دی اپنے

جماعتی ماحول میں تغیر کر دیا۔ فلاں فلاں کے بجائے فلاں فلاں سے تعلقات اور رابطے بڑھ گئے۔ عقاید کا سوال بالکل دوسرا ہے اسکا تعلق صرف خدا اور بندے کے درمیان ہے یہاں گفتگو مذہب کے صرف ظاہری، معاشری، مجلسی پہلو سے ہے اسلئے اکبر کہتے ہیں کہ معتقدات سے کر ید کی حاجت دنیا کو بالکل نہیں دیکھنے کی بات تو صرف اتنی ہے کہ وضع اور طرز اعمال و اخلاق کیسے ہیں سے

مذہب ہے امر قومی۔ سمجھ نہ شغل ذاتی
معذور سب ہیں اس میں گنگو ہوں یا وفاتی
شیعہ ہوں یا کہ سنی۔ لالہ ہو یا برہمن
مذہب کو مورثوں سے سب پاتے ہیں عموماً
پولیٹیکل ضرورت بیشک تھی اسکی اول
اب اس طرف توجہ لازم ہے صرف سوشل
اچھا برا نہ کہدو تم مذہبی بنا پہ
اخلاق اسکے دیکھو ہے اصل تو یہ جوہر
تعلیم جو ہے عمدہ صحت اگر ہے اچھی
پاؤ گے اسکو اچھا طبیعت اگر ہے اچھی
ناری ہے یا کہ ناجی اسکا بیاں نہیں ہے
سوشل طریق یہ ہے اور وہ تو راز دیں ہے

دنیا میں قانون تکوینی کچھ ایسا رکھ دیا گیا ہے کہ ایک کے بڑھنے کے معنی دوسرے کے گھٹنے کے ہوتے ہیں۔ ایک آج ملازمت سے موقوف ہوا، یا بن بمرہٹا، اس کے گھر میں ماتم برپا ہو رہا ہے لیکن جس نے اسکی جگہ پائی کوئی اس کے گھر جاکے دیکھے کیسے شادیانے بجتے ہوتے ہیں پرانی آبادی ویران کر کے محکمہ آرائش بلدہ ایک خوشنما و خوش فضا پارک بنواتا ہے، خلقت وہاں تفریح کے لئے امنڈ امنڈ کر جمع ہوتی ہے اور ہر وقت ہنستی بولتی۔ ہستیوں کا مجمع لگا رہتا ہے لیکن ادھر کبھی کبھی خیال کیا گیا ہے کہ کتنے بھرے پرے گھر مسمار ہوئے ہوں گے جب جاکر یہ قطعہ زمین پارک کے لئے نکلا ہے، ان ہنستے بولتے تفریح والوں

پر کیا گذری ہو گی اپنے پیارے گھروں کو چھوڑتے وقت اپنے گھروں سے بے گھر ہوتے وقت، انھیں کھدتے دیکھکر اپنے کھیل کود کی جگہ پر اپنے کھانے پینے لیٹنے سونے کی جگہ پر پھاوڑے چلتے دیکھکر! فاتح اپنی فتحمندیوں کا جشن مناتا ہے، بھولا ہوا بالکل بھولا ہوا کہ کتنی سہاگنیں بیوہ ہو گئیں، کتنے بچے یتیم ہو گئے کتنے خاندان برباد اور کتنے گھر بے چراغ ۔

یہ بات صاف مجھسے سن لے کتاب میں اسکو کیا پڑھے گا
حدود دنیا کے ہیں معین جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھے گا

انسان معصیت سے ہاتھ اگر کھینچتا ہے تو عموماً اسوقت جب خود گناہ ہی کی قوت سلب ہو چکتی ہے یا اسکے سامان مفقود ہو چکتے ہیں ورنہ جبتک قوت وسامان موجود ہے نفس پرستیوں اور سیاہ کاریوں کا معاملہ ذرا مشکل ہی سے ختم ہوتا ہے ۔

معترض بھی کوئی حق گو کبھی ہو جاتا ہے مگر اس بزم میں سچ یہ ہے کہ جی ہاں ہی بہت
وعظ تقوی نہ کہو رحم کرو اکبر پر چشم بد دور ابھی طاقت عصیاں ہے بہت

نیکی اور بدی پر آخرت میں ثواب و عذاب جو کچھ بھی مرتب ہو گا وہ تو اپنی جگہ پر ہے، ایک بین فرق دونوں کے درمیان تو اس دنیا میں بھی محسوس ہوتا ہے کہ طاعت کے بعد طبیعت میں شگفتگی، اطمینان و سکون پایا جاتا ہے اور معصیت کے بعد طبیعت کو اضطراب لاحق رہتا ہے ۔

شگفتہ پایا طبیعت کو بعد کار ثواب دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد

محض کتابی معلومات، انسان کے جوہر باطن کو جلا دینے کیلئے کافی نہیں اسکے لئے اچھوں کی صحبت لازمی ہے۔ زندگی پر آخر زندہ شخصیت ہی کا پڑتا ہے۔

ایمان میں قوت، عمل میں رسوخ، زندہ معلّم کے واسطہ سے نصیب ہوتا ہے۔ عالم بے عمل وہی کہلاتے ہیں جن کے دماغ کتابی معلومات سے آشنا ہیں، لیکن دل غفلت کی نیند سو رہے ہیں ؎

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں — آدمی آدمی بناتے ہیں
جستجو ہم کو آدمی کی ہے — وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

ایک اور موقع پر ؎

کام نکلے گا نہ اے دوست کتب خانوں سے — رہیئے کچھ روز کسی محرم اسرار کے ساتھ

انسان کو اپنے خلاف مزاج دنیا میں ہزارہا واقعات ملتے رہتے ہیں لیکن کارخانۂ دہر کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا اسکے بس کی بات نہیں۔ یہ نظام کائنات تو اسکی مرضی کا نہیں کسی اور ہی مشیت کا پابند ہے۔ اسلئے مآل اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر ناملائم واقعہ پر، ہر حادثہ پر، صبر و تحمل، بلکہ رضا و تسلیم سے کام لینے کی عادت ڈال لے۔ یہی اصول ایسے ہیں، جو زندگی کو ہر طرح خوشگوار بنا دیتے ہیں ؎

اپنی مرضی کے موافق دہر کو کیوں کر کروں — بے حد آتا ہے مجھے غصہ مگر کس پر کروں
جل بسے چھوٹے بڑے، تھا جن سے لطفِ زندگی — مجھ پہ کسکو ناز ہے، میں ناز اب کس پر کروں
وصل کی شب جس سے ہو ہی ہو جائیگی بسر — لطف اٹھاؤں یا درازی کی دعا تب بھر کروں

کائنات کا ذرہ ذرہ کسی خاص غایت و مصلحت کے ماتحت حرکت کر رہا ہے۔ ہر چھوٹے چھوٹے فعل کا معاوضہ کسی نہ کسی صورت میں مل کر رہیگا۔ ہر مبتدا کی خبر ضرور نکلے گی، ہر ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت کوئی نتیجہ ضرور پیدا کر کے رہے گی۔ انسان اگر اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھے اور دل کو عیش و عشرت کی غفلتوں میں نہ پھنسنے

دے تو پھر زندگی بڑے امن و عافیت کے ساتھ گزر سکتی ہے۔ جام حیات میں تلخی پیدا کرنے والی ہماری ہی فراموش کاریاں، غفلت شعاریاں ہوتی ہیں۔ اس فلسفہ کو ایک مسلسل غزل میں بڑے لطف و خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے ؎

اکبر اس فطرتِ خاموش کو بے حس نہ سمجھ — ہاں بصیرت سے تھی دیدۂ نرگس نہ سمجھ
راحتِ زیست کے ساماں سے دھوکے میں نہ آ — امتحان گاہ کو تو عیش کی مجلس نہ سمجھ
جاہ و منصب میں نظر عاقبت کار پہ رکھ — خاتمہ جس کا ہوا افسوس، اسے آفس نہ سمجھ
صبر کے ساتھ مصیبت میں جو ہو حسن عمل — بہر انجام یہ امرت ہے اسے بس نہ سمجھ
دل کا دنیا کی امیدوں سے بہلنا ہے برا — زندگی تلخ جو کر دیں انھیں ہونس نہ سمجھ

تعصب اور غصہ کے جذبات عموماً تنگ نظری کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ انسان کی نظر جوں جوں وسیع ہوتی جاتی ہے دل میں ہمدردی، رواداری، دوسروں کی مشکلات کا احساس، اُن سے ہوا خواہی زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی فطرت کی نیرنگیوں، مشیت تکوینی کی بے پایاں عجائب کاریوں کو دیکھ کر قلب عارف پر حیرت طاری ہونا ناگزیر ہے ؎

شیخ جی کی نظر میں میں ہوں فقط — میری نظر میں ساری دنیا ہے
بس یہی وجہ ہے کہ اے اکبر — مجھ کو حیرت ہے انکو غصہ ہے

علائق دنیوی کی جتنی کثرت ہو گی، اسی نسبت سے سامان غم و الم بھی بڑھتے رہیں گے۔ امن و عافیت مقصود ہے تو دنیوی تعلقات کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہیئے ؎

ایک جمتا ہے ایک نکلتا ہے — کام دنیا کا یونہی چلتا ہے
دل تعلق بڑھا کے پچھتایا — پاؤں پھیلائے ہاتھ ملتا ہے

انسان دوسرے کی عیب چینی و نقص جوئی میں تو بہت پیش پیش رہتا ہے لیکن خود اپنی کمزوریوں اور خطا کاریوں کی جانب کبھی بھولے سے توجہ نہیں کرتا، اس کو کس پر لطف انداز سے ادا کرتے ہیں ؎

میری نسبت جو ہوا ارشاد، وہ میں نے سنا
یہ تو کہیے اپنی نسبت آپکی کیا رائے ہے

انسان کے بارہ میں سب سے زیادہ صحیح رائے خود اس کا ضمیر قائم کرسکتا ہے کہ وہی اسکی اصل کمزوریوں سے واقف ہوتا ہے۔ انسان ساری دنیا کو دھوکے میں ڈال سکتا ہے لیکن خود اپنے ضمیر سے کوئی شے مخفی نہیں رکھ سکتا ؎

نہ بھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے ایسا سمجھتا ہے
تو اپنے دل میں اپنے آپکو کیسا سمجھتا ہے

اخلاق کی صفائی نفس کے تزکیہ کیلئے محض گوشہ نشینی کافی نہیں۔ اصل شے قلب کی بے تعلقی ہے اور اسکا مدار عمل پر ہے۔ اچھی باتوں کے داد دینے والے بہت سے مل جاتے ہیں، ان پر عمل کر دکھا دینے والے کم ہی نکلتے ہیں ؎

حرص دنیا سے نہیں ہر صاحب عزلت بری
خانقاہیں اور ہیں اور دل کا کونا اور ہے

مدحت گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند
خوب کہنا اور ہے اور خوب ہونا اور ہے

نفس بشری کی ایک خاص کمزوری دنیا پر ہمیشہ سے مسلط رہی ہے اور اب تو کہنا چاہیے کہ ہر طرف وہی گھیرے ہوئے ہے۔ انسان دوسروں کی بدکاری پر انھیں برا بھلا کہہ لینا اپنے لئے بالکل کافی سمجھتا ہے اور خود اپنی اصلاح کی طرف ذرا توجہ نہیں کرتا۔ گویا عبادت و حسن عمل کا بنیاد ہی ٹھہرا، اللہ کی حمد نہیں شیطان پر لعنت بھیجنا ٹھہر گیا ہے۔ یہ صورت حال اکبر کے فلسفہ اصلاح کے بالکل مخالف ہے۔

اہل فرنگ نے اگر ہمیں ناتوان و بےبس پاکر ہمیں اپنا تختہ مشق بنائے ہوئے ہیں تو

۱؎ زمانہ تحریر ۱۹۲۲ء

اسکا یہ علاج ہرگز نہ صحیح ہے نہ کافی، کہ ہم بس انھیں کوستے کاٹتے رہیں، ان کے طور و طریق پر لعنت بھیجتے رہیں، ہمکو اصل فکر اپنی ترقی و اصلاح کی کرنا چاہیئے۔ حضرت اکبر فرماتے ہیں کہ شیطان نے اس شیطانی دور میں شیطنت کی یہ ترکیب خوب نکالی ہے کہ اللہ کے کچھ بندوں کو بس اس پر لگا دیا ہے کہ وہ شیطان پر لاحول پڑھنے میں لگے رہیں اور حمد و مناجات، توحید و حسن عمل کے لئے وقت ہی نکال نہ سکیں سے

نئی ترکیب اب شیطان کو سوجھی ہے اغوا کی
خدا کی حمد تجئے ترک بس مجھکو بُرا کہئے

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ حریف اگر ہمارے اوپر ستم توڑ رہا ہے اور ہم ہیں کہ بجائے اپنی اصلاح حال و تصحیح اعمال کے محض اس پر لعنت بھیجنے میں لگے ہوئے ہیں تو تباہ ہم اور وہ دونوں ہوکر رہیں گے۔ قانون فطرت انتقام دونوں سے لیگا۔ حریف سے اسکی زیادتیوں کا، ہم سے ہماری کوتاہیوں کا۔ اس سے اقدام جور و ستم کا، ہم سے غفلت و جمود کا۔ عدو کی تباہی ہماری فلاح کی خود بخود مستلزم ہرگز نہیں ؎

یہی خصائل یہی طبیعت رہی تو اپنی قسمت یہی رہے گی
زمانہ بدلے گا بھی تو پھر کیا۔ ہماری حالت یہی رہے گی
یہی سیہ کاریاں اگر ہیں تو نور صبح اُمید کیسا
یہی ہے زلفِ بتاں کا سودا، تو میری شامت یہی رہے گی
عمل جب اپنے نہیں ہیں اچھے تو ذکر عصیان غیر کیسا
عدو کی قسمت بگڑ بھی جائے تو اپنی قسمت یہی رہے گی

سکون خاطر و اطمینان قلب اگر مقصود ہے تو اسکا ایک ہی راستہ ہے، سارے اولیا، انبیا، کا بتایا ہوا سمجھایا ہوا راستہ ع

صد ہزاراں پیر پر وے متفق

یعنی دنیا سے بحیثیت دنیا کے بے تعلقی و بیزاری۔ دل میں لو اور لگن کسی اور ہی کی لگی رہے، باقی ہاتھ پیر، چلتے پھرتے، حرکت کرتے اسی دنیا میں رہیں۔ بقول عارف رومؒ ؎

ہیچ کنجے بے دَد و بے دام نیست
جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

یہی نصیحت بیسویں صدی کے اس عارف نے بھی کی ہے ؎

جو اہلِ دُنیا کا رُخ کروگے، سکونِ خاطر کبھی نہ ہوگا
شریکِ غفلت بہت ملیں گے، شریکِ عبرت کوئی نہ ہوگا

یہی ہے مذہب کا جزوِ اعظم کہ دین دنیا پہ ہو مقدم
نئے طریقے میں لیکن اے دوست، ہوگا سب کچھ یہی نہ ہوگا

صدیوں پیشتر اس آوازۂ حق کی منادی کردی گئی تھی کہ اطمینانِ قلب و راحتِ دل صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان کامل رکھتے ہیں اور اپنی بدعملیوں سے اپنے ایمان کو زنگ نہیں لگاتے۔ اکبر کی آواز بھی اسی آوازۂ حق کی صدائے بازگشت ہے۔ خلقت کو اصلاح دنیوی کا راستہ بتاتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کلام مجید کے اوراق سامنے کھلے ہوئے ہیں، انھیں کا ترجمہ اپنی زبان میں کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ذرا کان لگا کر تو سُنئیے ؎

یہ عزم ترا سعی سے دمساز ہو کیونکر[1]
اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز ہو کیونکر

[1] "جو بھی مصیبت تمھارے اُوپر آئی ہے وہ خود تمھارے ہاتھوں آئی ہے" (شوریٰ ع۴) "تمھیں جو کچھ بھی بُرائی پیش آئی ہے خود تمھارے نفس کی لائی ہوئی ہے" (نساء ع۱۱) خدا کسی قوم کی حالت اسوقت تک نہیں بدلتا جبتک وہ خود اپنی حالت نہ بدل دے" (رعد ع۲)

اسباب کرے جمع خدا ہی کا یہ ہے کام ۔۔۔ طالب ہو خدا ہی سے دعا ہی کا ہی یہ کام[۱]

بے طاعت و نیکی نہیں، تاثیرِ دعا کچھ ۔۔۔ آنے کی نہیں کام فقط حرص و ہوا کچھ[۲]

منظور مفاخر کا اگر تجھکو سبق ہے ۔۔۔ تخصیص تری کیا ہے حریفوں کو بھی حق ہے[۳]

کیش بکش فطرت دنیا ہے مسلسل ۔۔۔ اک آج اگر صاحب طاقت ہے تو اک کل[۴]

نیکی کی طرف رخ ہو یہی ناموری ہے ۔۔۔ کھوٹے کو جُدا کر دے وہی بات کھری ہے[۵]

لیکن یہ سارا دفتر وعظ و پند، یہ ساری شاعری و بلاغت، یہ ساری فلسفہ سنجی و نکتہ آفرینی ایک طرف، اور فطرت کی رفتار تکوینی مشیت الٰہی کا رخ دوسری طرف جس مشیت نے بڑے بڑے انبیاء و رسل کو ظاہری اور قریبی نتیجہ کے لحاظ سے ناکام ہی رکھا، جس حکمت تکوینی نے خدا معلوم کتنے معرکوں میں صورت کے اعتبار سے کفر کو ایمان پر، اور ظلمت کو نور پر غالب رکھا، اسکی رفتار میں بیسویں صدی کے ایک مصلح شاعر کی خاطر فرق کیونکر پڑ سکتا تھا؟ ہدایت و گمراہی کے دور کا آخری سلسلہ انسان

---

[۱] "خدا ہر قسم کی فراہمی اسباب پر قادر ہے، لیکن اکثر لوگ اس سے بیخبر ہیں" (کہف ع ۵) "ساری قوت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے" (بقرہ ع ۲۰) حکومت و اختیار صرف خدا کا ہے" (یوسف ع ۵)

[۲] مسلمانو، فلاح عاقبت نہ تمھاری تمناؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر بلکہ عمل پر موقوف ہے پس جو شخص بُرا کرے گا اسکی سزا پائے گا" (نساء ع ۱۸)

[۳] وہی خدا تو ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا، تمھیں میں کافر بھی اسی نے پیدا کئے اور مومن بھی" (تغابن ع ۱)

[۴] "ہم یہ زمانہ حکومت و کامرانی باری باری لوگوں کو دیتے رہتے ہیں" (آل عمران ع ۱۴)

[۵] "تم میں جو سب سے زیادہ پاکباز ہے وہی خدا کے نزدیک سب سے معزز ہے" (حجرات ع ۲) "جو لوگ عزت کے خواستگار ہیں سو عزت تو ساری کی ساری صرف خدا ہی کی ہے" (فاطر ع ۲)

کے نہیں انسان آفریں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کارخانہ کائنات کی بنیاد بشر کی جس غفلت پر رکھی گئی ہے اسی پر یہ برابر چلتا رہے گا۔ پیمبروں جیسی مقبول و برگزیدہ ہستیاں جب فطرت کی رفتار کو نہ بدل سکیں تو کسی شاعر غریب کی بساط ہی کیا۔ اکبر بھی اس تماشا گاہِ عالم میں اپنا جلوہ حسنِ ادا، کمال و جمال کے ساتھ دکھا کے رخصت ہو گئے۔ لیکن چلتے چلتے یہ بھی کہہ گئے کہ زمانہ کا رخ میری یا کسی کی بھی تبلیغ سے نہیں پھر سکتا، چند ہی روز میں یہ حال بھی ماضی بن جائے گا۔ یہ "آج" بھی "کل" میں تبدیل ہو جائیگا حال کی تازگی، ماضی کا افسانہ پارینہ بن جائے گی۔ اسوقت کوئی نوحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا۔ احساسات خود ہی تبدیل ہو چکے ہونگے۔ عیب ہنر بن جائیں گے اور کمال کا نام بے کمالی پڑ جائے گا۔ عقل کو جنون کا لقب دیکر پکاریں گے اور جنون کی تعبیر عقل سے کریں گے ع

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانیسے

کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ کونسی چیز گم ہو گئی۔ شباب کی لذتوں اور مستیوں میں پڑکر یاد ہی کس کو رہ جاتا ہے کہ بچپن کی معصومیت کا زمانہ رخصت ہو گیا۔ بے فکری کا زمانہ خواب و خیال بن گیا! اور نئی نئی فکروں اور ذمہ داریوں کا کتنا سخت بوجھ سر پر آ پڑا ہے! آنکھ کھلتی ہے مگر کب؟ جب وقت ہاتھ سے نکلے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا ہوتا ہے۔ عجب نہیں کہ کچھ ایسا ہی حشر ہماری مشرقی اور اسلامی نہ سہی تو نیم مذہبی تہذیب و اخلاق و معاشرت کا بھی ہو۔ اکبر کے جام جم میں اس قلب ماہیت کے ایک ایک جزئیہ کا عکس موجود ہے۔ بہتر ہوگا کہ مرثیہ کا آخری بند سنا کر مجلس کو کسی دوسرے وقت

کیلئے ملتوی کردیا جائے۔[۱]

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملکِ عدم ہونگے — نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے
نئے عنوان سے زینت دکھائینگے حسیں اپنی — نہ ایسا پیچ زلفوں میں، نہ گیسو میں یہ خم ہونگے
نہ خاتونوں میں رہ جائیگی یہ پردہ کی پابندی — نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہونگے
بدل جائیگا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے — نئی صورت کی خوشیاں اور نئے سامانِ غم ہونگے
عقاید پر قیامت آئیگی ترمیمِ ملت سے — نیا کعبہ بنے گا۔ مغربی پتلے صنم ہونگے
بہت ہونگے مغنی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے — مگر بے جوڑ ہونگے اسلئے بے تال سم ہونگے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی — لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے
بدل جائیگا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں — زیادہ ہیں جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے
گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائینگے — کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے

تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

۱۔ افسوس کہ وہ "دوسرا وقت" آنیکا وقت بھی گزر گیا مقالہ کی تقسیم شروع میں پانچ حصوں میں کی گئی تھی، اور پانچویں حصہ کا عنوان "تصوف، معرفت و فلسفہ" تھا لیکن مقالہ جب ۱۹۲۲ء و ۱۹۲۳ء میں رسالہ "اردو" میں نکلا تو اسکے صرف چار ہی حصے نکلے، اور پانچواں حصہ سارے کا سارا لکھنے سے باقی رہ گیا۔ ۳۳ء میں نظرِ ثانی کے اور پھر ۵۱ء میں نظرِ ثالث کے وقت نہ اتنی ہمت ہوئی اور نہ اتنی مہلت ہی مل سکی کہ تکملہ کیلئے محنت بجائے خود ایک مقالہ کی گوارا کی جائے، یونہی بہت زیادہ وقت کاٹ چھانٹ کی نذر ہوگیا۔ مقالہ اسی طرح اب بھی ناتمام ہی شائع ہوتا ہے! — دنیا میں خدا معلوم کتنے ارادے، کتنے منصوبے اسی طرح ناتمام رہ جاتے ہیں، اور انسان انھیں یوں ہی چھوڑ، اپنے آخری سفر پر روانہ ہو جاتا ہے! اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

اور مقالہ کا یہ حصہ اب اگر لکھا بھی جاتا تو عنوان تو اسکا بجنسہ تو یہ رہ ہی نہیں سکتا تھا: "فلسفہ" کو "تصوف و معرفت" سے یقیناً الگ کرنا ہوتا۔ ۲۲ء میں فلسفہ سے اتنی خوش خیالی نہ معلوم کیوں قائم تھی کہ اسکو تصوف و معرفت کی سطح پر رکھ دیا گیا تھا!

نیا آئینِ اکبری [۵۱]

آئینِ اکبری تو وہی ایک ہے، سب کا جانا ہوا، خوب سا پہچانا ہوا۔ شہنشاہ اکبر کے انتظامی خط و خال کا آئینہ۔ اب اس میں کوئی جدت کیا پیدا کرے گا، پرانے کو نیا کوئی کیونکر بنائے گا، اور اطلس میں گزی گاڑھے کا پیوند کہاں سے لاکر لگائیگا؟ ——— لیکن اکبر آپ کیلئے ایک تاجدار ہندہی کا نام نہیں ہوا ہے۔ اقلیم سخن کا بھی ایک تاجدار اسی نام کا گزرا ہے، صدیوں قبل نہیں ابھی حال میں، اور کہیں بہت دور بھی نہیں آپکے شہر سے نزدیک ہی الہ آباد میں! وہ قدیم آئینِ اکبری اگر اقلیم ہند کے ایک فرمانروا کا مرقع کمال تھا تو آج کا جدید آئینِ اکبری اقلیم معانی کے ایک کشورکشا کا پرتو جمال ہے۔ البتہ وہاں داستان گو ابوالفضل تھا اور یہاں عرض پرداز ایک سراپا جہل ہے ——— خیر "نمائش" کے عجایب زار میں ایک عجوبہ کا اضافہ اور سہی! ادبی کانفرنس میں، ادیبوں اور شاعروں کے مجمع میں، سخن گویوں اور سخن فہموں کے جلسہ میں ایک کم سواد دیہاتی کی یہ جسارت اللہ اکبر! بس یوں سمجھئے کہ گھوڑدوڑ کے میدان میں جہاں بازیاں بڑے بڑے شہسواروں کی لگ رہی ہوں وہیں ایک گوشہ میں ایک نعلبند بھی کیل کانٹے سے لیس، اپنا تھیلا لئے موجود!

ظرافت کلام اکبر کی سب سے بڑی نقیب بھی رہی ہے اور کمال اکبر کے حق میں سب سے

---

[۵۱] لکھنؤ میں ایک عظیم الشان نمائش سرکاری اہتمام سے جنوری ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اسی نمائش گاہ کے حلقہ میں ہندوستانی اکیڈمی یو۔پی (الہ آباد) کی کانفرنس بھی ہوئی تھی۔ یہ مقالہ اسی کانفرنس میں پڑھکر سنایا گیا۔

گھر انقلاب بھی۔ یہ بالکل صحیح کہ انکے نام کو قہقہوں نے اچھالا، اور انکی شہرت کو تالیوں نے چمکایا۔ لیکن یہ بھی اسیقدر صحیح کہ دنیا انھیں ایک فالگی باز سمجھ اُن کے لطیفوں پر ٹوٹتی رہی۔ انکی شوخیوں پہ ہنستی مسکراتی، انکے چٹکلوں پر لوٹتی کھلکھلاتی رہ گئی اور کسی ایک آدھ کی گئی بھی تو وہ شمار میں نہیں، کہ جس ساز سے یہ نغمے نکل رہے ہیں وہ خود کتنے سوز میں ڈوبا ہوا ہے! یہ سب نے دیکھا کہ ایک پیر مرد شکر لپٹی ہوئی گولیاں سب کو تقسیم کرتے جاتے ہیں اور کھانے والے ہیں کہ مارے لذت و حلاوت کے اپنے ہونٹ چاٹتے جاتے ہیں۔ یہ کسی نے نہ پوچھا کہ گولیاں جراثیم کش کیسی زبردست ہیں اور ان میں تریاقیت کس غضب کی ہے[لہ]

دستانے اگر نرم اور گداز مخمل کے ہیں تو کسے پڑی ہے جو یہ ٹٹول کر دیکھے کہ اندر پنجہ گوشت پوست کا نہیں فولاد کا ہے! صاحب مثنوی معنوی کے اس رمز سے تو سب ہی آگاہ ہیں کہ وہ "سِرِّ دلبراں" "حدیث دیگراں" میں ادا کر جاتے ہیں۔ حضرت اکبرؔ نے بھی کچھ سوانگ اسی طرح کا بھرا اور جو کچھ زمانہ کے گرگٹ تیوروں کے لحاظ سے کھل کر نہ کہہ سکے اسے قہقہوں کے شور اور تالیوں کی گونج میں کہہ گئے اور عذر خواہی یہ کرتے گئے ؎

سرد موسم ہے ہوائیں چل رہی ہیں برفبار شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

فرمانے کو تو خدا جانے کیا کیا فرما گئے ہیں، مذہب اور روحانیت، اخلاق اور معاشرت، تعلیم اور سیاسیات کا کوئی گوشہ انکے دائرہ التفات سے باہر کب رہنے پایا ہے۔ اس ساری داستان کے دہرانے کی قوت کس میں؟ اور اگر کوئی ہمت کر بھی جائے تو سننے والوں کو

لہ مقالہ کی تحریر کے وقت تک حضرت اکبرؔ کی حیثیت صرف ایک ظریف شاعر کے طور پر مسلّم تھی

اتنی سکت کہاں ؟ لیکن اکبر اپنا مخصوص پیام بھی لیکر آئے تھے، ہر پھر کر، الٹ پلٹ کر، سناوہی اسی کی کرتے رہے۔ کوئی سنے یا نہ سنے اور سنکر بھی نہ سمجھے بہرحال اپنا پیام انھوں نے سناسب کو دیا۔ اسی پیام کا نام اگر نیا آئین اکبری رکھد یا گیا تو کیا کچھ بیجا ہوا؟

پیام کچھ دقیق اور پیچیدہ نہیں، کوئی غامض فلسفہ نہیں۔ سیدھی سادی بات صرف ایک لفظ میں ادا ہو سکتی ہے۔ پیام "خود داری" کا ہے مشرقی سے کہتے ہیں مشرقی رہ۔ ہندی کو تعلیم دیتے ہیں کہ ہندی بنا رہ۔ مسلمان کیلئے تلقین ہے کہ خبردار اسلام سے نہ ہٹ۔ اس ایک ترانہ کو خدا جانے کتنے دلکش نظموں میں کتنے دل آویز سروں میں بیشمار بار دہرایا ہے!

نوآموز مشرقی کو دانشگاہ فرنگ میں داخل ہوتے ہی پہلا سبق جو ملتا ہے وہ بے حیائی اور بے ناموسی کا ہے جسکا نام "استادوں" کی اصطلاح میں "حریت لنسواں" ہے۔ "صاحب" اور میم صاحب کے کھلے خزانے میل جول کو، بے پردہ اختلاط کو دیکھ کر وہ کہنے لگتا ہے کہ ہماری زندگی بھی اتبک کوئی زندگی رہی ہے، وہی گھریلو بے مزہ زندگی، وہی صبح سے شام تک ماں باپ کی اطاعت، بڑوں کی رضا جوئی۔ بھائی بہنوں کا میل جول۔ نماز اور قرآن، مسجد اور گھر کی انگنائی! زندگی نام ہے آرٹ کا۔ "فائن آرٹس" کا "پکچر گیلری" کا "ڈرامہ" کا "ڈانس" کا "سینما" کا "ٹاکیز" کا۔ اپنی بیویوں کو دوسروں کے پہلو میں بٹھانے کا دوسروں کی بیویوں کے ساتھ خود رقص کرنے کا۔ اب پردہ اسکے نزدیک سب سے بڑی "قید" ہے اور سب سے پہلے اسی قید سے وہ اپنے اسیروں کو رہا کرتا ہے۔ نتائج اور ثمرات کی تلاش اکبر کے کسی کلیات میں نہ کیجئے انھیں تو اپنے روزانہ اخبارات کے صفحات میں، عدالتوں کی کارروائیوں

میں کالجوں اور زنانہ کالجوں کے احاطوں میں اور خود اپنے گرد و پیش براہ راست اور بلا واسطہ مشاہدہ فرمالیں۔ اکبر ایک اسی قسم کے منظر سے متعلق صرف ایک سوال کر کے رہ جاتے ہیں سے

کیا گزری جو ایک پردہ کے عدو روکے پولیس سے کہتے تھے
بیوی بھی گئیں عزت بھی گئی دولت بھی گئی زیور بھی گیا

اس بے نقابی اور بے حیائی کو عقل و فہم سے جس حد تک تعلق ہو یہ جہاں تک معیار غیرت و حیا کے موافق ہے۔ اکبر اس پر کوئی ناصحانہ خطبہ نہیں ارشاد فرماتے، کوئی فلسفیانہ مقالہ نہیں سناتے، ایک رباعی میں ایک چبھتا ہوا سا فقرہ خود انھیں بیویوں کی زبان سے کہہ جاتے ہیں۔ فقرہ کو حسن قبول وہ عطا ہوتا ہے کہ اس چالیس پینتالیس سال کے اندر بے شمار بار زبانوں پر آچکا ہے۔ محفلوں کو گرما چکا ہے۔ بوڑھے تو بوڑھے بچوں میں بھی کم ایسے ہونگے جو نہ سن چکے ہونگے سے

کل بے حجاب آئیں نظر چند بیبیاں	اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپکا پردہ وہ کیا ہوا	کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

سیلاب بے عصمتی کے مقابلہ میں ہمارے اگلے بزرگوں اور مذہب و اخلاق کے رہنماؤں نے جو سب سے زیادہ مضبوط بند باندھا تھا وہ خود عورت کی شرافت تھی۔ اپنے یہاں کی شریف زادیوں کی، اپنی بہو بیٹیوں کی، حیا و غیرت کی ہم قسم کھایا کرتے تھے اور مطمئن تھے اس خیال میں کہ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے ان حیا کی پتلیوں کا آنچل بھی کوئی دیکھ سکتا ہے؟ اور اس محال کو ممکن اگر فرض بھی کر لیا جائے تو انکے بھائی اور باپ اور بیٹے اور شوہر انھیں زندہ کیوں چھوڑنے لگے؟ یہ ہمارے مردانہ خون

کی گرمی ہے کس دن کیلئے؟ آنکھ اگر بیجا اُٹھی تو آنکھ ہی نہ پھوڑ کر رکھ دی جائیگی پیر اگر بیجا پڑا تو پیر ہی نہ کاٹ کے پھینک دیا جائے گا! "تہذیب" کا لشکر جب حملہ آور ہوا تو پہلی گولہ باری ہمارے انہی قلعوں اور برجوں پر ہوئی اور "آن کی آن میں "صاحب" کے اقبال سے ہمارے یہ سب دُھس اور مدرسے مسمار! وہاں تو سبق ہی اسکا ملاکہ ابتک جن نظاروں پر اپنا خون کھولاتے تھے ان پر فخر کرو، انھیں اپنے حق میں نعمت سمجھو، ناز کرو اپنی اس خوش بختی پر کہ بام ترقی کے زینہ پر قدم رکھنے کا شرف نصیب ہو گیا ؎

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں حجاب انکو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا

اس دربارِ دُربار میں تو عزت و تقرب کا معیار ہی یہ کہ خود بھی ناچیے اور جو کل تک گھر کی ملکہ تھی اُسے بھی چہار دیواری سے باہر لا دوسروں کے ساتھ نچائیے ؎

پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا "سر" ہو گئے تو "بال" کا بھی شوق ہو گیا

"بال" انگریزی ناچ کو کہتے ہیں اور "سر" ایک انگریزی خطاب ہے اور اُردو میں "یہ سر" اور "بال" کی مناسبت کیا خوب!

زنانہ اسکول اور کالج اکبر کے زمانہ میں اچھے خاصے کھل چکے تھے اپنی قوم کی صاحبزادیوں کو "چراغ خانہ" سے "شمع محفل" بنتے اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے۔ لیکن مادی و مالی ترقی کے آثار تو اب بھی کوئی نہ تھے۔ مذہب اور روحانیت کے تخیل کو الگ رکھئے کم از کم یہ تو ہوتا کہ دنیا جنت بنگئی ہوتی، عقبیٰ چلی تو چلی دنیا ہی ہاتھ آجاتی۔ مشاہدہ اس کے برعکس ؎

ترقی کی نئی راہیں ہم پر چڑھا گئیں گھٹا کی دولت اسکیمیں بڑھا گئیں

رہیں ہمر پھر کے آیا بی نصیبن   وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

یہ نقش اول تھا کلیات حصہ اول میں نقش ثانی کلیات حصہ سوم میں ملاحظہ ہو۔ مرقع وہی آب و رنگ بیشتر سے نمائندہ

اک پیر[1] نے تہذیب سے لڑکے کو ابھارا   ایک پیر[2] نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
کچھ جوڑ تو انکے ہوئے بال[3] میں قصاں

وہ تو ہاتھ سے یوں بے ہاتھ ہوئے اور غیروں میں جذب ہو کر رہ گئے
باقی جو تھے گھرانکا تھا افلاس کا مارا

بیڑا وہ بنا کیمپ میں یہ بن گئیں آیا
مصرعہ کے الفاظ سنکر چاہے خوب ہنس لیجئے معنی پر خیال کر کے عجب نہیں جو
طبیعت رونے پر آمادہ ہو جائے ع

بی بی نہ رہیں جب تو میاں بن بھی ہما!

انجام سے

دونوں کبھی ملتے ہیں تو گاتے ہیں یہ مصرعہ   آغاز سے بد تر ہے سرانجام ہمارا
ایک مسلمہ نہیں ہندو خاتون کو نصیحت کر رہی ہیں (اور نصیحت کرتے وقت ہنستے نہیں)
کہ کہیں سرے سے لکھنے پڑھنے سے روک دینا تھوڑے ہی منظور ہے مقصود تو فرنگن بننے
سے روکنا ہے ع   پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو

---

[1] یعنی سر سید ؒ [2] شیخ محمد عبداللہ بانی گرلز کالج علیگڈھ یا جسٹس سید کرامت حسین بانی مسلم گرلز کالج لکھنؤ۔
ان دو سرے بزرگ کو حضرت اکبر پیر نسواں کہا کرتے تھے شعر میں بھی لائے ہیں سہ
ترقی بر خدا کے فضل سے ہے بزم زنداں بھی   فقط پیر مغاں تھے آگئے اب "پیر نسواں" بھی
[3] انگریزی ناچ جس میں مرد و عورت مل کر ناچتے ہیں۔

اور یاد رکھو کہ ؎

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

حد سے جو بڑھ گیا ہے تو ہے اُسکا عمل خراب
"آج" اسکا خوشنما ہے مگر ہوگا "کل" خراب

یہ کونسل اور اسمبلی اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی میں عورتوں کی ممبری کا "حق" تو اب حاصل ہوا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں ترقی کی رو یہاں تک کہاں پہنچنے پائی تھی لیکن نگاہ دور رس نے بہت سی آگے کی باتیں بھی دیکھ لی تھیں۔ پچیس تیس سال اُدھر یعنی تقریباً ۱۳ ۱۹ء و ۱۴ ۱۹ء میں ایک ٹھنڈے سانس کے ساتھ فرماتے ہیں کہ خودداری پر قائم رہنے والی نسل اب کہاں باقی ہے

چل بسے وہ جنھیں ہمدرد تھا خودداری کا
اب تو دور دورہ اُنکا ہے جو خود ہی بری طرح مغرب زدہ ہیں ع

شرم مشرق کے عدو شیوہ مغرب کے شہید

اُنکی ہنسی اور انکی خوشی تک "صاحب" کی ہنسی اور "صاحب" کی خوشی کے تابع ہے ع

رمضان ساعت کرکٹ ہے تھیٹر میں ہے عید

نئی تہذیب نئی راہ نیا رنگ جہاں
دور گردوں کی کہانی تک نئی کرتا تردید

نتیجہ یہ نکلا کہ ع
زہرہ نمبر ہوئیں دوڑتھیں جناب خورشید

دبی آواز کہا بھی جو کسی نے کہ جناب
کچھ مناسب نہیں اسوقت میں ایسی تمہید

آپ کے مردوں ہی کے کون سے کارنامے ہیں کہ اب آپ عورتوں کو بھی اسٹیج پر لانے لگے ؎

شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب وقار
کہ خواتین کو پبلک میں بھی ہو دعوت کی اُمید

اس دقیانوسیت کو اس زمانہ میں برداشت کون کر سکتا تھا ع

نعرے تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند
اور تو اور ع لڑکیاں بول اٹھیں خود بہ طریق تائید

دولہا بھائی کی ہو یہ رائے نہایت بیہودہ
ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اور شعر تو یہ کہا ہے نظم بھر کی جان ہے

خود تو گٹ پٹ کیلئے جان دیئے دیتے ہیں
ہم یہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

تماشہ کا آخری پردہ ہے

اکبر افسردہ شد از گرمی ایں طرز سخن
شیخ بگریخت و در صومعۂ خویش خزید

آدم کے نئے بیٹوں اور حوا کی نئی بیٹیوں کی زبان پر ترانۂ مسرت ہے

کھل گئی ورنہ رہا شاہد مشرق کو حجاب
غل مچا نے کا بول اٹھے یہ مغرب کے مرید

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پس پردہ تقدیر پدید

آج زندہ ہوتے تو اسوقت تک کے واقعات کو دیکھ کر خدا جانے کیا کیا کہہ گئے ہوتے۔ اسوقت بھی قطعات میں، رباعیات میں بہت کچھ تو کہہ ہی گئے ہیں۔ غزلیں تک اس پیامی شاعری سے خالی نہیں۔ ایک پرانی غزل ہے "بیبیاں کیتک" "تیلیاں کیتک" کی زمین ہے۔ اسمیں یہ گل افشانی موجود ہے —— ایک صدا ئے درد ہے کہ چین نہیں لینے دیتی کسی نہ کسی پہلو سے لب پر آہ بنکر آہی جاتی ہے ہے

اٹھائی جائیں گی پردہ میں بیبیاں کیتک
بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کیتک

جو منہ دکھائی کی رسم پر ہے مصرا بلیس
تو منہ چھپائیں گی حوا کی بیٹیاں کیتک

انجام جو ہونا ہے وہ آغاز ہی سے ظاہر ہے ہے

سنا ہے حضرت اکبر ہیں حامی پردہ
مگر وہ کیتک اور انکی رباعیاں کیتک

غزل ۱۸۹۱ء کی ہے۔ یہ ۱۹۳۴ء ہے۔ پنتالیس سال پہلے کا کشف اللہ اکبر۔
خیال نہ گزرے کہ آئین اکبری کی یہی ایک دفعہ یا اہم ترین دفعہ آزادی نسواں کا بے پناہ طوفان ہے اس آئین کا مرکزی نقطہ تو وہی خودداری ہے۔ اپنی شرافت کا تحفظ، اپنی آن بان کا تحفظ۔ جس جس مورچہ سے انھوں نے اغیار کو حملہ آور ہوتے دیکھا بس اسی سمت انھوں نے اپنے الہامی پیادوں کے پرے جما دیئے ہیں۔
پڑھ لکھ کر کون اپنے محلوں کے کھنڈروں میں پڑے رہنے پر قانع رہا ہے۔ "ولایت دیدہ" اور "صاحب رسیدہ" ہونیکے بعد کسی نے مسجد میں جاکر نماز با جماعت پڑھی ہے؟ یہ تعلیم اپنوں کو اپنانے والی ہے یا اور چھڑانے والی؟ اکبر اس منظر کو دیکھتے ہیں مگر کن آنکھوں سے؟

نہ مسجد میں نظر آئے نہ رہتے ہیں محلّوں میں ترقی پا کے بس مل جاتے ہیں بر گڈ کے گلوں میں

اگلی سادگی اور اخلاص مندی اور مرکزیت کی جگہ قدم قدم پر خود غرضی ذاتی نمود اور نفسی نفسی کا زور، اور زبان پر قومی ہمدردی کا نمائشی وظیفہ!

نہ وہ مسجد نہ جماعت نہ وہ طاعت نہ دعا نہ وہ گل ہیں نہ وہ گلشن نہ وہ سبزہ نہ ہوا
نہ قناعت نہ توکل نہ وہ خودداری ہے جاہ و ثروت کی تمنا میں گرفتاری ہے

سب سے پہلا پھندا مشرق کی گردن کیلئے یہ تیار ہوتا ہے کہ خودداری سے دستبردار ہونا پڑے پڑے لیکن ایسی با برکت، سرتا پا رحمت سرکار بھی کبھی دیکھنے میں آئی تھی؟ یہ ریل، تار، ڈاک، عدالتیں، کالونسلیں، یہ آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے والی ایجادیں پہلے کبھی خواب میں بھی نظر آئی تھیں؟ اسکا عکس اکبر کے جام جم میں ملاحظہ ہو

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں برٹش راج کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہیں

نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمق سے ۔۔۔ تمہاری عرض میں گو کچھ زیادہ طول بھی ہے
عطا ہوئی ہے وہ اسپیکروں کو آزادی ۔۔۔ کہ حاکموں میں ہے قال تو یاں قول بھی ہے
محل صدق علی ڈاک و تار کی ہے روش ۔۔۔ اگرچہ دل میں نہاں عظمت رسول بھی ہے
جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبل کی ۔۔۔ جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے
چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی ۔۔۔ کہ آنکھ محو ہے خاطر اگر ملول بھی ہے
اندھیری رات میں جنگل میں ہے رواں انجن ۔۔۔ کہ جسکو دیکھ کے حیران چشم غول بھی ہے
جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبرؔ ۔۔۔ تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اسکے ڈیم فول بھی ہے

یہی رنگ آگے چلکر اور نکھر جاتا ہے۔ اور کاغذ کے پھول خوش رنگ و خوشنما تو پہلے ہی سے تھے لیجئے اب خوشبو بھی دینے لگے ؎

کیوں نہ اپنے دل کو ہو انسے ملاپ ۔۔۔ لاٹ صاحب ہیں ہمارے مائی باپ
انکی بڑھتی سب بناتے ہیں یہاں ۔۔۔ خواہ وہ ہوں خواہ ہم ہوں خواہ آپ
ہر طرف ساماں ہیں آرام کے ۔۔۔ کھل گئی ہے ہر طرف ہر شئے کی تھاپ
ہو گئے روشن حدود آسماں ۔۔۔ علم چمکا ہو گئی تاروں کی ناپ
ساری دھرتی دب گئی سائنس سے ۔۔۔ لگ گئے پائپ گیا دنیا سے پاپ
حضرت واعظ ہیں راضی رقص پر ۔۔۔ دیر ہے کیا اب پڑے طبلہ پہ تھاپ

اپنی اصل اور اپنی نسل پر شرمانے والے بھائی بند آپکی نظر سے بارہا گزرے ہونگے بس کی بات نہیں ورنہ یہ اپنے چہرہ کے رنگ کو چھیل کر پھینکدیتے۔ اپنے ماں باپ کا نام بدل ڈالتے اپنی قومیت وطنیت سب دیسی سے ولایتی بنا لیتے۔ اکبرؔ کی نظر انسانیت کے ان مسخ شدہ نمونوں پر پڑتی ہے ان بیچاروں کی مغرب زدگی پر وہ ترس

نہیں کھاتے۔ کچھ زیادہ غصّہ کبھی نہیں کرتے مسکرا کر رہ جاتے ہیں تبسّم کی یہ جھلملاہٹ
سمجھنے کے قابل ہے ؎

مشرق میں ولادت پر راضی نہ تھے یہ بندے | چارہ ہی مگر کیا تھا فطرت جو یہاں جن دے
جو جسکے مناسب تھا گردوں نے کیا پیدا | یاروں کیلئے عہدے، چڑیوں کیلئے پھندے

مسکراہٹ کی جلوہ نمائی ہو چکی اب ذرا ہنسی کی کھکھلاہٹ ملاحظہ ہو معنی کی
کی طرف جائیے تو تمام تر رقّت و مرثیت، اور ظاہر تک رہئیے تو ظرافت ہی ظرافت۔
مدت کی بات ہے، امیر خسروؒ کبھی کوئے محبوب میں گدائی کیلئے نکلے تھے اور ایک صدا
لگاتے چلے گئے تھے۔ اکبرؔ نے وہی پرانا خرقہ نکال کر جا بجا پیوند لگا پہن لیا۔ ہاتھ میں
کشکول گدائی وہی، لب پر صدائے فقیرانہ وہی۔ لیلائے تہذیب پر جان قربان
اور ایمان نثار کرنے چلے ہیں اور الاپتے جا رہے ہیں ؎

اے شوق وضع مغربی در ما فگندہ ای تری | ہر چند مشقت میکنم لیکن تو زاں بالا تری
شیخم شہید جلوہ ہا افتادہ در کمپ شما | باشد کہ از بہر خدا سوئے شہیداں بنگری
سحر نگاہت ناز من مرکوز طبعت راز من | ہر نغمہ ات بر ساز من حقا عجائب دلبری
تو سینہ گشتی، دل شدم ٹیچر شدی پوپل شدم | تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری
ہر چند با تو بستہ ام از طعن اکبرؔ خستہ ام | للّٰہ لطف خاص کن پیدا بحق بیچری

شراب طہور کا مزہ کہتے ہیں کہ اسی دنیوی شراب کا سا ہوگا، یہی تندی
یہی تیزی، یہی جوش و خروش۔ اثرات اس سے بالکل الگ نہ کسی قسم کا نشہ نہ زوال
عقل نہ خمار نہ گرانی ـــــ اکبرؔ کے خمخانہ میں اس شراب طہور کے جام پر جام جتنے
چاہیئے چڑھائے چلے جائیے۔

خودی کی بقا خود داری کے تحفظ کے لئے جو کچھ کہنا ہے محض مسلمانوں ہی سے بطور سرگوشی نہیں کہتے۔ ہندوؤں مسلمانوں کے بھرے مجمع میں سب کو سنا کر کہتے ہیں اور بعض دفعہ تو رخ بالکل ہندوؤں کی طرف پھیر کر کہتے ہیں ؎

ہوٹل سے بھلا پرہیز تمھیں اب پنڈت جی مہاراج کہاں
سچ بات کہی جس نے یہ کہا جب لاگ لگی تب لاج کہاں

اور کبھی ہندو بھائی بندوں میں ایسا گھل مل جاتے ہیں کہ انکے غیر معلوم ہی نہیں ہوتے بلکہ انکے اپنے ہی نظر آنے لگتے ہیں ؎

زبان سنسکرت اسوقت پنڈت جی سے کہتی ہے
کہ اچھا ہے مری الفت تمہارے دل میں رہتی ہے
میں خوش ہونگی پلا شک تم اگر مجھکو جلاؤ گے
مگر وہسکی پلاؤ گے کہ گنگا جل پلاؤ گے

خوب جانتے ہیں کہ دربار فرنگ میں قدر نہ مسجد کی نہ مندر کی، پرستش نہ ملا کی نہ برہمن کی۔ اس سرکار میں تو ایک ہی اعزاز ہے، خلعت غلامی! اور اس رجسٹر میں تو قومیت کا ایک ہی خانہ ہے۔ نیٹو یا کالا آدمی! وہ تمامتر عیش منائیں ہم آپ صرف ہل چلائیں۔ وہاں تمامتر خواجگی و حکومت، یہاں سرتا سر تشنگی و عبودیت۔ انکی کوٹھیوں میں زر و جواہر کے خزینے، اپنی جھونپڑیوں میں مشقت و چاکری کے پسینے! یہ منظر ہم آپ سب ہی ہر روز دیکھتے ہیں۔ اکبر کی زبان سے سنئے تو یہی ٹریجڈی کامیڈی بن جائے اور حزنیہ گھڑی بھر کے لئے طربیہ میں تبدیل ہو جائے ؎

سمجھا رہے تھے مجھکو گمٹ کی وہ گردشیں
خود کر رہے تھے ناک کی ٹٹی سے سازشیں
نقشے میں دیکھتا تھا وہ پیتے تھے جام مے
میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے
ہیں خود تو مست بادۂ عشرت کے خم سے آپ
الجھا رہے ہیں مجھکو ستاروں کی دم سے آپ

بولے کہ اس زمین میں کوئی اور شعر بھی — میں نے کہا یہ بات مرے ذہن میں بھی تھی
اللہ رے ارتقائے سگانِ درِ حضور — کل تو ستم ہوئے تھے، ہوئے آج تم سرآب
ہنس کر دیا انھوں نے الٹ بحث کا ورق — گانے لگے وہ گیت میں پڑھنے لگا سبق

یہ کونسل، اسمبلی، الکشن، ووٹ کے رنگا رنگ و خوشنما کھلونے اس بڑی تعداد میں تو اب نکل پڑے ہیں لیکن انکی اچھی خاصی کھیپ اکبر کے زمانہ میں بھی ولایت سے آچکی تھی اور ہندوستان بہت سی بازیوں کے بعد اس نئی بازی کی بساط پر جمکا ہوا کھیل میں غرق دنیا و آخرت دونوں کو بھول چکا تھا —— اکبر ان کھلونوں سے دل لگاتے تو کیا البتہ جی بہلایا ان سے خوب ہی جو کچھ اپنی عینک سے دیکھتے دوسروں کو بھی دکھانا چاہتے —— یہ اور بات ہے کہ دیکھتا کون ہے یہاں سرے سے دیدۂ بصارت ہی غائب ہو چکا تھا۔

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا — اچھے اچھے ووٹ پہ شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ — اسکو سمجھیں فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی — سلف گورنمنٹ آگے آئی
پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر کی — ووٹ کی دھن میں بن گئی پھرکی

یہی راگ ایک دوسری دھن میں ہے

ہر سمت مچی ہوئی ہے ہل چل — ہر در پہ یہ شور ہے کہ چل چل
ٹمٹم ہو کہ گاڑیاں کہ موٹر — جسپہ دیکھو لدے ہیں ووٹر
قسمت ہی وہ ہے یا یہ ممبری ہے — آخر کیا شے یہ ممبری ہے
نیٹو ہے نمود ہی کا محتاج — کونسل تو ہے انکی ہی جنکا ہے راج

ہم لوگ جو اسمیں پھنس رہے ہیں | اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں
درِ اصل نہ دین ہے نہ دنیا | پنجرے میں پھدک رہی ہے مینا

یہی تصویر ایک اور رُخ سے ؎

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے | خدا کی مار ہو ووٹوں کی مار کم کیا ہے

باتیں کہتے تو سب ہی کے کام کی لیکن قدرتاً اپنی جماعت اور قوم (مسلمانوں) کا غم اور زیادہ کھائے جاتا۔ اپنی آنکھوں سے ہر وقت دیکھتے کہ کیا سے کیا ہوئے جا رہے ہیں۔ قدم بجائے کدھر کے کدھر پڑتے جا رہے ہیں۔ دل روتا مگر چہرہ ہنستا ہوا بنائے۔ غم کی گھٹن کوشش تھی کہ قہقہوں کی گونج میں دب کر رہ جائے۔ لکچروں میں ترقی کا شور سن سنا خود بھی اپنے ہم قوموں کو ترقی کے طریقوں پر ایک طویل لکچر دینا شروع کر دیتے ہیں ؎

پیدا ہوئے ہیں ہند میں اس عہد میں جو آپ | خالق کا شکر کیجئے آرام کیجئے
بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم | تحصیل انکی بھی سحر و شام کیجئے
یورپ میں پھر آئیے پیرس و لندن کو دیکھئے | تحقیق ملک کاشغر و شام کیجئے
ہو جائیے طریقۂ مغرب پہ مطمئن | خاطر سے محو خاطر انجام کیجئے
الفاظ کفر و فسق کو بس بھول جائیے | ہر ملت و طریق کا اکرام کیجئے
رہیئے جہاں میں وسعتِ مشرب سے نیکنام | مجھکو مرید ہندوؤں کو رام کیجئے
رکھئے نمود و شہرت و اعزاز پر نظر | دولت کو صرف کیجئے اور نام کیجئے
سامان جمع کیجئے کوٹھی بنائیے | با صد خلوص دعوتِ حکام کیجئے
یاران ہم مذاق سے ہم بزم ہو جئے | تکمیل شوق پستہ و بادام کیجئے

نظارۂ مسان سے تر و تازہ رکھئے آنکھ | تفریح پارک میں سحر و شام کیجئے
زنجیر فقہ توڑیئے کہکر خلاف شرع | مضمون لکھئے دعوئی الہام کیجئے

اور شعر یہ کہا ہے ؎

مذہب کا نام لیجئے عامل نہ ہو جیئے | جو متفق نہ ہو اسے بدنام کیجئے

اسکے بعد قدرتاً بس اتنا ہی کہنا رہ جاتا ہے ؎

لیکن نہ ہیں پڑیں جو یہ باتیں حضور سے | مُردوں کے ساتھ قبر میں آرام کیجئے

درد آشنا دلوں سے پوچھئے کہ اس تصویر میں کچھ بھی مبالغہ ہے؟ اس شاعری میں کہیں سے بھی "شاعری" ہے؟ آج ہمارے علم، ہمارے ادب، ہماری زبان، ہمارے مذہب، ہماری شرافت، ہماری تاریخ، کسی کی کچھ بھی وقعت ہے، عزت ہے، اہمیت ہے، جبتک کہ "صاحب" کی منظوری، تصدیق اور خوشنودی کی چھاپ اسپر نہ لگی ہو؟ بس ایک "صاحب" کی بات بالا اور اسکے علاوہ سب کچھ ہیچ۔

اکبر اپنی اس ہیچ میرزی کو خوب ہی محسوس کرتے ہیں ؎

دورِ فلک کا ماجرا آپ سے کیا بیاں کریں | تفرقہ دیکھئے ذرا ہم یہ پڑے عجیب بےل
جان سپرد ڈاکٹر، مال سپرد آنجناب | عقل سپرد ماسٹر، روح سپرد ڈارون

زندگی کا کوئی ایک شعبہ ہو تو کہا جائے یہاں تو ساری کی ساری زندگی اسی غلامانہ ذہنیت یا آجکل کی اصطلاح میں اسی (INFERIORITY COMPLEX) کی نذر۔ فرنگستان کی باٹا کمپنی معزز، اپنے ملک کا بڑا سا بڑا موچی محض موچی۔ ہوٹل لُٹا ہوا سہی اسکا کارندہ بہر حال منیجر۔ سرا بڑی سی بڑی بھی ہو اسکا مالک بیچارہ محض بھٹیارہ! گلی ڈنڈے کا نام آئے تو آپ شرما جائیں، کرکٹ اور ہاکی ٹیم کی

کپتانی کا عہدہ پیش ہو تو چہرے فخر و مسرت سے جگمگا اٹھیں۔ فقیہہ ہونا گویا ملائیت کے مترادف، ایڈوکیٹ اور بیرسٹر ہونا اعزاز و مرتبہ کا پروانہ! غرض اپنی اعلیٰ وادنیٰ، بڑی اور چھوٹی ہر چیز اسی دماغی مرعوبیت کا شکار رہ اسی ذہنی غلامی کی پیداوار! حضرت اکبر خود داری کے اس قحط کو، اغیار کے اس ہمہ گیر تسلط کو دیکھ کر تڑپ جاتے ہیں لیکن کمال ضبط یہ ہے کہ دل کی دُکھن کو بھی ظرافت کی پھلجھڑی بنا کر پیش کرتے ہیں ؎

مرزا غریب چپ ہیں انکی کتاب ردی ۔۔۔ بدھوا کڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

اور پھر ردیف قافیہ اور وزن بدل کر ؎

میرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں نہ بھائی خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اسکو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں

صاحب کی زبان سے طعنے بارہا مل چکے کہ ہندوستانی طلبا سب کچھ پڑھ لکھ چکنے کے بعد بھی وہ کلچر، وہ آراستگی خیال اپنے اندر نہیں رکھتے ہیں جو فرنگی زادوں میں گھر گھر موجود ہے۔ اس طنز کے محققانہ اور سنجیدہ جوابات تو بارہا ہو چکے ایک لطیف جواب اکبر کی زبان سے سُنئے۔ یہ طرز جواب حصّہ ہے اکبر کا ؎

کر چکا جب کالج میں میں تکمیل فن ۔۔۔ تب یہ بولے مجھسے مسٹر مارسین
گو کہ شہرت ہے تمھاری دور دور ۔۔۔ مجھسا تم رکھتے نہیں عقل و شعور

استاد کے طعن کے جواب میں شاگرد عرض کرتا ہے کہ حضور معاف یہ خطا کس کی ہے شاگرد کی یا استاد کی ؎

آپنے سیکھا ہے اپنے باپ سے ۔۔۔ اور مینے جو پڑھا وہ آپ سے

مغربی استادوں کی زبان سے چند الفاظ ہمنے سیکھ لئے ہیں کچھ بے معنی سے۔ زبانوں پر وہی رٹا ہوا آموختہ رہتا ہے اور دل انہی مقاصد لاالعینی کی دھن میں سرگرم۔ تعلیم، اعلیٰ تعلیم، جبری تعلیم، آزادی ترقی، روشن خیالی، ارتقا، یہ چند منتر ہیں جنکے مسحور کن اثر سے کون واقف نہیں۔ اکبر نے ان میں سے دو لفظ چندہ اور اسکول انتخاب کر لئے اور انھیں ایک مخمس کی ٹیپ بنا ان سے خوب خوب کام لئے ہیں ؎

بکری کو ساگ پات کا سودا نہیں رہا ۔ بنگالیوں کو بھات کا سودا نہیں رہا

چوروں کو اپنی گھات کا سودا نہیں رہا ۔ اور شاطروں کو مات کا سودا نہیں رہا

اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

بنیوں کو اخذ سود کی فرصت نہیں رہی ۔ منعم کو داد و جود کی فرصت نہیں رہی

لڑکوں کو کھیل کود کی فرصت نہیں رہی ۔ کودن کو غت ربود کی فرصت نہیں رہی

اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

اسی طرح برابر ٹیپ پر ٹیپ جماتے چلے گئے اور خاتمہ پر فرماتے ہیں ؎

پنڈت براجا کے بنارس یہ آرہے ۔ مرگٹ کے شیخ شہر بھی نوئیس یہ آرہے

حالی غزل کو چھوڑ مسدس یہ آرہے ۔ ہم فرد تھے سو ہم بھی مخمس یہ آرہے

اور اک اگر صحیح رہتا تو پھر بھی امید اصلاح تھی لیکن جب سرے سے اور اک ہی غلط ہو جائے۔ سفید، سیاہ اور سیاہ سفید نظر آنے لگے اور تعلیم قلب کی قلب ماہیت کر دے اور اکبر ہی کی پیشگوئی ؏ دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے واقعہ بنکر رہے تو پھر علاج کس کے بس میں رہجاتا ہے؟ اکبر کو حیرت بار بار اسی اُلٹی سمجھ پر ہوتی ہے اور دعوت وہ اسی کی دیتے ہیں کہ صحیح غور و فکر کرنا سیکھو، اور اندھیرے میں وہم کو حقیقت کا درجہ نہ دے بیٹھو، یہ سارا دلفریب منظر ترقی محض سراب ہے یا حقیقتاً جوئے آب؟

تہذیب تو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبر
دنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے
نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت سے ملکے دیکھو
کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گزر رہی ہے
دل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردد
کیا یہ چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

شاعر، ظریف شاعر، بھی بہرحال انسان ہی ہوتا ہے دل میں ناسور پڑ چکے ہوں تو بشرہ کو ہنستا مسکراتا ہوا کب تک رکھا جا سکتا ہے۔ دل کی کسک آخر پورے زور کیساتھ زبان پر آکر رہیگی۔ خود داریوں کا خون روزانہ اپنے گرد و پیش ہوتے ہوئے دیکھ شاعر کا دل خود خون ہو چکا ہے۔ اپنے عشرتکدہ کے کھنڈر پر آکر رکتا ہے۔ در و دیوار کی گری ہوئی ایک ایک اینٹ حسرت و یاس کی نگاہوں سے دیکھتا ہے دل بھر آتا ہے لب پر آہ سرد ہے اور زبان پر دھیمے سروں میں یہ مرثیہ ؎

پیر و مرشد نے کیا قوم میں بچپن پیدا
وہ یہ سمجھے تھے کہ ہو جائیگا جوبن پیدا
وہ تو پیدا نہ ہوا ہاتھ سے لڑکوں کے مگر
ہو چلے دین کی دیوار میں روزن پیدا

اور اس مرثیہ کے سلسلے میں پھر کہتے ہیں ؎

پستی قوم کے جب آ گئے دن اے اکبر
اونچے درجوں میں ہوئے عقل کے دشمن پیدا
باپ کے خون سے جو ہوگی حمیت زائل
ہو نگے اطفال بھی بے غیرت و کودن پیدا
صورت برگ خزاں دیدہ بکھر جینگے اڑتے
نہ بہار آئے گی پھر ہوگا نہ گلشن پیدا
کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ
کون کہتا ہے نہ کر حسرت لندن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول
راہ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا
قوم، قوم اٹھ پھر سنتے ہیں ہم قوم کہاں
تار باقی نہیں تو کرتا ہے دامن پیدا
مذہبی شاخ فقط ہے تری قومی ہستی
یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا

سلف رسکٹ کا پھر یاد رہیگا نہ سبق ‏ ‏ ‏ ‏ پھر نہیں ہونیکی یہ بحث تو دمن پیدا
بزم تہذیب سے ہوجائیں گے قطعاً خارج ‏ ‏ ‏ ‏ حس ہی باقی نہ رہیگا کہ ہو شیون پیدا

آئین اکبری کا آپ آغاز دیکھ چکے اب انجام ملاحظہ ہو۔ بچپن کی شوخیاں بڑھاپے کی جھڑکیوں سے کوئی مناسبت رکھتی ہیں؟ شادیانوں کی دھوم مچ چکی اب نوحہ کے بول بھی کانوں میں پڑ جائیں۔ آج ۱۹۳۷ء میں ہم کو آپکو جو کچھ چشم خود نظر آ رہا ہے شاعراست و حکیم ملت کی نگاہ کشفی نے اسے ۳۰-۳۵ سال قبل ہی صفائی کے ساتھ پڑھ لیا تھا۔ آنکھیں گم ہوئی جاتی ہیں دل کچھ بیٹھا سا جاتا ہے اور جو کچھ خود دیکھ رہے تھے دوسروں کو دکھاتے جا رہے ہیں ؎

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہونگے ‏ ‏ ‏ ‏ نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے
نئے عنواں سے زینت دکھائینگے حسیں اپنی ‏ ‏ ‏ ‏ نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہونگے
نہ خاتونوں میں رہ جائیگی پردہ کی یہ پابندی ‏ ‏ ‏ ‏ نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہونگے
بدل جائیگا انداز طبائع دور گردوں سے ‏ ‏ ‏ ‏ نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہونگے
عقاید پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے ‏ ‏ ‏ ‏ نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہونگے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی ‏ ‏ ‏ ‏ لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے
بدل جائیگا معیار شرافت چشم دنیا میں ‏ ‏ ‏ ‏ زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا ‏ ‏ ‏ ‏ ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے
تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر ‏ ‏ ‏ ‏ بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

انقلاب دہر اپنے وقت پر بہرحال آیا۔ آگیا وہ دن کہ غم کھانے والا اکبر نہ رہا اور آرہا ہے وہ دن کہ خود اس نئے آئین اکبری کا تیار کرنیوالا بھی نئے سرے سے پرانا ہوا ہوگا نسیاً منسیاً ہو چکا ہوگا۔

(۳) ایک سچا قصہ[1]

کچھ کم تیس سال کا ذکر ہے۔ فرنگی تہذیب ساری مہذب دنیا کو مسخر کر چکی ہے اور ہندوستان کے طول و عرض میں "صاحب" اور "میم صاحب" کے تمدن کی حکومت ہے۔ شہر میرٹھ میں ایک انیگلوانڈین (پرانی اصطلاح میں یوریشین) لفٹنٹ کلارک ڈاکٹر کی حیثیت سے (اسوقت کے انڈین سب آرڈینیٹ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں) تعینات ہیں۔ عمر قریب چالیس سال کے۔ توانا و تنومند، جذبات نفسانی سے معمور، اخلاق روحانی سے کورے۔ میم صاحبہ سن میں ۱۰سال بڑی اور پھر اس پر لاغر و بیمار۔

اسی شہر میں قیام ایک اور صاحب بہادر مسٹر اڈورڈ فلہم کا ہے، یہ سرکار کے محکمہ حسابات فوجی (ملٹری اکاؤنٹس) میں ڈپٹی اگزامنر کے عہدہ پر ہیں۔ عمر ۴۸ سال کی۔ میم صاحبہ خالص ولایتی۔ ۴۰ سال کے سن کی حسن و جمال میں مشہور۔ سوسائٹی میں مقبول۔ میاں، بیوی بچے سب خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ۱۹۱۰ء کا ذکر ہے کہ مسز فلہم کے ہاں بچہ ہونے والا ہوتا ہے۔ مرد ڈاکٹر سے مہذب سوسائٹی کی عورت کو کیا شرم، بجائے کسی لیڈی ڈاکٹر کے خود لفٹنٹ کلارک بچہ جنانے آتے ہیں۔ اور زچہ کی برہنگی کے جو نظارے دائیاں جنائیاں کرتی ہیں، خود ہی کر جاتے ہیں۔ اب فریقین کی آنکھ لڑ جاتی ہے۔ اور میم صاحبہ کنواری نہیں شادی شدہ صاحب اولاد عین زمانہ زچگی" میں ڈاکٹر صاحب پر فریفتہ ہو جاتی ہیں! — قربان جائیے اس نفاست خیال و پاکیزگی جذبات کے!

---

[1] صدق ۱۵ر فروری ۱۹۳۹ء

چند روز بعد کلارک کا تبادلہ دہلی ہوجاتا ہے لیکن دہلی اور میرٹھ کے درمیان فاصلہ ہی کتنا رجب دیکھئے ڈاکٹر صاحب اپنے اعلیٰ وسنجیدانہ جذبات کی تسکین کیلئے میرٹھ موجود۔ اور جن دنوں یہ ممکن نہ ہو تو ہجر کے دن اور فراق کی راتیں گزارنے کے لئے ڈاک سے سلسلہ، نامہ و پیام۔ بیسویں صدی کے اس "مجنوں" کے پیامات شوق تو لیلیٰ نے فرط زیرکی سے ضائع کردیے۔ لیکن میاں مجنوں اتنی پیش بینی اور پیش بندی سے محروم اپنی لیلیٰ کے خطوط گڈ کے گڈ جمع کرتے گئے۔ اور ان خطوط کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ عریانی جذبات کے لحاظ سے بھلا کیا کوئی فرضی وافسانوی "لیلیٰ کے خطوط" ان خطوط کا مقابلہ کریں گے ——— ڈاک کا پتہ کلارک کے بھیجے ہوئے خطوط پر بجائے مسز فلہم کے مسز کلارک، لکھا ہوتا تھا۔ اور میم صاحبہ خود بنفس نفیس ڈاکخانہ جاکر انھیں وصول کیا کرتی تھیں۔

کچھ روز بعد کلارک کا تبادلہ آگرہ ہوتا ہے اور "عشق" کا نام تو اس کھلی ہوئی بہیمیت کے لیے لیکر عشق کی مٹی پلید کیجئے نہیں ہاں نفس پرستی البتہ کہہ لیجئے) ناپاک نفس پرستی کی آگ ہے کہ تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ لیکن شوہر کا وجود بہر حال راہ کا کانٹا بنا ہوا۔ شیطان نے پٹی پڑھائی کہ یہی قصہ کیوں نہ پاک کردیا جائے ڈاکٹر جس کا کام جان بچانا سمجھا جاتا ہے اس کے لئے جان لینا کون سی مشکل بات ہوسکتی تھی؟ رائے یہ ٹھہری کہ سنکھیا کی ایک پڑیا میم صاحبہ کے ہاتھ میں پہنچ جائے اور بھولے شوہر کو وہ بہت ہی ہلکی ہلکی مقدار میں دی جانے لگے۔ اس میں وقت تو خیر کچھ ضرور لگ جائے گا۔ لیکن تدبیر بیٹ نہیں پڑنے کی۔ عمل شروع ہوجاتا ہے اور کوئی ڈھائی مہینے کی مدت بیت جاتی ہے۔ عورت تہذیب جدید

سے آراستہ و پیراستہ عورت، آخر کب تک نتیجہ کا انتظار کرے! خطوط میں تقاضہ پر تقاضے ہونے لگے کہ تمھاری "صبر آزما" مدت تو میری جان لیکر رہے گی۔ خدا کے لئے کوئی صورت فوری گلو خلاصی کی نکالو"

نفس کی ماری، عقل کی اندھی عورت کو تو سجھائی نہ دیا لیکن زہر ہلاہل اندر ہی اندر اپنا کام کر رہا تھا۔ فلہم صاحب رخصت بیماری لے کر مسوری تبدیل آب ہوا کے لئے گئے۔ اِدھر کلارک کو منہ مانگی مراد ملی ـــــ اتنے دنوں کے لئے قیام میرٹھ ہی میں کر لیا۔ مدتوں کا ڈاکٹری تجربہ کام آیا۔ شیطان کے فضل و کرم سے ایک ایک عرق ملے پایا جسکے پینے سے مریض پر علامتیں بالکل وہ طاری ہوجائیں جو گرمی میں لو لگ جانے سے پیدا ہوجاتی ہیں ـــــ ۲۷ جولائی ۱۹۱۱ء کو فلہم کے حلق سے پہلی خوراک اس عرق کی "اتری اور معاً طبیعت بگڑی۔ مقامی ڈاکٹر آئے اور لو لگ جانے کا نسخہ لکھ گئے۔ علاج جاری تھا کہ سفاک بیوی نے دوسری خوراک بھی پلا دی۔ طبیعت اور زیادہ نڈھال ہوئی۔ مریض میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہوا اور ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ مریض اب کام کے ناقابل ہو گیا ہے۔ ملازمت سے سبکدوشی اسی وقت ہو گئی۔

حسرت نصیب شوہر کی رائے ہوئی کہ اب وطن مالوف انگلستان کو چل کر بقیہ زندگی وہیں بسر کی جائے۔ میم صاحبہ نے کہا کہ آگرہ سے بہتر کوئی سرزمین نہیں۔ قضائے الٰہی نے مہر تصدیق اسی رائے پر ثبت کر دی۔ ۸ نومبر ۱۹۱۱ء کو یہ جوڑا آگرہ منتقل ہو آیا، اور ۱۰ نومبر ۱۹۱۱ء کو وہی مہلک عرق شوربہ اور گوشت میں ملا کر دیا گیا، اور ابکی مرتبہ علاج کے لئے خود ملک الموت یعنی ڈاکٹر کلارک تشریف لائے۔

آکر ایک انجکشن دیا اور تھوڑی دیر میں فلہم غریب قید ہستی سے آزاد ہو گیا۔ دس برس کی بیٹی مرتے دم حاضر تھی۔ مرنے والے نے اسے تسلی دلاسا دیا۔ کہا کہ "اپنے چھوٹے بھائی کو کھلاتی رہنا اس سے کہنا ضدیں نہ کرے۔" باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی ماں کی طرف سے بیٹی کو ہدایت ہوئی خبردار کسی سے اسکا ذکر نہ آنے پائے۔

مسز فلہم اب آزاد تھیں۔ چند ہفتے خوب رنگ رلیوں میں گذرے۔ لیکن ابھی تو صرف پیر کی بیڑی کٹی تھی ہاتھ کی ہتکڑی ابھی باقی تھی۔ نزار و نزار مسز کلارک کا وجود تو ابھی بہر حال تھا اور وہ کھٹک پیدا کئے ہوئے تھا —— ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیاہتا بیوی فرنگی تہذیب و قانون میں کہاں جائز؟ —— اب تڑپ تھی تو اسکی کہ یہ دوسرا کانٹا بھی راہ سے دور ہو۔ زہر والی مجرب ترکیب دماغ میں حاضر تھی۔ عمل مسز کلارک پر شروع ہوا اگر اب کی یہ تدبیر کچھ زیادہ چلی نہیں۔ زیادہ تیز اور قوی زہر افشائے راز کے خیال سے خلاف مصلحت نظر آیا ہو۔ بہر حال اب کی قرعۂ انتخاب ایک دوسری ترکیب پر پڑا۔

قاتل آخر کرایہ پر بھی تو مل جاتے ہیں —— سنو کی رقم میں پانچ پیشہ ور خونیوں کا جتھا کرایہ پر مل گیا۔ طے یہ پایا کہ رات کو یہ لوگ بنگلے پر حملہ آور ہوں اور میم صاحبہ کا کام تمام کرکے کچھ سامان بھی لوٹ لے جائیں تاکہ صورت معاملہ بالکل ڈکیتی کی رہے۔ سنو کی رقم کلارک کی جیب سے نہیں مسز فلہم کے بنک کے کھاتہ سے برآمد ہوئی۔ نومبر ۱۲ء کی ۱۷ تاریخ تھی کہ پانچوں قاتل کلارک کے بنگلہ میں داخل ہوئے۔ کلارک خود اسٹیشن چلا گیا تھا، ایک فرضی دوست سے ملاقات کا بہانہ کرکے۔ دیر کے بعد جب لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ گھر کے وفادار کتے نے قاتلوں کا راستہ

روک رکھا ہے! خود بکڑ کر کتے کو الگ بند کیا۔ قاتل سونے کے کمرے میں آئے اور دم بھر میں مسٹر کلارک کو تلوار سے پارہ پارہ کر دیا!

مسز فلہم نفس پرستی کی خوشی میں مست کہ اب آخری رکاوٹ بھی دور ہو گئی اور آئندہ عیش ہی عیش ہے۔ تقدیر اس فیصلہ پر ہنسی۔ پولیس کے ہاتھ اس برگشتہ بخت عورت کے عاشقانہ خطوط کا ذخیرہ پڑ گیا۔ قرائن و قیاسات موجود ہی تھے۔ پورا بھید خطوط نے کھول دیا۔ فلہم کی نعش قبر کھود کر نکالی گئی۔ ڈاکٹری معائنہ ہوا جسم سے زہر کے ذرات برآمد ہوئے۔ ۲۷ فروری ۱۹۱۳ء کو فلہم کے قتل کا مقدمہ اور ۱۰ مارچ کو مسٹر کلارک کے قتل کا دوسرا مقدمہ چلا۔ پہلے مقدمہ میں کلارک اور مسز فلہم دونوں ملزم تھے۔ دوسرے میں علاوہ ان دونوں کے چاروں کرایہ والے قاتل تھے۔ پانچواں قاتل اقبال جرم کر کے سرکاری گواہ بن گیا۔ مجسٹریٹ۔ سشن۔ ہائیکورٹ کی منزلیں چند روز میں پوری ہو گئیں۔

جرم دونوں پر ثابت سزائے موت کا حکم دونوں کو ملا۔ کلارک معہ تین قاتلوں کے (جو تھے ملزم کے خلاف شہادت پوری نہیں بہم پہنچی اسلئے اُسے شک کا فائدہ دے کر چھوڑ دیا گیا) اسی وقت پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ مسز فلہم حمل سے تھی جیل میں رکھی گئی۔ چند روز کے بعد ولادت ہوئی اس کے بعد بیمار پڑی اور دنیا سے رخصت ہو گئی!

حضرت اکبر الہ آبادیؒ کے کلیات حصہ سوم (ص ۱۵۲-۱۵۳) میں ایک طویل نظم اسی واقعہ کے متعلق ہے۔ اس نثر کے بعد اس نظم کا پورا لطف اب انشاء اللہ آئے گا۔ ملاحظہ ہو ؎

حالِ مسنز کلارک و مسٹر فلم کھلا
تھا کل بیانِ پیشِ عدالت کھلم کھلا

اِن کو گرایا قتل اور اُن کو پلایا زہر
تہذیبِ مغربی کی یہ تکمیل اور قہر

پردے پر اعتراض ہو اور زہر ہو روا
پالیگمی[1] پہ طعن ہو اور یہ ستم روا

فتنہ کا ہے قصور نہ مفتوں کا قصور
سب کچھ ہے یہ خرابی قانون کا قصور

پردہ نہیں طلاق میں آسانیاں نہیں
جائز کہیں تعددِ ازدواج یاں نہیں

فطرت کا اقتضا جو ہے کس طرح وہ رُکے
پھر کیوں گناہ و جرم کی جانب نہ دل جھکے

آسان ہو طلاق تو دل شاد کیجیے
بے قتلِ غیر اپنا گھر آباد کیجیے

پردہ جو ہو تو ایسے مواقع بھی کم ملیں
کیوں بزمِ مے میں شوخ نگاہیں بہم ملیں

قانونِ مغربی میں روا ہو اگر نکاح
پھر کیوں یہ قتل نہ وجہِ اولیٰ کا ہو مُباح

---

[1] تعدد ازدواج POLYGAMY

جب پردہ و طلاق و تعدد روا نہیں
پھر بد معاشیوں کے سوا کچھ دوا نہیں

جانیں ہزاروں جاتی ہیں بچے بلکتے ہیں
مستانِ مے جگہ سے بھلا کب سرکتے ہیں

مغرب کا دل جو خواہر مشرق کے ساتھ ہے
یہ بھی گھروں میں انکے لئے ملتی ہاتھ ہے

اکثر یہی ہے حالت قانونِ مغربی
آزادیوں کی قید میں روح انکی ہے پھنسی

بس ظاہری نمود چمک اور ادا میں ہے
دل کی خبر نہیں ہے کہ وہ کس ہوا میں ہے

پکچر ہے اس طرف تو ادھر بہشتی بھی ہے
اس سمت ناچ ہے تو ادھر خودکشی بھی ہے

تعلیم عورتوں کی ضروری ہے لا کلام
لیکن جو یہ اثر ہے بس دور سے سلام

ہم کو کمال شوق ہے تعلیم دیجئے
لیکن کچھ اپنے گھر کی بھی اصلاح کیجئے

ہم فائدہ اٹھائیں گے مغرب کے راج سے
لیکن پناہ مانگیں گے ایسے رواج سے

---

(۱۴) ایک مختصر سا پیام

یوم اکبر منانے والوں کے نام[1]

سنہ ۱۹۱۲ء ہے اور مہینہ غالباً اپریل کا۔ لکھنؤ میں ابھی یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی ہے صرف ڈگری کالج ہیں۔ ایک طالب علم۔ بی اے کا امتحان دینے لکھنؤ سے الہ آباد پہنچتا ہے اور اپنی پہلی فرصت میں یہی نوجوان، خبر میلا، اور بڑوں کی صحبت میں بیٹھنے والا، شوق کے پیروں سے چلکر اور اشتیاق کے پروں سے اڑکر عشرت منزل[2] جا حاضر ہوتا ہے۔ پیر ظریف کا سن کوئی ۶۶ سال کا۔ جسم لاغر و نحیف، چہرہ دبلا اور دبلے چہرے پر جھریاں، لباس سادہ، وضع و معاشرت سادہ۔ ایک وسیع برآمدہ اس میں ایک آرام کرسی پر نشست، آنکھوں پر عینک، آنکھیں عینک کے اندر سے چمکتی ہوئیں۔ قدرتی نہیں ڈاکٹر کے ہاتھ کی قدح کی ہوئیں، اسپر بھی پرنور گفتگو لطیفوں سے پُر، ظرافت سے معمور، بشرہ سے ذہانت کا ظہور۔ خود کم ہنستے

---

[1] عالم پور (دکن) میں غالباً سنہ ۱۹۴۲ء میں یوم اکبر مسٹر دگمبو رند راؤ جذب و کمیل کی صدارت میں منایا گیا تھا۔ یہ پیام اس کے لئے بھیجا گیا تھا اور اسکے بعد صدق ۲۶ اپریل سنہ ۴۲ء میں شائع ہوا۔ جذب صاحب حضرت اکبر کے عقیدتمندوں میں ہیں اور خود بھی شغل سخن رکھتے ہیں۔

[2] حضرت اکبر کی حویلی کا نام جو بڑے صاحبزادے سید عشرت حسین کے نام پر تعمیر ہوئی تھی اگست سنہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب ہند کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ حویلی بھی انقلاب کی زد میں آئی۔ عشرت حسین مرحوم کے تینوں صاحبزادے رفتہ رفتہ پاکستان ہجرت کر گئے اور اب سنہ ۱۹۵۱ء میں یہ کوٹھی سرکاری کسٹوڈین کے قبضہ میں ہے! ــــ رہے نام اللہ کا!

ہیں دوسروں کو ہنساتے زیادہ ہیں۔ فقرے گویا ڈھلے ہوئے۔ پہلے سے
سوچے ہوئے، نپے تلے ہوئے منہ سے نکل رہے ہیں۔ جو ملنے آیا ہے وہ سن میں
انکی بڑی سی اولاد سے بھی کہیں چھوٹا ہے لیکن باتیں اس سے یوں گھل مل کر
کر رہے ہیں جیسے وہ انکا کوئی پرانا دوست ہے ہم سن و بے تکلف ——
ان پیر ظریف کو آپ نے پہچانا؟ یہ تھے مشہور و نامور شاعر اور حکیم و عارف
حضرت اکبر —— اور ۱۹۱۲ء کے شرمیلے نوجوان کو آپ نے جانا؟ یہ نامہ سیاہ ہے
آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یوم اکبر کے لئے پیام نویس!

سنہ اب یاد نہیں اور مقام کا اظہار کچھ ضروری نہیں۔ بہر حال اودھ کا ایک
چھوٹا سا ضلع ہے۔ حضرت اکبر کے صاحبزادے سید عشرت حسین صاحب وہاں
ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں۔ اکبر صاحب بھی وہاں آئے ہوئے ہیں، اور ریلوے اسٹیشن
پر موجود ہیں۔ شہر کے تحصیلدار صاحب بھی اتفاق سے وہیں وارد ہوتے ہیں
کوئی انھیں بتاتا ہے کہ یہ نامور شاعر حضرت اکبر ہیں یہ سُن کر بھی وہ کچھ زیادہ
التفات نہیں کرتے اتنے میں ڈپٹی صاحب خود آجاتے ہیں اور حاضرین سے
تعارف کراتے ہیں "آپ لوگوں نے پہچانا؟ یہ میرے والد ماجد ہیں" اب کیا تھا
تحصیلدار صاحب معاً ملتفت ہو جاتے ہیں اور معذرت کے ساتھ فرماتے ہیں
"معاف کیجئے گا یہ خبر نہ تھی کہ آپ ڈپٹی صاحب کے والد ماجد ہیں" اکبر نے
فرمایا "نہیں اسمیں مضائقہ کیا۔ ایک قصہ سُنئے۔ ایک بار یورپ میں کیا ہوا کہ
اللہ میاں مجسم ہو کر زمین پر اتر آئے اگر جرمن میں جا کر ایک ایک سے کہا میں خدا
ہوں، خالق ہوں، پروردگار ہوں کوئی مخاطب ہی نہ ہوا۔ اسپر فرمایا ارے

مجھے پہچانا تک نہیں میں ہوں عیسیٰ مسیح کا باپ"! بس اس تعارف کی دیر تھی سب نے سر تعظیم کے لئے جھک گئے"۔۔۔۔۔ یہ تھا ایک نمونہ اکبر کی برجستہ لطیفہ گوئی کا۔

سنہ غالباً ۱۹۱۸ یا ۱۹۱۹ء ہے۔ اکبر لکھنؤ میں امین الدولہ پارک کے ایک بالاخانہ پر مقیم ہیں۔ ایک صاحب بی اے۔ ایل ایل۔ بی اور اسوقت منصف کے عہدے پر "صاحبانہ" مسلک و خیال کے، ملنے تشریف لائے۔ گفتگو کچھ عورتوں کی تعلیم و آزادی پر چلی۔ اکبر نے کہا "ہم تو اپنے زمانہ میں آزاد خیالی کا امام سید احمد خاں کو سمجھتے تھے لیکن عورتوں کی آزادی انھیں بھی سخت ناپسند تھی" وہ صاحب جیسے بھرے بیٹھے تھے بات کاٹ کر بولے کہ "سر سید کی رائے اس معاملہ میں سخت قابل ترمیم تھی" اکبر برجستہ بولے کہ "جی کیوں نہیں ایک اسی معاملہ میں کیا خدا معلوم کتنے معاملوں میں انکی رائے قابل ترمیم تھی۔ وہ خود قابل ترمیم تھے۔ دیکھئے نہ زمانہ نے انھیں کی ترمیم کردی وہ گزر گئے اور انکے بجائے آپ کو پیدا کر دیا!"۔

۔۔۔۔ یہ ایک ہلکی سی جھلک تھی اکبر کی حکیمانہ و شاعرانہ اصلاح و تبلیغ کی۔ اسکی دھن ہر وقت سوار رہتی لیکن مجادلہ و مکابرہ کیا معنی نوبت رسمی مناظرہ و مباحثہ کی بھی نہ آنے دیتے۔ اور خشونت ان کے لہجہ کو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ شعر میں کہہ بھی گئے ہیں ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں ‌ ‌ ‌ فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

انکار مذہبی بحث سے کیا ہے۔ بحث و مباحثہ کا رنگ کبھی آنے نہ دیا۔

باقی دھیمے دھیمے سُروں میں میٹھے میٹھے بولوں میں "مذہب کی تبلیغ تو چپکے چپکے ہر وقت کرتے رہتے۔ ایک دور مجھ پر الحاد کا گزرا ہے۔ خدا اور رسول تک کا منکر تھا۔ اسی زمانہ میں ایک روز یوں ہی باتوں باتوں میں بولے "کیوں صاحب آپ نے کالج میں عربی لی تھی نہ؟" عرض کیا "جی ہاں" فرمایا تو پھر اب قرآن آپ کبھی پڑھتے ہیں؟ مذہبی کتاب سمجھ کر نہ سہی۔ اسکی اعلیٰ لٹریری حیثیت سے تو آپکو بھی انکار نہ ہوگا۔ سنتا ہوں جرمن یونیورسٹیوں میں ادب عربی کے کورس میں داخل ہے۔ کیا ہرج ہے اگر عربی ادب سے اپنا تعلق قائم رکھنے کے لئے اُسے کبھی کبھی پڑھتے رہیئے۔ آخر انگریز بھی تو پڑھتے رہتے ہیں۔ آپ کے لئے کوئی قید با وضو ہونے یا قبلہ رخ بیٹھنے کی نہیں، وضو بے وضو جب جی چاہے کچھ پڑھ لیا کیجئے اور جو آیت پسند آجائے اسے ذرا ایک دو بار دُہرا لیا کیجئے۔ جیسے اچھے شعر کو دو چار بار پڑھ لیا جاتا ہے" —— یہ تھا ایک نمونہ انکے حکیمانہ طریق تبلیغ کا۔ بحث و مناظرہ کے بغیر ہلکی پھلکی باتوں میں سب کچھ کہہ جاتے، ایک روز میرے اسی دور الحاد میں مجھسے فرمانے لگے کہ "کیوں صاحب آپ کو کبھی اپنے بندہ ہونے میں بھی شک ہوا ہے؟ خدا کی بات کو الگ رکھئے۔ صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ آپ بندے ہیں یا نہیں"؟ عرض کیا "جی ہاں کیوں نہیں۔ اسمیں تو شک ہوا نہیں" بولے "بس پھر بیڑا پار ہے۔ اسی بندگی کا احساس کرتے رہیئے۔ آپکے لئے اسی قدر کافی ہے۔ خدا کے عرفان کا دعویٰ کون کرسکتا ہے۔ جنھوں نے جانا ہے انھوں نے بھی کیا جانا ہے؟ میرا ایک شعر سن لیجئے ؎

بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو
درد تو موجود ہے دل میں شفا ہو یا نہ ہو

اپریل ۱۹۱۲ء کی وہ گھڑی اور ستمبر ۱۹۲۱ء میں یوم وفات یہ دس برس اپنی تعلقات نیاز مندی برابر قائم رہے روز بروز بڑھتے گئے۔ اس مدت میں بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ لیا، اکبر کے کلام سے بھی اکبر کی ذات سے بھی، خوش نصیب تھا میں کہ اتنی مدت تک موقع استفادہ کا ملا۔ بدنصیب تھا میں کہ موقع سے پورا فائدہ نہ اٹھایا۔ اپنے عقائد و خیالات کی اصلاح میں مینے حضرت اکبر کے اثر کو چپکے چپکے غیر شعوری طور اور غیر محسوس طور پر کام کرتے ہوئے پایا۔ وہ ابھی زندہ ہی تھے کہ میں بحمد اللہ مسلمان از سر نو بن چکا تھا۔ جب پہلی نماز حضرت اکبر کے ساتھ "عشرت منزل" میں ادا کی۔ ظہر کا وقت تھا۔ اسوقت انکی خوشی کا کیا کہنا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کتنی بڑی دولت خود انھیں مل گئی ہے، توحید کے عاشق تھے اور عشق کا ایک لازمہ غیرت ہے۔ توحید کی غیرت اتنی تھی کہ کوئی دوسرا تذکرہ، یہانتک کہ اللہ والوں اور اللہ کے پیاروں کا بھی زیادہ دیر تک سن ہی نہ سکتے۔ جھٹ موضوع بدل توحید پر آجاتے اور آخر آخر تو فنا اور توحید یہی دو محبوب موضوع گفتگو رہ گئے تھے۔

آخر ۱۹۱۹ء سے میں نے مثنوی مولانا روم (کانپوری محشی ایڈیشن) کا والہانہ مطالعہ شروع کیا اور ۲۰ و ۱۹۲۱ء میں کہنا چاہیئے کہ یہی دھن ہر وقت اپنے اوپر سوار تھی اور میں مثنوی میں مست تھا۔ حضرت اکبر کی خدمت میں مثنوی کا ذکر چھیڑا۔ ایکبار۔ پھر دوسری بار۔ اور جب تیسری بار یہی نام میری زبان پر آیا تو حضرت تڑسے بول اٹھے کہ "کیوں صاحب یہ فرمایئے کہ اللہ میاں بڑے ہیں یا مولانا روم؟" میں نے کھسیانے ہو کر کہا کہ "اللہ میاں" بولے میں آپکی گفتگو

سے یہ سمجھا تھا کہ شاید مولوی روم ٹرے ہیں۔ جب سے آپ آئے ہیں، بار بار انہیں
کا ذکر کر رہے ہیں۔ اللہ میاں کا نام میں نے ایک بار بھی نہ سُنا۔ میں تو سوچ میں
پڑ گیا تھا کہ اللہ میاں نے آپکی رہنمائی مثنوی تک کی ہو یا مولوی روم آپکو اللہ
تک لے آئے ہوں"۔ حد یہ ہو کہ ایکبار جب ذکر رسولؐ چھیڑا تو اُسے بھی دو ہی چار
منٹ بعد اکبر نے یہ کہہ کر لپیٹ دیا کہ " جی ہاں ہمارے اللہ کی قدرت کا کیا کہنا۔
محمدؐ جیسا بے نظیر اور بے مثال بندہ پیدا کر دیا!" —— یہ نمونہ تھا غلبۂ توحید کا۔

اکبر بڑے پُر گو تھے اور بڑے زود گو۔ جو دیوان چھپ چکے ہیں وہی
تعداد میں ایک نہیں تین ہیں[1]۔ اور جو کلام اب تک نہیں چھپا ہے وہ سب چھاپ
دیا جائے تو اگر پوری دو جلدیں نہیں تو ڈیڑھ جلد تو ضرور ہی اور تیار ہو سکتی ہے۔
اکبر کا پیام تقریباً وہی تھا جو اقبال کا تھا۔ یعنی خودی اور خودداری کا سبق،
مشرقی کو مشرقی اور مسلمان کو مسلمان رہنے کی تلقین۔ راہیں الگ تھیں۔ لیکن
منزل دونوں کی ایک۔ ایک ہر دل کو ہنساتا ہوا چلا، دوسرا دلوں کو گرماتا ہوا بڑھا۔
اکبر کی زندگی درحقیقت ایک سبق ہے کہ انسان ظرافت، زندہ دلی، دل لگی، خوش
طبعی کی راہ سے بھی کیسی کیسی خدمتیں دین و ملت کی انجام دے سکتا ہے۔

---

[1] چوتھا دیوان بہت بعد کو نکلا

(۵) دیباچہ خطوط اکبرؒ

حضرت اکبر (۱۸۴۶ء تا ستمبر ۱۹۲۱ء) اپنے زمانہ کے مشہور ترین شاعر اور بلند پایہ ادیب تھے۔ ساتھ ہی بڑے پختہ ایمان والے عارف باللہ۔ افسوس ہے کہ دنیا نے انکو اس آخری حیثیت سے بالکل نہ جانا۔ بلکہ شاعری کی راہ میں بھی انھیں صرف ظرافت کے نقیب کی حیثیت سے پہچانا۔ تاہم جس حد تک اور جس حیثیت سے بھی انھیں جانا پہچانا، شہرت انکے نام کی اور کلام کی بھی بھر کر ہوئی۔ آج سے ۲۵، ۳۰ سال اُدھر انکا کلام گھر گھر پھیلا ہوا تھا ہر پڑھے لکھے کی زبان پر انکے دو چار شعر شوخی اور دل لگی کے رنگ کے ضرور تھے۔

مجھے شرف نیاز ۱۹۱۲ء میں حاصل ہوا۔ مہینہ غالباً اپریل تھا میں بی اے کا امتحان دینے لکھنؤ سے الٰہ آباد گیا ہوا تھا۔ (لکھنؤ اس وقت یونیورسٹی سے محروم تھا، اور ڈگری کے امتحان کے لئے الٰہ آباد جانا ہوتا تھا) وہیں حضرت اکبر کی خدمت میں پہلی بار حاضری دی۔ مرحوم کا سن ۶۶ سال کا تھا۔ شہرت کا آفتاب عروج کو پہنچا ہوا۔ اور میں اپنی عمر کے بیسویں سال میں سلسلۂ مراسلت ایک سال بعد ۱۹۱۳ء سے شروع ہوا، اور آخری عمر تک برابر قائم رہا۔ کچھ خطوط ضائع بھی ہوئے ہونگے۔ تقریباً دو سو محفوظ رہ گئے۔ مدت مراسلت

۱؎ ۱۹۴۶ء میں تاج کمپنی لاہور نے میری مرتب کی ہوئی خطوط مشاہیر جلد اول شائع کی۔ اس جلد کے تین حصوں میں سے حصہ دوم کا عنوان اکبر نامہ ہے اور یہ مجموعہ ہے حضرت اکبر کے تقریباً دو سو خطوط کا۔ یہ دیباچہ بھی اکبر نامہ پر نومبر ۱۹۴۴ء میں قلمبند ہوا تھا۔

کوئی آٹھ نو سال رہی۔

ابتدائی مکاتبت کے وقت میں فلسفی قسم کا دہریہ تھا۔ ۱۹۱۹ء سے خطوط کا رنگ بدلا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں حضرت کی وفات کے وقت میں بحمد اللہ پورا مسلمان تھا۔ اس اصلاح حال میں کسی حد تک دخل حضرت اکبر کی شخصیت و تعلیمات کو بھی ہے۔ تبلیغ بڑے مزے سے کرتے رہتے، ملکے ملکے دل نشیں اور موثر انداز میں۔ سننے والے کو پتہ بھی نہ چلتا اور وہ دین کی محبت یا وقعت دل میں بٹھاتے چلے جاتے۔ اس کے دلچسپ نمونہ ان صفحات میں کثرت سے اور بار بار ملیں گے اکبر شاعر اور ظریف شاعر سے کہیں پہلے مومن اور مومن گر تھے۔

اکبر نثر پر توجہ کرتے تو یقیناً ایک نامور ادیب ہوتے۔ انکے حسن ادب اور انکی شگفتہ نگاری کے نمونہ ان اوراق میں شروع سے آخر تک بکھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے سبک اور نازک جملے، بات میں بات پیدا کرنا، طوالت، ثقالت سے بچنا، پیچیدہ ترکیبوں، مغلق لفظوں سے احتیاط، اور زبان کی صحت اور بیان کی شستگی، صفائی، روانی، سلاست یہ سب انکے قلم کے خاص جوہر ہیں۔ پھر اسی کے ساتھ باتیں سطحی نہیں گہری، مطالب کی بلندی خیالات کا عمق۔ اکبر نرے ادیب ہی نہیں اچھے خاصے متفکر اور فلسفی بھی تھے، مشرقی اور مغربی فلسفہ پر نظر رکھنے والے۔

اکبر پڑھتے کم تھے سوچتے زیادہ تھے دوسروں کے خیالات جذب کم کرتے، خود انھیں کے خیالات اُبلتے زیادہ رہتے تھے، فلسفہ خوان، فلسفہ دان کم تھے۔ دانش آموز، حکمت آفریں زیادہ تھے۔ اور انکی ذہانت

بے پناہ تھی۔ اگلے صفحات میں ان سب کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

معاصرت کا ابتلاء بھی عجیب ہوتا ہے۔ بعض نامور معاصرین پر چبھتی ہوئی اور ایک آدھ جگہ دل کو دکھ پہنچانے والی رائے زنی جو ملے گی وہ خاص حالات اور خاص ماحول کا نتیجہ تھی اور اب بالکل قابل معافی ہے۔ خطوط کے پڑھنے والے اسے شروع ہی سے ذہن نشین کر لیں۔

محرومی اور بدنصیبی اپنی ہے کہ ایسے شفیق اور محترم بزرگ کا سایہ عاطفت اتنے دنوں تک نصیب رہا، لیکن نہ انکے ظاہری اور باطنی کمالات ہی سے استفادہ کیا اور نہ انکی خدمت ہی کا حق ادا کیا۔ اللہم اغفر لہ وارحمہ

"یادِ اکبرؒ"[1]

الہ آباد ابکی اسی مارچ میں وسط ماہ کے بعد جانا پڑا تو قیام کے لئے انتخاب عشرت منزل کا کیا۔ عشرت منزل کسی رئیس کے عشرت کدہ کا نام نہیں، اُردو کے مایۂ ناز شاعر اور حکیم اور عارف حضرت اکبرؔ کے کاشانہ کا لقب انکے فرزند اکبر، سید عشرت حسین کے نام پر ہے ——— ۲۴ سال کے بعد اس مبارک احاطہ میں قدم رکھنے کا اتفاق ہوا۔ آخری مرتبہ اس میں قیام جولائی ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا۔ وہی حضرت اکبرؔ کی وفات سے چند ہفتہ قبل۔ اللہ اکبر! اِن ۲۴ سال میں دنیا کیا سے کیا ہو گئی۔ اور خیالات کی دنیا میں کیسے کیسے بھونچال آچکے! جب کے جوان آج بوڑھے ہیں۔ اور جو بلبل خوش نوا اُسوقت زندہ تھا، چہک رہا تھا، وہ آج گوشۂ لحد کو آباد کئے ہوئے ہے ——— مکان کے در و دیوار سب وہی، وہی کمرے، وہی صحن، وہی جنوب کے رخ پر لمبا چوڑا برآمدہ، جہاں آرام کرسی پر حضرت اکبرؔ بیٹھے یا لیٹے حقہ پیتے رہتے اور دہن مبارک سے برابر شعر و حکمت و معرفت کے پھول جھڑتے رہتے! یہیں ہر روز بار بار نمازیں ہوتیں اور کثرت سے تلاوت قرآن ہوتی رہتی۔

اکبرؔ کوئی رند ولاابالی قسم کے شاعر نہ تھے۔ صحیح معنی میں طالب علم تھے۔ اپنی طالب علمی پر فخر کرتے۔ اچھی خاصی عمر پر پہنچ کر ایک عالم کو تنخواہ

---

[1] صدق لکھنؤ ۱۰ اپریل ۱۹۴۵ء میں "سچی باتیں" کے عنوان سے

دے گرانسے باقاعدہ عربی سیکھی، اور دینی کتابیں پڑھیں، انگریزی میں فلسفہ وغیرہ کی بھی اونچی کتابوں کا مطالعہ جاری تھا۔ نظر وسیع تو بہت نہ تھی لیکن عمیق خوب تھی۔ جو کتاب بھی پڑھتے اُسکا ست یا جوہر نکال لیتے۔ فرماتے تھے۔ روز جب رات کو سونے لیٹتا ہوں تو جائزہ لیتا ہوں کہ آج دن بھر میں نیا علم کونسا حاصل ہوا جس دن کوئی نئی بات نہیں ملتی تو یہ کرتا ہوں کہ اُسوقت پھر اُٹھکر الماری سے لغت کی کوئی کتاب اُٹھا لیتا ہوں اور کوئی ایک نیا لفظ یاد کر لیتا ہوں کہ اور کچھ نہ سہی تو ایک نئے لفظ ہی کا علم حاصل کر لوں اور دن بالکل بیکار تو نہ جائے —— کیا ٹھکانا ہے اِس ذوق علم کا! اچھے جید طلبہ میں بھی اسکی مثالیں کہاں ملیں گی؟

عمل علم سے کبھی کہیں بڑھا ہوا تھا۔ نماز کے گویا عاشق تھے۔ وقت آنے کے بہت پیشتر سے وقت آنیکے انتظار میں رہتے۔ گھڑی دیکھتے رہتے اول ہی وقت پڑھ لیتے۔ نیا ملازم رکھتے تو اُس سے شروع ہی میں کہہ دیتے کہ نماز ساتھ ہی پڑھنا ہوگی۔ تلاوت قرآن کے بھی ایسے ہی شائق تھے۔ روزانہ دو وقت پابندی سے کرتے، بعد فجر اور بعد ظہر۔ فرماتے تھے کہ مجھے عربی جو کچھ بھی آئی قرآن مجید ہی کے بار بار پڑھتے رہنے سے آئی۔ گفتگو آخر زمانہ میں گویا دو موضوعوں پر محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک توحید دوسرے آخرت۔ باتیں اور بھی کرتے، آخر اسی دنیا کے آدمی تھے، ہنستے ہنساتے بھی جاتے۔ لیکن ہر چند منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی پہلو ذکر توحید کا ضرور نکال لیتے اور اپنے اللہ کی تحمید و تمجید کرنے لگ جاتے۔ بزرگوں کا

ذکر بھی دیر تک بغیر اللہ میاں کا ذکر لائے نہ سن سکتے۔ حد یہ ہے کہ کوئی نعتیہ مضمون بھی اگر چل رہا ہو تو ذرا دیر کے بعد اس طرح کے فقرے ضرور بول اُٹھتے کہ "جی ہاں، ہمارے اللہ میاں کی کاریگری کا کیا کہنا، ایک بندہ میں ایسے ایسے کمالات جمع کر دیئے ——— اور توحید کے بعد ہی جو محبوب موضوع گفتگو تھا وہ فنا و آخرت کا۔ قال بھی یہی رہ گیا تھا اور حال بھی یہی ——— کہتے ہیں کہ آخری وقت ڈوبتی ہوئی نبض ایک بار پھر اُبھر آئی جب تیمار دار نے پکار کر کہا لا موجود الا اللہ۔

---

(۷) تائبہ کی موت[۱]

کلیات اکبر حصہ اول اگر موجود ہو تو سامنے کھول کر رکھئے۔ طبع چہارم (۱۹۱۷ء) کے ص ۲۰۸ و ص ۲۰۹ پر ایک فارسی کا قطعۂ تاریخ تعزیت ملے گا۔ (اکبر کبھی کبھی فارسی بھی کہہ لیا کرتے تھے) وفات کسی نو عمر و نو خیز حسین خاتون کی ہوئی تھی ؎

آن نونہال خوبی ماہ دو ہفتہ تن — در نو بہار عمرش رفتا از قضائے ہستی

باقی گیارہ شعروں میں بھی ذکر اسی مرحومہ کے حسن و جمال اور محبوبیت کا ہے۔ مقطع ہے ؎

تاریخ فوت گفتم در صنعتے عجیبے — بوٹا بروں شد اکبر از گرد باغ ہستی

بوٹا نام تھا ــــــ کلیات میں سرسری اچٹتی نظر بارہا اس قطعہ پر پڑی تھی۔ ابھی جو الہ آباد جانا ہوا تو مزار اکبر پر جا کر، اکبر کے خاندانی قبرستان میں چل پھر کر یہ راز بھی حل ہو گیا۔

نگاہ آج سے ستّر سال قبل کی طرف پھینکیئے۔ نظر کے سامنے اُسوقت کا مسلمانی تمدن اور کھاتے پیتے مسلمان گھرانوں کی معاشرت لے آیئے۔ بعد کے ممتاز شاعر، حکیم اور عارف حضرت اکبر، اُس وقت محض ایک کامیاب وکیل میر اکبر حسین ہیں۔ ہمت شباب۔ سال ولادت ۱۸۴۶ء تھا۔ ۱۸۷۵ء میں بتیس ہی سال کے تو ہوئے۔ ہر دور میں لغزشوں سے کامل اعتیاط کا دعوی

---

[۱] صدق لکھنؤ ۱۶ اپریل ۱۹۳۵ء میں "سچی باتیں" کے عنوان سے

اچھے اچھے عابدین صالحین کے لئے بھی یہ مشکل ہی کیا جا سکتا ہے اور معصوم ذات تو صرف حضرات انبیاء کی ہوتی ہے۔ تو یہ بیچارے تو ایک جوان عمر، زندہ جذبات رکھنے والے وکیل ہی تھے۔ شہر میں ایک بالکل کمسن چھوکری گل ۱۳، ۱۳½ سال کی عمر کی لڑکی، صورت و شکل میں بہت ممتاز، بوٹا جان، "رشک حسینان جہاں" فسق اور عصمت فروشی کی دوکان پر لاکر بٹھائی جاتی ہے۔ نظر میر اکبر حسین سے چار ہوتی ہے اور نفس نفس کی جانب کھینچتا ہے۔ اب آگے دیکھئے شیطان کس طرف ڈھکیلتا ہے اور خیر الماکرین کی حکمت و مشیت کدھر لیجانا چاہتی ہے! —— عین اسی کمسنی کی بہار، اور تندرستی کے شباب میں شیطان کی سہیلی بیمار اور سخت بیمار پڑتی ہے، معاً وہی قدم جو آگ کے ہولناک گڈھے کی طرف اُٹھ رہے تھے گلشن جنت کی گل و گلزار شاہراہ پر پڑنے لگتے ہیں!

مریضہ کو یقین مرض الموت کا ہو جاتا ہے اور مسلمان گھرانے کی پیدائش اب رنگ دکھاتی ہے۔ خواہش نکاح کی پیش کرتی ہے اور عین اس کے مرض الموت کے بستر پر جب نفس کی لذتوں کا کوئی بھی لگاؤ نکاح میں باقی نہیں رہ جاتا، وہ، وہ سید اور سید زادہ اسے اپنے عقد زوجیت میں باقاعدہ لے آتا ہے۔ شہر کے ایک چشتی بزرگ کے ہاتھ پر کمسن مومنہ توبہ کرتی ہے، بیعت کرتی ہے اور گناہوں سے دھل دھلا پاک و صاف، کلمہ توحید پڑھتی ہوئی جولائی ۱۸۷۶ء (مطابق شوال ۱۲۹۳ھ) میں جنت کے سفر پر روانہ ہو جاتی ہے! —— قبر پر جو طویل کتبہ درج ہے، اس میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور کلمۂ شہادت اور آیہ کریمہ کُلّ من علیھا فان ویبقٰی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام کے بعد یہ تقریح بھی درج ہے کہ

بر کلمۂ توحید جان بحق تسلیم کرد | توحید کا کلمہ پڑھتے ہوئے جان دی

اللہ اللہ ——— ساری ریاضتیں اور سارے مجاہدے اسی دن اور اسی گھڑی کے لئے تو ہوتے ہیں! جس بندہ اور جس بندی کو وہ جس مرتبہ پر چاہیں پہونچادیں! کسی کے بھی ایمان کی تحقیر کا حق کسی کو حاصل ہے؟

(۸) ۲۵ ویں برسیؔ

ایک مختصر سی لیکن صاف ستھری محفل مشاعرہ، لکھنؤ میں آج سے کوئی پچاس ساٹھ سال قبل آراستہ ہے۔ مصرعہ طرح کی زمین ہے "ازل سے" "کل سے"۔ ایک شاعر کے سامنے جب شمع آئی تو مطلع ارشاد ہوا ؎

الجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے
مانگی نہ مدد دل نے مرے طول امل سے

اور داد کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں، کلام میں بانکپن تھا ہی اس غضب کا اور اس شعر پر تو محفل لوٹ لوٹ گئی ؎

انکی نگہ مست ہے لبریز معانی
ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

نگاہ یار کی مستی بہتوں نے باندھی ہے اور شراب سے اسے تشبیہ بارہا دی جا چکی ہے۔ حافظ کی غزل تک اسکا رتبہ پہونچا دینا یہ اسی شاعر کی جدت طبع کا کرشمہ ہے اور عجیب کیا، جو خود خواجہ حافظ کی روح بھی یہ اچھوتی داد سن کر وجد میں آگئی ہو۔ اور پھر جب اس شعر کی نوبت آئی ؎

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چپ
ہے صحبت ترے پیغام کی ظاہر ہی اجل سے

تو جو اہل دل تھے انکی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اور اہل معرفت کی زبان پر بے ساختہ مرحبا اور سبحان اللہ کے نعرے جاری ہو گئے لیکن شاعر نے اپنی

ؔ نشری تقریر لکھنؤ ریڈیو سے ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو وقت ۱۰ منٹ۔ حضرت اکبر کی وفات ستمبر ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی اور یہ انکی پچیسویں برسی تھی اور سال ولادت ۱۸۴۶ء تھا۔ اس حساب سے یہ انکی ولادت کی یک صدی سالگرہ بھی ہوگئی۔

اسی غزل کے ایک شعر کا جب یہ مصرعہ پڑھا کہ

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے

تو سامعین میں ایک بڑے گہرے مذہبی شخص، خانبہادر منشی اطہر علی کاکوروی مرحوم موجود تھے انکے تیور پر کچھ بل سے پڑنے لگے کہ لیجئے قرآن سے بھی شوخی ہونے لگی اور شاعر اپنی حد سے بڑھ چلا۔ حساس شاعر معًا تاڑ گیا اور جھٹ پہلے مصرعہ کی تکرار کر کے پورا شعر یوں سنایا ؎

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے ۔ کس حسن سے یہ بھی تو سنو حسنِ عمل سے

شعر کا زبان سے ادا ہونا تھا کہ داد و تحسین کی بارش ہر طرف سے ہونے لگی اور خانبہادر نے تو بے اختیار اٹھ کر گلے لگا لیا! ان شاعر کو آپ نے پہچان لیا؟ یہی تھے سید اکبر حسین اکبر۔ اسوقت غالبًا منصفی کے عہدے پر تھے۔ آگے چل کر خفیفہ کے جج اور پھر سشن جج ہوئے۔ جو اس زمانہ کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی "ترقی" کی گویا معراج تھی۔ خان بہادر ہوئے الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو ہوئے اور سب سے بڑھکر یہ کہ کلیات کی تین چار جلدوں[1] کے مصنف اپنے وقت کے نامور ترین شاعر ہوئے۔ اپنے رنگ میں فرد۔

برجستگی اور بدیہہ گوئی کے بادشاہ تھے۔ ایک نمونہ تو ابھی آپ سن ہی چکے اور معنی آفرینی گویا انکا حصہ تھی۔ مضمون ہر قسم کے جیسے ہاتھ باندھے انکے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ جب جس مضمون کو چاہا بہترین لفظی صنعت کاری کے ساتھ ادا کر دیا۔ سوچنے میں معمولی بات چیت کے وقت ہم کو آپ کو

---

[1] تین جلدیں تو زندگی ہی میں چھپ گئی تھیں، چوتھی وفات کے مدتوں بعد ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی۔

کچھ نہ کچھ وقت لینا ہی پڑتا ہے۔ انھیں شعر کہتے اتنی دیر بھی نہ لگتی۔ اس نیاز مند کو مرحوم کے عمر کے آخری نو۔ دس سال ذاتی نیاز مندی اور حضوری کا اچھا خاصہ اتفاق رہا۔ یہ بات اندھی عقیدت کی راہ سے نہیں، اسی ذاتی تجربہ کی بنا پر عرض کی جا رہی ہے حضرت اکبر بوڑھے ہو چکے تھے عمر ۶۴-۶۵ سے زائد ہو چکی تھی۔ ذہانت، شوخی، برجستگی، معنی آفرینی، لطافت زبان، حسن بیان، یہ سب اوصاف اُس وقت بھی جوان تھے۔ بات میں بات پیدا کرتے اور بعض دفعہ بے بات کی بات پیدا کر لیتے۔ گفتگو میں خود ہنستے بھی بہت کم تھے دوسروں کو ہنساتے بہت زیادہ رہتے۔ اور ہنساتے ہنساتے کبھی رلانے بھی لگتے۔ کوئی چوٹ ایسی دل پر لگا دیتے کہ سننے والے کا دل درد سے بھر آتا!۔۔ راگوں میں سُنا ہے کوئی دیپک راگ بھی ہوتا ہے جو ساز کی جگہ سوز پیدا کر دینے کی تاثیر رکھتا ہے۔

پُر گوئی گویا اُن پر ختم تھی، تین کلیات تو صرف چھپے ہوئے ہیں۔ باقی جتنا حصہ چھپنے سے رہ گیا ہے وہ بھی ایک کلیات یا ڈیڑھ کلیات سے کم نہیں۔ اور وہ شعر جو اکبر "سخن گو" نے کہے اور اکبر "سخن سنج" کو چھپنے کے قابل نظر نہ آئے، انکی تعداد ان کے علاوہ!

اصل ناموری غزل گوئی میں نہیں، نظم گوئی میں پائی۔ اسکی بھی ایک خاص صنف یعنی مزاحیہ نگاری میں لیکن غزلیں بھی جناب اکبر کی کسی سے کم نہیں۔ کم نہ تعداد و حجم کے لحاظ سے اور نہ حسن و معنویت کے اعتبار سے ۔۔۔۔ ۔ امنٹ کی مہلت میں اتنی گنجائش ہی کہاں ورنہ اکبر کے انتقادانہ کلام کے کثرت سے

نمونے پیش کر کر کے فیصلہ خود آپ ہی کے ذوق سلیم پر چھوڑ دیا جاتا۔

اکبر مذہبیت کے بڑے حامیوں اور مشرقیت کے خاص طرفداروں میں تھے اور یہ بات یاد رہے کہ وہ وقت تھا جب "رفارم" یا اصلاح و تجدد کا جھنڈا سید احمد خاں مرحوم کے ہاتھ میں تھا۔ اکبر انکے معاصر تھے گو سن میں ان سے کہیں چھوٹے اور علیگڈھ میں خود منصف رہ کر "رفارم" یا تجدد کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ کلام میں خوب خوب چٹکیاں لیتے جاتے ہیں۔ لیکن چٹکیاں بھی عموماً گدگدی ہی کے رنگ میں ہوتی ہیں ---- ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

حاضر ہوا میں خدمت سید میں ایک رات
افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے وہ مجھ سے "دین کی اصلاح فرض ہے"
میں چلدیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

کہیں کہیں یہ ظرافت ہلکی سی نشتریت بھی پیدا کر لیتی ہے۔ جیسے یہ شعر ؎

سید اُٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

گزٹ کے معنی سرکاری گزٹ کے تو بالکل ظاہر ہیں۔ ایک تلمیح یہ بھی ہے کہ سر سید کے ہفتہ وار اخبار کا نام بھی علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ تھا۔ یہ شعر ایک غزل کا ہے اور غزل کا مطلع ہے ؎

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

یہاں تک جب آ گئے ہیں تو ایک آدھ شعر اور بھی اس غزل کا ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے ؎

گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش
طالب زمزمۂ بلبل شیدا نہ ملا

بزم یاراں سے پھیری باد بہاری مایوس ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا

اور ایک شعر مخصوص اکبری رنگ کا ے

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

سیاسیات میں اکبر کا مذاق وہی تھا۔ جو ہر خوددار مشرقی کا ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ میدان کے سپاہی اور اکھاڑے کے ڈنڈ پیل پہلوان نہ تھے۔ مجلس ادب کے مسند نشین اور بزم ظرافت کے میر تھے۔ زبان کھولتے تو میٹھے میٹھے بولوں میں ایک پھلجھڑی چھوٹا جاتے۔ ہنسی کی کھکھلاہٹ سننے والوں کی پیشانیوں پر شکن قائم ہی نہ رہنے دیتی۔

ایک رباعی کے پہلے مصرعہ میں فرماتے ہیں ع

انگریز ہر ایک فن میں ممتاز بھی ہیں

دوسرے مصرعہ کے کچھ لفظ بھول رہا ہوں "دمساز بھی ہیں" کچھ اس طرح باندھا تھا خیر جانے دیجئے۔ کام کے مصرعہ آخر کے دو ہیں ے

بابو کو نچا دیا جو چابی دے کر اس سے یہ کھلا کہ دگی باز بھی ہیں

یہ "بابو" کیا خوب! ایک طرف بنگالی ہی بابو نہیں بلکہ کُل انگریزی داں ہندوستانی، اور دوسری طرف دو کانوں پر بکنے والے چینی کے کھلونے۔ کوک سے ناچنے والے ـــــــ اور "چابی" کی مناسبت سے دوسرے

لہ بعد کو پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب ایم اے۔ الہ آباد یونیورسٹی کی عنایت سے یہ دونوں صحیح مصرعے بھی معلوم ہو گئے ے انگریز قوی بھی ہیں سرافراز بھی ہیں تدبیر میں علم و فن میں ممتاز بھی ہیں

مصرعہ میں "کھلا" تو بہت ہی خوب! یہ "چابی" سے "کھلنا" عجب نہیں جو بڑے بڑے استادوں کو "بند" کر دے!

اکبر ذاتی حیثیت سے بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ ہر بڑے چھوٹے سے جھک کر ملنے والے، کسی کی دلشکنی نہ گوارا کرنے والے اور نماز و قرآن کے گویا عاشق۔ ایسا عشق جو اچھے اچھے عالموں درویشوں میں بھی کمتر ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ آج ۹ ستمبر کو انکی پچیسویں برسی ہے۔ فاتحہ خیر پہ اس ذکر خیر کو ختم کیجئے۔

(۹) گاندھی نامہ[۱]

حضرت اکبر اُردو زبان کے مایۂ ناز اور مشہور معروف شاعر حضرت اکبر الہ آبادی کے کلام کا ایک مختصر سا "تازہ" مجموعہ "آنج" جمعہ ۱۴ر مئی سنہ ۴۸ء کو موصول ہوا کوئی خیال بھی کر سکتا تھا کہ حضرت اکبر جنکی وفات کا سال سنہ ۲۱ ہو انکا کوئی غیر مطبوعہ کلام پہلی بار سنہ ۴۸ء میں جا کر شائع ہوگا جبکہ ان کے فرزند بھی دنیا سے رخصت ہو چکے، اور جب خود انکا نام بھی لوگ بھول چلے! قدرت کے عجائب بھی ایک سے بڑھ کر ایک عجیب ہوتے ہیں اور پھر حضرت اکبر تو ندرت بیان اور بداعت اسلوب کے لئے مشہور ہی تھے اس میں عجب کیا کہ نظام تکوینی نے خود ان کے کلام کی طبع و اشاعت سے متعلق ندرت و بداعت کا یہ پہلو ملحوظ رکھا!

مبارکباد کے قابل ہیں سید مسلم رضوی (عشرت منزل[۲] الہ آباد) جنھوں نے اپنے نامور دادا جان کے اس صحیفۂ ادبی کو گمنامی اور بے نشانی سے نکالا، اور ان سے بھی بڑھ چڑھ کر قابل مبارکباد ہیں الہ آباد یونیورسٹی کے استاد عربی، پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب[۳] ایم اے جنھوں نے محنت و تعب برداشت

۱؎ صدق ۱۱ جون سنہ ۱۹۴۸ء ۲؎ یہ پتہ قیام پاکستان سے قبل کا تھا۔ ۳؎ افسوس ہے کہ ان سطور کی اشاعت سے بہت قبل مرحوم ہو چکے۔

کرکے اس نسخہ کو فراموشی کے جزدان سے باہر نکالا، گرد جھاڑی اور اپنے مقدمہ (تمہید)، و تحشی کے بعد اسے بازار میں لا رکھا۔ ملنے کا پتہ کتابستان الٰہ آباد[1] قیمت للعہ مجلد مع تصویر حضرت اکبر، ضخامت ۲۴ + ۱۲+۱۲+۱ ۶ صفحات۔

گاندھی نامہ میں کل اشعار حسب تصریح مرتب ۲۰۰، ۳ ہیں۔ لیکن سب کی نہ صنف ایک نہ وزن و بحر ایک۔ کچھ قطعات ہیں کچھ رباعیاں ہیں۔ کچھ محض فرد۔ شاعر نے محض اشتراک معنوی یا مناسبت مضمون کی بنا پر سب کو ایک مجموعہ میں داخل کر دیا ہے۔ اور نہ یہ سارا مجموعہ ایک وقت میں، یا مسلسل کہا گیا ہے، کوئی شعر کبھی کہا گیا اور کوئی کبھی۔ اسلئے کلام کے مختلف اجزاء میں باہمی ربط ہر جگہ نمایاں نہیں۔ کہیں کہیں خفیف ہے اور کہیں کہیں خفی البتہ جو کچھ کہا گیا ہے، سب وسط ۱۹۱۹ء سے لے کر وسط ۱۹۲۱ء یعنی شاعر کی وفات سے ذرا قبل تک۔ اس کلام سے لطف اٹھانے بلکہ اسے پورے طور پر سمجھنے کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ بطور پس منظر کے ہندوستان کے ہیجان سیاسی کا نقشہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء کا پیش نظر ہو۔ اور جسکے سامنے یہ نہیں وہ خود فاضل مرتب کی طرح ہزار خوش فہم ہو پھر بھی ٹھوکر پر ٹھوکر کھائے گا۔

صحیح واقعاتی واقفیت کی کمی کی تلافی نہ ذہانت سے ہو سکتی ہے نہ عقیدت سے اور نہ کسی ناقص اور ضعیف قسم کے راوی کے بیانات پر اعتماد کر لینے سے۔

اصل کتاب کی ضخامت کل ۱۶ صفحے کی ہے۔ ۱۲ صفحوں میں بڑے گاندھی نامہ کا

---

[1] اب سوا پاکستان کے اور کہاں مل سکتا ہے۔

نقش اول، ایک چھوٹا سا گاندھی نامہ (اسے گاندھی نامچہ کہئے تو گیا بیجا ہے)
کل ۶۲ شعروں کا ہے اور اس سے قبل مرتب صاحب کی دلچسپ مبصرانہ
تمہید ۲۴ صفحوں کی ہے۔ کتاب کے سارے کے سارے اشعار اب تک غیر مطبوعہ
نہ تھے۔ متعدد اشعار یہ راقم آثم حضرت اکبر کی بیاض سے اپریل ۲۰ء میں
(جب وہ پرتاب گڈھ میں اپنے صاحبزادے کے ہاں مقیم تھے) نقل کر لایا
تھا۔ اور اسی زمانہ میں رسالہ معارف (اعظم گڈھ) میں انھیں شائع بھی کر دیا
تھا، اور ایک اور قطعہ (نئی روشنی کا ہوا تیل گم صفحہ ۲۰) کا بھی اسی زمانہ میں
چھپ جانا اچھی طرح یاد ہے۔ خیال ایسا پڑتا ہے کہ بدایوں کے ماہنامہ نقیب
میں نکلا تھا ——— معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شروع میں شاعر کا ارادہ
کسی الگ رسالہ کے مرتب کرنے کا تھا ہی نہیں۔ بس جب ایک عرصہ کے
بعد خاص اس موضوع کے متعلق اتنا کلام ہو گیا تو ایک مستقل عنوان دے کر
یکجا کرنے کا خیال آیا۔ ۱۹۱۹ء و ۲۰ء و ۲۱ء میں یہ نیازمند برابر حاضر خدمت
ہوتا رہا اور گرامی ناموں سے بھی مشرف ہوتا رہا۔ یاد نہیں پڑتا کہ کبھی اس
رسالہ کا ذکر فرمایا ہو۔ سب سے پہلے اسکا ذکر آخر جولائی ۲۱ء میں فرمایا اور
آہ کہ وہی آخری ملاقات تھی۔ قیاس ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس سارے
کلام کو یعنی جو کچھ بھی گاندھی جی اور ان کی تحریک ترک موالات وغیرہ کے
سلسلہ میں تھا، یکجا کر دینے کا خیال آیا تھا۔ بہر حال وہ ۲۰ء بلکہ اغلبًا
۲۱ء کا مرتب کیا ہوا رسالہ اُسوقت سے اب تک یونہی مسودہ کی شکل میں
پڑا رہا، اور شائع اب جا کر ہوا جب نہ خود گاندھی جی باقی رہے ہیں، نہ تحریک

خلافت نہ تحریک ترک موالات اور نہ خود وہ حکیم و ظریف شاعر؛
کتاب کے حصے جا بجا اب بھی بہت دلچسپ ہیں اور کیوں نہ ہوتے۔
کلام بہر حال اکبر کا کلام ہے۔ لیکن پورا لطف صرف وہی لوگ اُٹھا سکتے
ہیں جو آج سے ایک ربع صدی قبل کی تلمیحوں سے پوری طرح واقف ہوں۔

اور تو اور خود حضرت مرتب بہ ایں فضل و خوش فہمی پوری واقفیت نہ
ہونے کے باعث بار بار دھوکا کھا گئے ہیں قطعہ ۱۰۳ یوں درج ہے ؎

پالیٹکس جھگڑے چھوڑ دو | ان باتوں سے اب منہ موڑ دو
کیسے ڈائر۔ کیسے ہنٹر | لاؤ ساغر۔ لاؤ کنٹر

اس پر مرتب کا حاشیہ ڈایر تو تقریباً[1] صحیح ہے کہ ڈائر لاہور چھاؤنی کے فوجی
افسر کا نام تھا۔ لیکن ہنٹر پر وہ صرف اسقدر لکھ کر رہ گئے ہیں کہ "ہنٹر ایک
فرضی نام معلوم ہوتا ہے انگریز لوگوں میں یہ نام عام ہے۔"
حالانکہ ہنٹر اسی مشہور انگریز بیرسٹر کا نام ہے جو اس تحقیقاتی کمیشن کا
صدر تھا۔ جو ڈائر شاہی مظالم کی تحقیق کے لئے مقرر ہوا تھا۔ سنہ ۲۰ کے اخبارات
کی فائلیں اُٹھا کر دیکھی جائیں تو کالم کے کالم ہنٹر کمیشن کی کارروائیوں سے
پُر نظر آئیں گے۔

صفحہ ۴۴ پر ذیل کا قطعہ نمبر ۱۴۰ ہے کہ ؎

طب دہلی کی مدد سے بت کی صحت بڑھ گئی | قدرت باری سے بتخانہ کی شوکت بڑھ گئی

---

[1] تقریباً صحیح اس لئے ہے کہ جنرل ڈایر صرف لاہور کا نہیں صوبہ پنجاب کا سب سے بڑا فوجی
افسر تھا۔

ڈنڈوت جب شیخ صاحب نے بھی کی بتیس صنم   گاندھی آندھی ہو گئے چیلوں کی ہمت بڑھ گئی
آکسن بھائی نے قربانی تعصب کی جو کی   جان بل جب ہو گئے گائیوں کی قیمت بڑھ گئی

اسکا لطف وہی اُٹھا سکتے ہیں جو اس سے واقف ہیں کہ ترک موالات کی طوفانی تحریک میں "طب دہلی" (حکیم اجمل خاں مرحوم) اور "قدرت باری" (مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم) اور "شوکت" (مولانا شوکت علی مرحوم) اور "آکسن بھائی"[1] (مولانا محمد علی "اکسن" مرحوم) کے کیا کیا مرتبے تھے۔ اور پھر "آکسن" اور "قربانی" اور "جان بل" اور "گائے" کی باہمی مناسبتیں!

صفحہ ۵۴ پر ایک قطعہ (۱۹۲۱ء) ہے:-

حضرت گاندھی پھرتے ہیں شملہ پر نور سے   واپسی موسیٰ کی یاد آتی ہے کوہ طور سے
مشتہر اخبار میں کر دیں اسی مضمون کو گوج   اور بندوں کو بھی حاصل ہونیوالا ہے عروج

اسکے مصرعہ سوم کے لفظ "گوج" پر جناب مرتب کا حاشیہ ہے کہ "یہ لفظ یوں لکھا ہے ——— معنی؟" معنی بہت آسان تھے۔ مسٹر گوج صوبہ کے ایک بڑے انگریز حاکم کا نام تھا جو ۱۹۲۱ء میں صوبہ کا پبلسٹی کمشنر تھا۔ اور خود جناب مرتب نے بھی تمہید میں یہی لکھا ہے ——— گاندھی جی ۱۹۲۱ء میں وائسرائے لارڈ ریڈنگ کی دعوت پر شملہ ان سے ملنے گئے تھے اور وہاں سے پلٹ کر علی برادران کو مشورہ دیا تھا کہ اپنی آتش زبانی سے معافی مانگ لیں۔ اس معذرت کو سرکاری اور نیم سرکاری اخباروں نے خوب اچھالا تھا۔

---

[1] "آکسن" کے انگریزی میں دو املے ہیں ایک املے سے اسکے معنی "آکسفرڈ کے پڑھے ہوئے" کے ہیں اور دوسرے املے سے "آکس" (بیل) کی جمع ہے۔

قطعہ میں تلمیح انھیں واقعات کی جانب ہے۔

کابل کی تلمیح بار بار آتی ہے مثلاً ۱۷ء میں یہ مصرعہ کہ

کابل کے بل سے گائے جو بھڑکے تو کیا کریں

یا ۱۸۲ء میں مالوی جی سے متعلق کہ ؎

وہ بولے کہ کابل سے ہوگا گزند   کہیں گے ہم انگریز ہی کو پسند

تو ایسے اشعار میں صاف اشارہ اس طرف ہے کہ ہندو لیڈروں (مالوی جی وغیرہ) نے حکومت کی شہ پاکر بدگمانی یہ ظاہر کی تھی کہ یہ علی برادران اور دوسرے مسلمان لیڈر تو ہندوستان پر افغانستان کی حکومت قائم کرا دینے کا منصوبہ باندھ رہے ہیں۔ اور پھر ادھر ۱۹۱۹ء میں جنرل نادر خاں مرحوم (جو بعد کو نادر شاہ فرمانروائے افغانستان ہوئے) کے ہاتھوں مقام تھل (THAL) میں برطانیہ کو افغانی فوج سے اپنی توقع اور اندازہ کے بالکل خلاف ایک سخت شکست بھی اٹھانی پڑی تھی۔

ص۴۸ اس مصرعہ "سر تسلیم خم ہے جو مزاج جارج میں آئے" کے لفظ "جارج" پر حاشیہ ہے کہ جارج پنجم یا (اور) ششم شاہ انگلستان۔"

اس عبارت میں "یا ششم" کا اضافہ محض حشو ہے۔ ۱۹۲۱ء میں جارج ششم کا کوئی خیال بھی نہیں کر سکتا تھا صرف جارج پنجم ہی مراد ہیں۔ ولی عہد کا نام بھی ایڈورڈ تھا۔ تمہید اور تابلقدر تمہید میں دو باتیں کلام اکبر کے سلسلہ میں کتاب "بزم اکبر"[1] کے حوالہ سے اور کہی گئی ہیں اور دونوں محتاج تصحیح ہیں۔

---

[1] مصنفہ ماسٹر قمر الدین بدایونی

پہلی بات یہ کہ حضرت اکبر نے انگریزی لفظ "پریس" (مطبع) کو اردو کے "کس" کا ہم وزن کر کے باندھا ہے اور جب ان سے اسکی بابت سوال کیا گیا تو "بہت بگڑ کر" جواب دیا کہ "من گفتم و محاورہ شد" "بہت بگڑتے" کی روایت کی تحقیق تو اب حضرت اکبر کی وفات کے بعد ہونی محال ہے البتہ یہ سوال تو بہت کھلا ہوا ہے کہ "پریس" کو آخر کہاں انھوں نے کس کا ہم وزن باندھا ہے۔ کم از کم اس شعر میں تو ہرگز نہیں جس کا حوالہ درج ہے یعنی ؎

علوم انکے زباں انکی پریس انکے لغات انکے

ہماری زندگی کے سارے اجزا پر ہیں ہات انکے

دوسری بات اسی "بزم اکبر" کے حوالہ سے یہ فرمائی گئی ہے کہ اکبر کے مشہور شعر ؎ بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں گو خاک راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں[1] میں "بدھو میاں" سے اشارہ مولانا محمد علی رح اپنی شخصیت و ذات سے متعلق سمجھے ——— اس خاکسار سے بڑھ کر مولانا محمد علی رح اور حضرت اکبر کا نیاز مند اور عقیدت کیش اور کون رہا ہوگا۔ میرے علم میں یہ بات پہلی بار آ رہی ہے، ورنہ اس کے قبل تو جب جب سنا تھا یہی سنا کہ یہ اشارہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی ہی کی جانب ہے اور اسی شہرت عام کے بعد بطور تلافی حضرت اکبر نے یہ شعر بھی ارشاد کیا تھا ؎

اے چرخ ہوائے شوق چلے، اے شاخ عمل گلباری کر

کچھ کام کریں کچھ سعی کریں، ہر شیخ کو عبدالباری کر

[1] مجھے یہ دوسرا مصرعہ یوں یاد پڑتا ہے ع اک مشت خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

گاندھی نامچہ کے متعلق تمہید میں ہے کہ

"یہ چھوٹا سا نسخہ جس انداز سے شروع ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب مصنف کسی خاص رسالہ یا اخبار کے اڈیٹر سے مخاطب ہیں۔ افسوس ہے کہ اس مخطوطہ میں کہیں کوئی تحریر ایسی نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ یہ خطاب کن اڈیٹر صاحب سے ہے"

حضرت اکبر کی جس عبارت کا حوالہ ہے وہ اصل میں یوں ہے:-

"جناب اڈیٹر صاحب دو چار روز سے آپکے اڈیٹوریل فتنہ موجودہ کے متعلق بہت معنی خیز ہوتے ہیں۔ آپ صحیح فرماتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کی نسبت خیالات متحد نہیں ہیں"۔۔۔ ایک طرف کہا جاتا ہے کہ افغانستان کا حملہ ہوگا اگر انگریز چلے جائیں گے الخ"

"دو چار روز سے آپکے اڈیٹوریل" اس ٹکڑے نے صاف کر دیا کہ کوئی رسالہ یا ہفتہ وار نہیں بلکہ کوئی روزنامہ ہی مراد ہے۔ اور روزنامہ پابندی کے ساتھ صرف لکھنؤ کا ہمدم ہی حضرت اکبر کی نظر سے گزرتا تھا، اور اڈیٹر ہمدم سید جالب صاحب دہلوی سے حضرت اکبر کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ (اکبر کا یہ پُرلطف شعر بھی ہمدم کی شان میں یاد کرتے چلیے ؎

خوب ہو نام اسکا گر "ہمدم" رہے "دَم" نکلنے پر بھی باقی "ہم" رہے)

جالب صاحب گاندھی جی کے معاملہ میں حضرت اکبر کے ہم خیال بھی تھے، یعنی معتدل درجہ اور نرم لہجہ میں تحریکات کے مخالف۔ شاعر کا مکتوب انھیں جالب صاحب اڈیٹر ہمدم کے نام ہے۔

اب اصل کلام پر ایک سرسری نظر کر لیجئے۔ کلام اتنا پرانا ہو جانے کے بعد بھی باسی نہیں ہوا ہے، بلکہ بعض اجزا بدستور تازہ و شگفتہ ہیں ——
اور کہیں کہیں تو جیسے کوئی مصرعہ الہام سے زبان پر آ گیا ہے، مثلاً

گائیں اچھل رہی ہیں قصائی اُداس ہیں!

حیرت ہوتی ہو کہ یہ ۱۹۴۷ء و ۱۹۴۸ء کا چہرہ ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء کے آئینہ میں کیسے نظر آ گیا تھا؟ - شعر یہ ہوا ہے ؎

ٹھونکتے تھے مردِ میداں ہی کی پیٹھ اب رزولیوشن پہ بجے ہونے لگی

اور یہ طرز بیان تو خاص اکبر ہی کا حصّہ ہے ؎

اپنی جگہ ہر اک کا ارمان نکل رہا ہے تو پیں کبھی چل رہی ہیں یا جوتا کبھی چل رہا ہے
لیکن رہا میں چپکا دل میں یہ بات سوچی کس تقویت پہ اٹھوں انجینیر نہ موچی

اکبر جس طرح انگریزیت اور صاحبیت سے بیزار تھے، اسی طرح ہندویت سے بھی ڈرتے رہتے تھے ؎

تمھاری چال راہِ کفر سے کس دن الگ دیکھی جو ظلم گرگ انمیں ہو تو تم میں حرص سگ دیکھی

علی برادران کے اخلاص کے بہت قائل تھے، ساتھ ہی یہ کبھی ڈرتے جاتے تھے کہ کہیں یہ خدمتِ دین سے دور نہ جا پڑیں ؎

دشوار بہت ہے مستحق آنر ہونا کچھ کھیل نہیں علی برادر ہونا
ہاں سب یہ دعا کریں کہ ان بندوں کو آسان ہو پیرو پیمبر ہونا

شوخی و ظرافت کی پھلجھڑیاں بھی چھڑاتے جاتے ہیں، لیکن ادھر وقت آیا اور اُدھر اذان کبھی پکار دیتے ہیں ؎

ہے چھتری کبھی جیب نہ پٹا ہے نہ بانک ہے
پوری کبھی خشک لبا ہے کہ کبھی چھ چھٹانک ہے

کپڑا اگر اں ہے سو ستر ہے عورت کا آشکار
کچھ بھی نہیں یاں یہ فقط ڈھانک ڈھانک ہے

بھگوان کا کرم ہو سودیشی کے بیل پر
لیڈر کی کھینچ کھانچ ہے گاندھی کی ہانک ہے

اکبر پہ بار ہے یہ تماشائے دل شکن
اس کی تو آخرت کی طرف تاک جھانک ہے

ظاہری طمطراق، پرزور لفاظیوں، تعلیوں اور خطیبانہ لن ترانیوں کے وہ بالکل قائل نہیں ہے ؎

رفیق شیطاں بہک گئے ہیں معین آدم دبک گئے ہیں
سنائیں کیا تم کو قول فیصل کہ غور کر کر کے تھک گئے ہیں

ہمارا چلنا وہ رینگنا ہے جو کیچوے بھی ہنسیں بجا ہے
مگر زباں پر وہ زمزمے ہیں کہ سن کے بلبل پھڑک گئے ہیں

ہنسانے اور رلانے دونوں میں یہ قطعہ اپنا نظیر آپ ہی ہے ؎

نئی روشنی کا ہوا اسپل گم
حکومت نے اس سے کیا میل کم

ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے
نہ آفس میں تھے اور نہ کرسی میں تھے

یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے
سیاسی کمیٹی میں ہل جائیے

اسی میل کا آجکل ہے ظہور
خدا جانے ظلمت ہے اسمیں کہ نور

مولانا شوکت علی مرحوم کی سیاسی رندی و سرمستی، اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی "وفاداری" دونوں اگر نظر میں ہوں اور ساتھ ہی ساتھ میں دونوں کی مشترک اسلامیت پر بھی اگر نگاہ رہے تو البتہ اس شعر کا پورا لطف آئے گا ؎

ایک شوکت اور ضیاء الدین وضع و خو میں ہیں

فرق اتنا ہے وہ جنگل میں ہیں اور یہ زو[۱] میں ہیں

تحریک ترک موالات کے زیادہ اخلاص کے کبھی قائل نہ تھے۔ سمجھتے تھے کہ یہ تو ایک طرح پر گورنمنٹ کی عین حمایت ہے کہتے ہیں اور کنین کی تلخ گولی پر کس طرح شکر لپیٹ کر کہتے ہیں ؎

آ گئے تمھارے رنگ کسی کا نہیں جما — سچ ہے تمھاری لے میں ہے گاندھی مہاتما
لینے کے تم نہیں ہو گورنمنٹ کی مدد — چورن کو کیا ضرور ہے پیپرمنٹ کی مدد

اپنی علاحدگی، بے تعلقی، گوشہ نشینی کی خشک واقعیت کو کس البیلے انداز سے پیش کرتے ہیں ؎

حکام ہیں خزانہ و توپ و رفل کے ساتھ — خدام ہیں شگوفۂ ترک عمل کے ساتھ
بازو میں بال نہ زور گلے میں شور شور — ہم تو مشاعرہ میں ہیں اپنی غزل کے ساتھ

یہی صدا ایک دوسری لے میں ؎

صاحب سے کہے تو راحتوں کو ترسے — "شوکت" سے اگر پھرے تو لعنت برسے
بہتر ہے کہ بیٹھا رہے تو کل بہ خدا — باہر رکھو نہ قدم اپنے گھر سے

کہیں کہیں مطبعی غلطی نے کبھی مطلب، ضبط اور لطافت کو غارت کر دیا ہے۔ مثلاً اس ؎

انڈیا نے کمر تو باندھی ہے — کوئی "شوکت" ہے کوئی "گاندھی" ہے
لیکن اب بھی بہت سے ہیں اٹریل — صرف پشتک ہے اور گاندھی ہے

چوتھے مصرعہ کے آخر میں صحیح لفظ "کاندھی" ہے جو "پشتک" ہی کی طرح شریر گھوڑے کی ایک حرکت کا نام ہے کتاب میں بجائے کاف عربی

۱؎ ہ سے چڑیا گھر، زندہ عجائب خانہ

کے کاف فارسی (گ) چھپ گیا ہے یعنی "گاندھی"۔

اکبرؔ کا اصل مذاقِ طبیعت توحید، معرفت، فنا، نظم بھر میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ مثلاً ؎

پتلون کے بٹن سے دھوتی کا پیچ اچھا دونوں سے وہ جو سمجھے دنیا کو ہیچ اچھا

یا پھر ؎

نشانِ شوکتِ گاندھی کجا بود کہ اکبرؔ صرفِ کشف ماجرا بود
بجائے ملک مسکین محو عانش خدا بود و خدا بود و خدا بود

اور پھر یہ بھی ؎

حضرتِ برہمؔ نے فرمایا پسند اس رائے کو[1] اونٹ کو زیبا ہے تانت اور تیلیس گائے کو
انکو بڑھنا چاہیئے اور ہم کو بچنا چاہیئے ہوم رول انکو مبارک ہم کو تقوی چاہیئے

اس طرح کے اشعار گاندھی نامہ میں بیسیوں ہیں اور یہی کتاب کی اصل جان یا روح ہیں۔

---

[1] حکیم برہمؔ فتحپوری اپنے زمانہ کے ایک طبیب، ادیب و شاعر تھے، زیادہ شہرت بہ حیثیت ایڈیٹر اخبار مشرق (گورکھپور) پائی۔ اونٹ سے اشارہ حضرت اکبرؔ کی زبان میں مسلمانوں اور گائے سے ہندوؤں کی جانب ہوتا ہے۔

(۱۰) کُلّیاتِ جدید اکبر الہ آبادی

گردوں کے ستم دیکھے، اجڑا ہوا گھر دیکھا | دیکھا تو نہ جاتا تھا ناچار مگر دیکھا

ترنم کی توقع نہ رکھئے۔ حضرت اکبر خود بھی اپنے کلام کو تحت اللفظ سادہ لہجہ میں پڑھتے تھے۔

اکبر الہ آبادی، جیسے کہ وہ ۱۹۲۰ء سے قبل تھے ان سے تو یقیناً آپ خوب واقف ہونگے۔ پڑھے لکھوں میں کون اُن سے ناواقف ہے؟ اب ذرا ان اکبر سے بھی سرسری ملاقات کر لیجئے جو نوجوان، جوان، ادھیڑ اور بوڑھے ہو چکنے کے بعد اب ۱۹۲۰ء میں ۷۵ سال کے ہو چکے ہیں اور دنیا سے رحلت فرمانے کا زمانہ ڈیڑھ ہی دو سال باقی رہ گیا ہے۔ کلام میں جتنی پختگی آنی ممکن تھی سب آ چکی ہے۔ جس غزل کا مطلع ابھی عرض ہوا ہے، یہ اسی زمانہ کی ہے یہ دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

اب آنکھ اُٹھانا ہے ایمان کی بربادی | اُس بُت کی نظر دیکھی اور اسکا اثر دیکھا

دوسرے کے بعد تیسرا اور چوتھا شعر ؎

تکبیر ہی اچھی تھی تقریر میں تھے جھگڑے | ترک ہم نے کیا اسکو جس شور میں شر دیکھا
دنیا کی یہ زینت ہے، عقبیٰ کی وہ ہیں و علمے | غافل نے اِدھر دیکھا، عاقل نے اُدھر دیکھا

لہ نشریہ لکھنؤ ریڈیو سے، ۲۷ جنوری ۱۹۴۲ء کی شام کو، وقت ۱۵ منٹ

پوری غزل میں بارہ شعر ہیں۔ مقطع دو ہیں دونوں سننے کے قابل ہے

اس عہد میں اے اکبر ہم اسکو ولی سمجھے　　تھوڑا سا بھی حسن دل میں اللہ کا ڈر دیکھا
صد شکر مری نظریں جھپکیں نہیں اے اکبر　　دنیا بھی بہت چمکی بت نے بھی سنور دیکھا

آخر عمر تک پہونچتے پہونچتے اور دنیا کے گرم سرد کے تجربے ہوتے ہوتے مذہبیت یوں بھی آجاتی ہے اور پھر حضرت اکبر تو ماشاءاللہ شروع ہی سے اپنی شوخی اور شوخ کلامی کے ساتھ ساتھ بڑا گہرا مذہبی رنگ اور بڑی گہری عرفانی نظر رکھتے تھے۔ منزل پیری پر پہونچے تو واقعی ایک شیخ وقت یا مرشد طریق بن چکے تھے۔ توحید، معرفت، فنا و عبرت کا رنگ کلام میں جھلکتا ہوا ہمیشہ سے تھا، اب غزل کے جام سے بھی یہی مضمون چھلکنے لگا، اور قطعہ ہو یا رباعی، مثنوی ہو یا غزل، ہر صنف کلام سے یہی چشمہ ابلنے لگا۔

ردیف الف کی ایک غزل کا نمونہ آپ ابھی سن چکے۔ اسی ردیف کی ایک دوسری مختصر غزل کے بھی دو ایک شعر ملاحظہ ہوں ؂

ہے فضول نمائش جاہ و حشم، ہے عبث یہ ذخیرۂ سیم و طلا
جو ترے نہوئے تو وہ کچھ نہ ہوئے، جنھیں تو نہ ملا انھیں کچھ نہ ملا

ترے ذکر کا ملتا رہے جو صلہ، نہیں عمر کے ضعف کا مجھکو گلا
مجھے عذر نہیں مجھے اب بھی چلا، مگر اپنا ہی ساغر شوق پلا

اور ایک اور شعر حصۂ غزلیات ہی کا ہے ؂

واعظ بنا وہ اسکا، پیرو ہوا یہ اسکا　　اِس نے خدا کو جانا، اُس نے خدا کو مانا

مفہوم بالکل ظاہر ہے احکام الٰہی کا جو محض زبانی وعظ کہتا رہتا ہے اُسے خدا کا جاننے والا تو بے شک کہہ سکتے ہیں لیکن خدا کا ماننے والا تو وہی کہلائے گا جو ان احکام پر عمل بھی کرتا ہو۔

کلام کے ان نمونوں سے بدگمانی نہ گزرے کہ آخر عمر میں حضرت اکبر صرف اخلاقی یا واعظانہ رنگ کے شاعر رہ گئے تھے۔ اور ظرافت کا سرچشمہ خشک ہو چلا تھا۔ تردید کے لئے کلیات چہارم کا مفصل مطالعہ کافی ہو گا۔

سنہ ۲۰ء میں برسات رکی ہوئی تھی اساڑھ جیٹھ کی طرح تپتا رہا اور ساون کورا نکل گیا۔ اسی پس منظر کو پیشِ نظر رکھ کر ظرافت کے چھینٹوں اور شوخی کی پھواروں کا ذرا لطف اُٹھائیے ؎

ساون بھی بادلوں کو اس سال ہو ترستا — گرمی نہیں کھسکتی، پانی نہیں برستا
حلوائیوں کو بھی ہو گرمی سے تلخ کامی — پوری سزا ملی ہو، خود ہو رہے ہیں خستا
کرنا پڑے گی باہم یاروں کو چشم پوشی — بازار میں جو ان کو کپڑا ملا نہ سستا

یہ حلوائیوں کی میٹھی میٹھی باتوں کے مقابلہ میں "تلخ کامی" کیا خوب اور "پوری" اور "خستہ" کی خوشبوئیں تو یقین ہے کہ ایتھر کی لہریں طے کرتی ہوئی آپ سب تک پہنچ رہی ہوں گی! پھر تیسرے شعر کا بلیغ مضمون یہ سماں پیش کر رہا ہو کہ خشک سالی کے باعث گرانی ہو گئی ہے اور گرانی کا اثر کپڑے پر بھی پڑا ہو" غریبوں کو تن پوشی بھی پوری طرح میسر نہ رہی نتیجہ یہ ہوا کہ حیا داروں کو خود ہی نظریں نیچی کر لینی پڑیں۔

حضرت اکبر کا زمانہ وفات ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء کا ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے وسط تک ان کے

کلام کا جو مجموعہ تھا، اور اس میں جتنے حصّہ کو وہ قابل اشاعت سمجھتے تھے، وہ انکی زندگی ہی میں انکے کلیات کے تین حصوں میں شائع ہو چکا تھا۔ کچھ حصہ چھپنے سے انھوں نے اسوقت بھی چھوڑ دیا تھا۔ بے حد ذہین اور نہایت پُرگو تھے۔ چھوٹی بڑی ہر چیز پر کچھ نہ کچھ فرماتے ضرور۔ کبھی کسی شعر کو تو وقت کی سیاسی مصلحتوں سے چھپا ڈالتے اور کبھی کسی شعر کی اشاعت سے دوسر دل کی ناگواری یا دل آزاری کا انکو گمان گزرتا اسے بھی دبا دیتے۔ اور پھر جس شعر سے اُن کی خودداری پر زد پڑتی، یعنی شوخی، نیم عریانی کی حد تک پہنچ جاتی اسکی اشاعت بھی گوارا نہ رکھتے۔ وسط ۱۹ء سے لیکر ستمبر ۲۱ء تک جو کچھ فرمایا وہ سارا مسودہ بے ترتیب اور منتشر کاپیوں پر انکے ہاتھ سے لکھا ہوا اب تک پڑا رہا اور ۴۸ء میں جب ان کے صاحبزادہ کا بھی انتقال ہو لیا، جب کہیں انکے پوتوں نے اسکی اشاعت کی اجازت دی۔ کتابستان (الہ آباد و کراچی) نے اس مجموعہ کو کلیاتِ اکبر حصہ چہارم کے نام سے حال میں شائع کیا ہے اور افسوس ہے کہ نہ کتاب کی ترتیب و تہذیب میں اپنی کسی خاص خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے اور نہ صحت کتابت و طباعت میں کسی معمولی سی توجہ و محنت کا۔ نتیجہ یہ ہے کہ غلطیاں بڑی کثرت سے رہ گئی ہیں، یہانتک کہ مصرعے کے مصرعے غیر موزوں ہو گئے ہیں۔ پھر اکبر کی شاعری تو بڑی حد تک واقعاتی شاعری تھی۔ اپنے دور کے بکثرت واقعات کی طرف وہ اشارہ کرتے جاتے تھے۔ ان تلمیحات سے لطف اُٹھانے بلکہ محض سمجھنے کے لئے کثرت سے نوٹ اور حاشیے لازمی تھے۔ اسکا خیال بجز آخر کے چند صفحوں کے اور کہیں بھی نہیں رکھا گیا ہے۔ ان

بڑی اور اہم فروگذاشتوں نے افسوس اور سخت افسوس ہو کہ کتاب کا لطف بہت کچھ کھو دیا ہے اور اندیشہ قوی ہے کہ کہیں اسکا اثر خود شاعر کی شہرت و عظمت پر نہ پڑے۔ لیکن جو صاحب فہم و ادراک ہیں، وہ خود ہی سمجھ لیں گے کہ لذیذ سا لذیذ کھانا بھی اگر بد سلیقگی کے ساتھ کثیف اور گندی پلیٹوں میں نکال کر میلے کچیلے دستر خوان پر چن دیا گیا ہے تو اس میں پکانے والے غریب کا کیا قصور؟

بہر حال آپکی خدمت میں جو کلام پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ اسی کلیات سے ہے۔ ضخامت کچھ زیادہ نہیں۔ ۲۰×۲۲ کی تقطیع پر ۱۰۰ صفحہ کی ہے۔ آپ نے ابتک ردیف الف کی سیر کی۔ اجازت دیجئے کہ ورق اُلٹنے سے قبل دو تین شعر اور اسی ردیف کے عرض کر دئیے جائیں۔ ایک غزل ہے "سامان نہیں دیکھا" "پریشاں نہیں دیکھا" کی زمین میں۔ اس میں یہ دو شعر جو اکبر حکیم و عارف نے نکالے ہیں، یہ انھیں کا حصتہ تھا ؎

غفلت میں تو پیری بھی نظر آتی ہو خود بیں	عبرت میں جوانی کو بھی نازاں نہیں دیکھا
جب مادّہ غائب ہو، گداز آئے کہاں سے	شمعوں کی طرح لمپ کو گریاں نہیں دیکھا

موم بتی اور لمپ کے فرق سے یہ ندرت مضمون کیا خوب پیدا کی ہو! —— اسی کے متصل ایک سیاسی رنگ کی غزل میں "اقبال انکا" "چنگال انکا" میں فرماتے ہیں، اور خوب خیال کر لیجئے کہ ۱۹۴۶ء و ۱۹۴۷ء میں نہیں بلکہ لارڈ رڈینگ کے گوراشاہی دبدبہ اور جبروت کے عین شباب میں، ۱۹۲۱ء میں اکبر کی نگاہ کشفی نے انکی زبان سے یہ کہلا دیا تھا ؎

اس تمنا کے بر آنے میں بہت دیر نہیں	یعنی ہم صیغۂ ماضی میں سنیں حال انکا

"حال" کے معنی یہاں قصہ و سرگذشت کے ہیں، لیکن ماضی کے تلازمہ نے اس میں جان بھی کیسی ڈال دی ہے۔

ردیف الف ختم ہوئی۔ ایک سرسری اچٹتی ہی ورق گردانی آگے بھی سہی لیکن کہیں کہیں تو کوئی شعر بہر حال حلقۂ زنجیر بنکر رہے گا۔ ردیف "ر" کے ان دونوں شعروں نے ۲۰ء و ۲۱ء دور تحریک خلافت و ترک موالات (نان کوآپریشن) کی یاد یں تازہ کر دیں۔ الہ آباد کے مولانا شاہ محمد فاخر اور فرنگی محل کے مشہور عالم و پیشوا مولانا عبد الباریؒ کی صورتیں نظر کے سامنے کر دیں۔

پہلا شعر ؎

سرکار تو ہیں شاد کہ گاندھی ہوئے حاضر　　اور قوم ہے مغموم کہ پکڑے گئے فاخر

گاندھی جی لارڈ ریڈنگ کی طلبی پر ان سے ملنے گئے تھے۔

اور دوسرا شعر ؎

اے چرخ ہوائے شوق چلے، اے شاخ عمل گلباری کر
کچھ سعی کریں، کچھ کام کریں، ہر شیخ کو عبد الباری کر

حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابو الکلام آزاد، پنڈت مدن موہن مالوی، ان سب کا ذکر کہیں نام کی صراحت کے ساتھ اور کہیں اشارے کنائے میں اس مجموعہ کے اندر موجود ہے اور گاندھی جی اور علی برادران کا تذکرہ تو قدرتاً بہت زائد ہے۔ کہیں مدح و توصیف کے ساتھ اور کہیں ہجو و تعریض کے لہجہ میں۔ سیاسیات پر انھیں جو کچھ کہنا تھا اسے اکثر تو اپنے حسب عادت وہ دل لگی ہی کی لپیٹ میں کہہ گئے ہیں مثلاً اس شعر میں ؎

غرض اس سے نہیں مجھکو بنی ہے یہ زمیں کیونکر — یہ فرمائیں میسر آئے گی نان جویں کیونکر

کہیں کہیں انکی ظریفانہ شاعری کی جان صرف انکا لفظی داخل خارج ہوتا ہے اور اگر سننے والے کی نظر اس طرف نہیں گئی تو شعر بے معنی معلوم ہوگا، چنانچہ اسی رنگ کا یہ شعر ہے ؎

داد کیسی روٹی کی لالچ سے ہے یہ واہ وا — شعر تو "دادی" ہے لیکن واہ وا "نانی" ہے فقط

اسکے دوسرے مصرعہ سے لطف اٹھانے کے لئے لازمی ہے کہ یہ ذہن نشین رہے کہ "دادی" یہاں صفت ہے "داد" کی اور "نانی" صفت ہے "نان" کی اور دونو کا ذکر پہلے مصرعہ میں آچکا ہے۔

بعض غزلیں صرف دو شعروں کی ہیں۔ لیکن ان دو میں ایک ایک شعر کہنا چاہئیے پورے دیوان کی معنویت رکھتا ہے۔ یہ مبالغہ نہیں آپ بھی سنکر تائید ہی کریں گے، شعر ملاحظہ ہوں ؎

ملی ہیں دل سے جو مجھکو وہ نازک اطلاعیں ہیں — خدا ہے اور فطرت ہے اثر اس ہی کی شعاعیں ہیں

جوانی کی، بہار باغ کی، عمر دو روزہ کی — مرے دیوان کی نظموں میں کیا کیا الوداعیں ہیں

عارفانہ رنگ میں پہلا شعر اور عاشقانہ رنگ میں دوسرا شعر تو دامن نظر کو کھینچے بغیر کسی طرح نہیں رہیں گے ؎

اخبار میں مرا حال شائع نہ کردہ — مصروف دعا ہوں، وقت ضائع نہ کردہ

سیاسیات وقت سے اکبر کی دلی بیزاری تو اس شعر میں آگئی اور دوسرے میں انکے سارے فلسفہ الٰہیات کا نچوڑ آگیا ہے ؎

جتنا زمانہ حشر کے پہلے ہے سب ہے آج — کہتا ہوں کل میں صرف قیامت کے روز کو

ردیف ہی، قدرتاً ذرا لمبی ہے، دو چار منٹ اسکی سیر میں بہر حال لگ جائیں گے

وحدت الوجود کے مضمون کو فارسی اور اردو کے بہت سے صوفی شاعروں نے اپنے اپنے رنگ میں ادا کیا ہے۔ اب ذرا اکبر کا کمال دیکھئے کہ کس لطافت اور جامعیت کے ساتھ اس سارے دریا کو دو ایک لفظوں کے کوزہ میں بند کر دیا ہے، ملاحظہ ہو ؎

خرد پوچھتی ہے یہ کیا ہو رہا ہے　　صدا دے دلی ہے خدا ہو رہا ہے

"خدا ہو رہا ہے"۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے یہ سب خدا ہی کے ظہور کی شانیں ہیں اس کو اس نادر اسلوب سے ادا کرنا حصہ ہے اکبر کا۔ اسی لَے میں ایک اور گیت ؎

کیا بتاؤں سخن ہوش ربا کے معنی　　خود بخود دکھ رہی معنی جو خدا کے معنی

اور اس سے بھی بڑھ کر ؎

یہ مصرعہ میرے ہوش کو کھو رہا ہے　　وہی تھا، وہی ہے، وہی ہو رہا ہے

"صاحب" پر چوٹیں، ہلکی اور لطیف چوٹیں تو اکبر کی شاعری کی جان تھیں۔ سیاسی گفت گوئیں، آج کی صحبت میں مناسب نہیں، لیکن اتنا سن لینے میں تو کوئی مضائقہ بھی نہیں ؎

شکر اسکا بھی ہے واجب، انکی خدمت بھی ضرور　　جان دی اللہ نے اور نوکری صاحب نے دی

طریقت اور شریعت کا جھگڑا صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اکبر صاحب ایک اشارہ کر دیتے ہیں اور دونوں کے گلے خود بخود مل جاتے ہیں ؎

یہی الفاظ کہہ کر ذہن خفتہ کو جگاتا ہے　　شریعت سر جھکاتا ہے، طریقت دل لگاتا ہے

یہی مضمون بدلے ہوئے لفظوں میں ؎

شریعت کی بہ دل تعمیل ہو بس یہ تصوف ہے ۔۔۔ نہ صورت کا تصنع ہے نہ مضموں کا تکلف ہے

اور اس سے بھی زیادہ ہلکے پھلکے لطیف و نرم انداز میں ؎

شریعت ہے تم پر، طریقت ہے تم میں ۔۔۔ شریعت طریقت کو کیا پوچھتے ہو

اور اس بحث میں بالکل حرف آخر یہ قطعہ ؎

شریعت میں ہے صورت فتح بدر ۔۔۔ طریقت میں ہے معنی شق صدر

نبوت کی اندر ہی ہیں دونوں رنگ ۔۔۔ عبث ہے یہ ملا و صوفی کی جنگ

قطعات اور رباعیات کے حصہ میں خوب خوب گل کھلائے ہیں۔ وقت یہ ہے کہ تحریک خلافت و ترک موالات زوروں پر ہے، ہندو مسلم میل ہو رہا ہے اور ملک کے سیاسی ولولے ہر طرف خوب ہی بڑھے ہوئے ہیں۔ اکبر اس سارے تماشہ کو دیکھتے ہیں مگر وہی جیسے کوئی صوفی گوشہ نشین اپنی خانقاہ میں بیٹھا ہوا دنیا کے اتار چڑھاؤ اور سلطنتوں کے انقلاب کو دیکھا کرتا ہے اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے کوئی نعرہ مستانہ و رندانہ لگا دیتا ہے۔ کبھی تو چہرہ پر ظرافت کا نقاب ڈالے ہوئے مثلاً ؎

نئی روشنی کا ہوا تیل کم ۔۔۔ حکومت نے اس سے کیا میل کم

ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے ۔۔۔ نہ آفس میں تھے نہ کرسی میں تھے

یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے ۔۔۔ سیاسی کمیٹی میں پل جائیے

اسی میل کا آجکل ہے ظہور ۔۔۔ خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور

اور کہیں سیدھے سادے بول میں ؎

چکر میں ہو آج ہسٹری بھی | چرخہ بھی ہو اور منسٹری بھی
مرکز سے بہت ہٹے ہوئے ہیں | میدان میں مگر ڈٹے ہوئے ہیں
جن پر ہے خدا کی مہربانی | دونوں کو سمجھتے ہیں وہ فانی

اور کہیں خوان تو ظرافت کا ہے لیکن اس کے اندر لگی ہوئی نعمتیں معرفت و ذکر آخرت کی ہیں ؂

ہے چھتری ہی بھی چھپ نہ پایا ہو نہ پایا کہ ہے | بوری بھی خشک لب ہو کہ کبھی چھ چھٹانک ہے
کپڑا اگر اس ہو ستر ہے عورت کا آشکار | کچھ بس نہیں زبان پر فقط ڈھانک ڈھانک ہے
بھگوان کا کرم ہو سودیشی کے بیل پر | لیڈر کی کھینچ کھانچ سے گاندھی کی ہانک ہے
اکبر پہ بار ہے یہ تماشائے دل شکن | اس کی تو آخرت کی طرف تاک جھانک ہے

انکا اصلی مذاق طبیعت تو یہ ہے ؂

پتلون کے بٹن سے دھوتی کا پیچ اچھا
دونوں سے وہ جو سمجھے دنیا کو ہیچ اچھا

اور اس بنا پر اپنے وقت کی تحریکات اور جوش و خروش کو رشک و حسرت کی نظر سے نہیں صرف عبرت کی نظر سے دیکھ کر رہ جاتے ہیں ؂

نہ دلوں میں اب ہے وہ ذوق حق، نہ دعا کا یاد ہے وہ سبق
نہ وہ آہ ہے نہ وہ شوق ہے، نہ وہ تیر ہے نہ کمان ہے
نہ کمیٹیوں کی ترنگ اسے، نہ ہوائے حلۂ جنگ اسے
کرے کیا اب اکبر مضمحل، نہ وہ طفل ہے نہ جوان ہے

اب ان کی آخری گزارش انھیں کے لفظوں میں سن کر بہتر ہوگا کہ

حکمت و دانش کی اس محفل کو اسی نقطہ پر برخاست ہو جانے دیجئے سو اتنا ہی گزارش کرنا ہے، ہر ایک کو اکٹن مرنا ہے

ایشور کی خوشی تو ہمیں ہے شیطان ہی ہوگا باپ سے خوش
بابو تو پریس کے اندر ہیں، اور پنڈت محو مسند ہیں
بھگوان نے جسکو جیسا کیا، وہ چھاپ سے خوش یہ جاپ سے خوش
عیسیٰ نے دل روشن کو لیا اور تم نے فقط انجن کو لیا
کہتے ہیں کہ وہ تھے باپ سے خوش، اور تم ہو خالی بھاپ سے خوش
میں خلق کی حالت جانچوں گا، تو قد کی بلندی دیکھا کر
ہے یہ تو نگاہ اپنی اپنی میں وزن سے خوش تو ناپ سے خوش

(۱۱) نیا کلام اکبرؒ[1]

نئے کلام اکبر سے مراد ظاہر ہے کہ ان کا تازہ کہا ہوا کلام نہیں ہو سکتا جبکہ حضرت اکبر کی وفات ہی کو ۲۷ سال ہو چکے۔ بلکہ مراد اُن کا تازہ چھپا ہوا کلام ہے۔ اس حکیم، ظریف، عارف شاعر کے تین کلیات اُسکی زندگی میں ۱۹۱۹ء تک شائع ہو چکے تھے۔ وفات ستمبر ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ دو ڈھائی سال کا کلام اب تک قلمی بیاض کی صورت میں خود شاعر کے ہاتھ کا لکھا ہوا شاعر کے خاندان میں محفوظ ہے۔ صاحبزادہ ایک ہی تھے۔ وہ خدا معلوم کن مصلحتوں سے بار بار کی یاد دہانیوں اور تقاضوں کے باوجود اُسے عمر بھر دبائے رہے۔ اب جب کوئی تین سال ہوئے انکا بھی انتقال ہو گیا، تو مسودہ کتابستان والہ آباد (کراچی) کے حوالہ کیا گیا اور اس ناشر نے کلیات اکبر حصہ چہارم ۲۰×۲۶ کی تقطیع پر ۱۰۰ صفحہ کی ضخامت کا شائع کیا ہے۔ قیمت چھ روپیہ رکھی ہے، جو گرانیوں کے اس زمانہ میں بھی عجب نہیں اکثر شائقین کو گراں معلوم ہو ——— اچھے ناشر کا کام مسودہ کو جوں توں لشتم پشتم چھاپ ڈالنا ہی نہیں۔ کتاب کو صحت کتابت وطباعت کے انتہائی اہتمام واحتیاط اور ضروری حاشیوں کے ساتھ مرتب ومہذب کرنا بھی ہے۔ قیمت کی گرانی دلوں پر یقیناً گراں نہ گزرتی اگر ناشر نے اپنے فرائض کو درجہ اوسط میں بھی پورا کر دیا ہوتا۔ اور اپنے کمال بے توجہی و بے احتیاطی سے غلطیوں کی پوٹ شاعر غریب کے نامۂ اعمال میں نہ لکھا دی ہوتی!

---

[1] صدق (لکھنؤ) مورخہ ۴ر مارچ ۱۹۴۹ء، ۱۰ر مارچ و یکم اپریل و ۲۲ر اپریل و ۱۳ر مئی و ۴ر جون ۱۹۴۹ء اب ناشر کتابستان بندر روڈ کراچی

اس افسوسناک اور تکلیف دہ لیکن نہایت ضروری تنبیہ کے بعد اب اصل کتاب کا مطالعہ شروع فرمائیے۔

اکبر کا یہ کلام ان کے بالکل آخری دور کا ہے۔ زبان خوب منجھ چکی۔ استاد تو پہلے ہی سے تھے اب استادی اپنی پختگی کو پہنچ چکی تھی۔ سن کوئی ۷۴ ، ۷۵ سال کا۔ سخن گوئی اور سخن سنجی کی ساری منزلیں طے کئے ہوئے۔ قوائے جسمانی میں ضعف و اضمحلال جو کچھ بھی پیدا ہو چکا ہو، قوائے ذہنی و روحانی اپنے نشو و نما کے کمال کو پہونچے ہوئے۔ غزل کہنے جو بیٹھتے تو جوش و ولولہ کے مظاہرے کی جگہ حکمت و معرفت کے موتی بکھیرتے اور جوانی گزار کر جو کچھ سیکھا تھا، اُسے دوسروں کو سناتے، سکھاتے، بتاتے۔ اس دور کی غزلوں کا رنگ ملاحظہ ہو ؎

بھری بھی رت تو میں نشو و نما کو کیا کرتا نہ تھی وہ نکہت گل پھر صبا کو کیا کرتا
ارادہ تھا کہ میں ہستی سے کر لوں قطع نظر نہ ہو سکا مگر ایسا خدا کو کیا کرتا

یہ آخری مصرعہ ممکن نہیں کہ آپ مکرر نہ پڑھیں۔ "خدا کو کیا کرتا" کیا لاجواب بے مثال ٹکڑا لگایا ہے معنی کا ایک دفتر کا دفتر اس ذرا سے فقرہ میں بند کر دیا ہے بتشریح جتنی چاہیے کرتے چلے جائیے۔ جو بھی ارادہ کیا، جیسی جیسی بھی پختہ تدبیریں کیں، ارادہ الٰہی پر سب غالب، خدائی تدبیر سب پر حاکم۔ خدا کو مانے بغیر کوئی عذر پیش ہی نہیں چل سکتا ——— اور آگے چلئے ؎

زندگی کرتی ہی رہتی ہے مصیبت پیدا باخدا اس میں بھی کر لیتے ہیں لذت پیدا

اب تک ہیں انھیں حالتِ سابق کا تصور — یاروں نے مرا خانۂ ویراں نہیں دیکھا
ایک بار نظر آیا خزاں کا جو تصرف — پھر ہم نے کبھی سوئے گلستاں نہیں دیکھا

آخر کے دو شعر خاص اکبری رنگ کے ہیں یہ تخیل کسی اور کے حصہ میں آئی ہی نہیں ہے ؎

غفلت میں تو پیری بھی نظر آتی ہے خود بیں — عبرت میں جوانی کو بھی نازاں نہیں دیکھا
جب مادہ غائب ہو گداز آئے کہاں سے — شمعوں کی طرح لیمپ کو گریاں نہیں دیکھا

شمع اور لیمپ دونوں کو ہم آپ سب ہی بار بار دیکھ چکے ہیں دونوں کے فرق سے یہ شاعرانہ مضمون پیدا کرنا اکبر ہی کا حصہ تھا۔

ردیف الف کا نمونہ تغزل ناتمام رہ جائے گا اگر ایک مختصر سی غزل کے یہ دونوں مطلع آپ تک نہ پہونچے۔ ایک ایک شعر ایک ایک دیوان کے برابر ہے ؎

ہے فضول نمائش جاہ و حشم رہے عبث یہ ذخیرۂ سیم و طلا
جو ترے نہ ہوئے تو وہ کچھ نہ ہوئے، جنھیں تو نہ ملا انھیں کچھ نہ ملا
ترے ذکر کا ملتا رہے جو صلا نہیں عمر کے ضعف کا مجھکو گلا
مجھے عذر نہیں مجھے اب بھی جلا، مگر اپنا ہی ساغر شوق پلا

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ تو اس قابل ہے کہ زبانوں پر چڑھکر ضرب المثل بن جائے اور انشاء اللہ بنکر رہے گا ع

جو ترے نہ ہوئے تو وہ کچھ نہ ہوئے جنھیں تو نہ ملا انھیں کچھ نہ ملا

ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حسن زمانہ کا یہ کلام ہے وہ وسط سنہ ١٩١٩ء

خلق صورت میں کبھی کرتی ہو معانی کی تلاش   اور وہ معنی سے کبھی کر لیتے ہیں صورت پیدا

اب اکبر معنویت کی جس بلندی پر ہیں اسکا کچھ اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا ذیل کی غزل پڑھئے جو خاصی بڑی بارہ شعروں کی ہے ایک ایک شعر پر وجد آ جائے گا ؎

گردوں کے ستم دیکھے اجڑا ہوا گھر دیکھا   دیکھا تو نہ جاتا تھا ناچار مگر دیکھا
اب آنکھ اُٹھانا ہے ایمان کی بربادی   اُس بُت کی نظر دیکھی اور اسکا اثر دیکھا
تقدیر مخالف تدبیر ہوئی قاصر   ممکن تھا جو کچھ ہم سے سب ہم نے وہ کر دیکھا

شعر ارشاد ہوا ہے ؎

تکبیر ہی اچھی ہے تقریر میں تھے جھگڑے   ترک ہم نے کیا اسکو جس شور میں شر دیکھا

(اور کون "شور" ایسا ہے جس کے اندر "شر" شامل نہیں ؟)

دنیا کی یہ زینت ہے عقبیٰ کی وہ ہیں وعدے   غافل نے اِدھر دیکھا عاقل نے اُدھر دیکھا
قرآن میں آیا ہے ان کان لہ قلب   افسوس کہ سینوں میں کم دل کا اثر دیکھا
دریا میں رہا ڈوبا تب موتی میں آب آئی   بینا ہوئی آنکھ اسکو جب اشک سے تر دیکھا

مقطع دو ہیں اور دونوں نقل ہونے کے قابل ؎

اس عہد میں اے اکبر ہم اسکو ولی سمجھے   تھوڑا سا بھی جس دل میں اللہ کا ڈر دیکھا[1]
صد شکر مری نظریں بھٹکی نہیں اے اکبر   دنیا بھی بہت دیکھی بتخانے بھی سنور دیکھا

پانچ شعروں کی یہ غزل پوری کی پوری سننے کے لائق ہے ؎

احباب گزشتہ نے یہ سامان نہیں دیکھا   اچھے گئے ملت کو پریشاں نہیں دیکھا

---

[1] کلیات میں یہ مصرعہ غلط چھپا ہے۔

سے لیکر ستمبر ۱۹۲۱ء تک کا زمانہ ہے اور عین یہی دور تحریک خلافت و تحریک ترک موالات کے عروج کا تھا۔ تاریخ ہند میں ایک انقلابی اور سخت بحرانی دور، اکبر کی شاعری تو بڑی حد تک واقعاتی شاعری رہتی ہی تھی، واقعات عصری کے اشارے کنائیے کیا معنی صراحتیں تک انکے کلام میں ملتی ہیں۔ ٹھیک انھیں کی زبان اور انھیں کی روزمرہ میں، ایک غزل ہے "اقبال انکا" "چنگال انکا" کی زمین میں۔ مطلع کا دوسرا مصرعہ ہے ع

ہیں گاندھی کو چھپا لیتا ہو اقبال انکا

اسی غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اس تمنا کے بر آنے میں بہت دیر نہیں یعنی ہم صیغۂ ماضی میں سنیں حال انکا

حال ظاہر ہے کہ یہاں سرگزشت کے معنی میں ہے "صیغۂ ماضی" نے اس حال کو کیسا روشن کر دیا! کہنا چاہیئے قال میں حال، کا رنگ بھر دیا ہے۔

داڑھی والوں کو تو مدت سے نکار کھا تھا آج چٹیا پہ بھی حاوی ہو گھر بال انکا

داڑھی اور چٹیا کی تلمیحیں بالکل کھلی ہوئی ہیں۔

یہ رنگ جب غزل تک میں نمایاں ہو تو رباعیات وقطعات میں کیوں نہ ہوتا۔

اس وقت شیخ جی کو گاندھی سے میل سوجھا صاحب نے روک چاہی انکو بھی کھیل سوجھا

دونوں نے آخر اپنی نکاس دیکھی اسکیم انکو سوجھی اور انکو جیل سوجھا

جسے یاد ہے کہ عین اس زمانہ میں مانٹیگو کی "ریفارم اسکیم" کا ظہور ہو چکا تھا اسی کے معاً بعد گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندیوں کو جیل جانے کا سودا سوار ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ لیگا کہ یہ شاعری نہیں، عین تاریخ نگاری ہے۔

شعر و غزل کہتے جاتے ہیں۔ اہل مشاعرہ کا دل گرماتے جاتے ہیں پھر بھی باطن کی بیداری سے غافل نہیں ہوتے۔ اللہ کا نام لیتے جاتے، اور آخرت کی یاد دلائے جاتے ہیں

دنیا کی طمع میں وہ پھسلا، اور میں نے خدا کا نام لیا
لغزش میں وہ خاک آلود ہوا اور صبر نے مجھکو تھام لیا
ظاہر کا ادب ملحوظ رہا، باطن بھی مگر محفوظ رہا
واعظ سے ادھر ایک بات سنی، ساقی سے ادھر اک جام لیا

یہی نغمہ ایک دوسرے ساز میں ؎

جہانِ فانی کے حادثوں کا خیال کبتک کیا کرے گا
جو ہو رہا تھا وہ ہو رہا ہی، جو ہو رہا ہے ہوا کرے گا
کہاں تک اخبار ہونگے شائع نہ کر عبادت کا وقت ضائع
کمیٹیاں قبر میں نہ ہونگی نہ تو ہمیشہ جیا کرے گا

درس معرفت ایک رباعی کے قالب میں ؎

نہ راجگی کا مجھے شوق ہو نہ شاہی کا	اگرچہ میں بھی ہوں طالب مگر خدائی کا
یہ وعظ مغرب اور اسکا اثر یہ ملّت پر	بنا ہے شوق ترقی سبب تباہی کا

آخری مصرعہ مکرر پڑھیے "بنا ہے شوق ترقی سبب تباہی کا" اور دیکھیے ذرا سے مصرعہ میں کتنی گہری اور جامع بات سنا دی کہیں کہیں محض لفظی بلکہ حرفی داخل خارج سے ایک طرفہ لطف پیدا کر دیا ہے مثلاً ؎

اور رنگ سیب کی نہ رہی "بو" تو دیکھیے	انگریز کا ظہور ہوا نقش جم گیا

"اورنگ زیب" کی املا سے "ب" اور "و" نکال دیجئے تو حروف کا جو مجموعہ رہ جائے گا انگریز کا املا اسی سے بنے گا۔ اور کہیں کہیں ندرت قافیہ کی بہار دکھائی ہے۔ ؎

ہمارے دوست ہیں سنہا ہمارے لارڈ ہیں سنہا[1]

ہماری طبع ساتھ انکے ہے ظاہرا و باطنہا

شعر سننے سے قبل کوئی بھی خیال کر سکتا تھا کہ 'سنہا' کا قافیہ 'باطنہا' لائیں گے۔

لیکن اکثر تو ایک ایک شعر خاتم حکمت و معرفت کا نگین ہے ؎

حُسنِ بُت دیر میں کھینچے لئے جاتا ہے انھیں کیا نتیجہ ہے برہمن سے کھنچے رہنے کا

فرنگی حکومت سے بیزاری، لیکن عین فرنگیت میں خود رنگ جانا، اس عام ذہنیت پر کتنی لطیف تعریض ہے!

(۲) دل نے کہا کہ گاؤ یہ پوچھا جو اس سے گائیں کیا

اُٹھیں تو انکا جال ہے بیٹھے رہیں تو کھائیں کیا

ہندی مسلم غریب کی بے بسی کی کتنی صحیح تصویر ہے۔

(۳) واعظ بنا یہ اُسکا پیرو ہوا وہ اُسکا اس نے خدا کو جانا اس نے خدا کو مانا

واعظ بے عمل پر فارسی و اُردو دونوں میں طنز بہت کچھ کیا جا چکا ہے لیکن اسلوب بیان کی اس ندرت کی مثال بھی مشکل ہی سے کہیں ملے گی۔

ضعف کا مضمون عاشق مزاج شعرا کثرت سے باندھتے آئے ہیں اور انتہائی لاغری وغیرہ کے نکتے طرح طرح کے اثر سے پیدا کئے ہیں لیکن خود

---

[1] بنگال کے آنریبل ایس پی سنہا جنھیں ۱۹۱۹ء میں لارڈ سنہا کا خطاب ملا تھا۔

ضعف و علالت کو ضعیف ثابت کرنے کا مضمون اکبر ہی کے لئے اُٹھ رہا تھا۔
فرماتے ہیں ؎

کمزور ہے میری صحت بھی، کمزور مری بیماری بھی
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا بیمار رہا تو مر نہ سکا

اور ہنسی ہنسی میں آخرت کی یاد دلا دینا اس رنگ میں تو اکبر کا کوئی حریف
ہی نہیں۔ کیا خوب ارشاد فرما گئے ہیں ؎

پتلون کے بٹن سے دھوتی کا پیچ اچھا
دونوں سے وہ جو سمجھے دنیا کو ہیچ اچھا

گویا خشک نثر میں حضرت اکبر ۱۹۲۰ء میں یہ فرما رہے ہیں کہ فرنگی حکومت پر تو سودیشی
حکومت کو یقیناً ترجیح ہے لیکن ان دنیوی حکومتوں میں کیا رکھا ہے اصل شئے
تو دین اور آخرت کی حکومت ہے۔

حسب ذیل خمسہ کے دو بند خدا معلوم کیوں ردیف 'ب' میں جگہ پا گئے ہیں،
پس منظر ابھی ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء والا پیش نظر رہے۔ یعنی تحریک خلافت و ترک
موالات پورے جوش پر ہے اور گاندھی جی کی یہ تعلیم زور شور سے جاری ہے
کہ انگریزی عہدے انگریزی خطابات، انگریزی عدالتیں، انگریزی اسکول اور
کالج چھوڑ چھاڑ ہمارے شریک ہو جاؤ۔ بہت سے اس وعظ کو دل کے کانوں
سے سن رہے ہیں اور بہت سے اِسے سنی ان سنی کر رہے ہیں۔ مصرعے مومن دہلوی
کے ایک مشہور شعر اور مصرعہ پر لگائے گئے ہیں ؎

جاہ و زر کے رہے انگلش سے ہمیشہ طالب
عہد پیری میں بدل سکتے کیوں کر قالب

مشتہر کردیں یہ ہمدم میں جناب جالب
عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن

آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

گو چہ سروس انگلش میں رہے ہم ساکن — جاہ و زر ہی کی تمنا میں کٹے زیست کے دن
وعظ گاندھی سے بدل سکتے ہیں کیونکر باطن — عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

ہمدم اس وقت "صوبہ متحدہ" بلکہ پنجاب کو چھوڑ کر باقی سارے ہندوستان کا مشہور ترین اُردو روزنامہ تھا۔ اور اس کے اڈیٹر سید جالب دہلوی کی بھی ایسی ہی شہرت تھی۔

حضرت اکبر کبھی کبھی فارسی بھی بے تکلف کہہ لیا کرتے تھے۔ انکے فارسی کلام کے نمونہ اس دیوان میں زیادہ ملیں گے، ردیف "د" میں تین تین مختلف غزلیں فارسی کی موجود ہیں۔ پہلی غزل کے دو شعر اور تیسری غزل پوری کی پوری اکبر کے مستقل پیام کی بہترین شارح اور ترجمان ہے ؎

(۱) نشان شوکت و گاندھی کجا بود — کہ اکبر صرف کشف ماجرا بود
بجائے ملک لیکن مدعا یش — خدا بود و خدا بود و خدا بود

(۲) روح را از تن مکانے دادہ اند — بے نشانے را نشانے دادہ اند
برہمن در دیر و من پیش حرم — ہر جبیں را آستانے دادہ اند

(۳) ہر نگہ یک رفتے دارد بہ پیش — ہر نظر را آسمانے دادہ اند
حال ہم دارد زبانے بہر گوش — ایں زباں را ہم بیانے دادہ اند

ردیف "ر" میں سیاسی تعریض اور اُخروی تبلیغ تو خوب ہی ہے ؎

(۱) غرض اس سے نہیں مجھکو بنی ہو یہ زمیں کیونکر
یہ فرمائیں میسر آئے گی نان جویں کیونکر

(۲) شک اسمیں کیا ہو کہ ساری دنیا ہو آج انکے رفل کے زد پر
اشارہ فطرت کا ہو مگر یہ کہ خود بھی ہیں وہ اجل کی زد پر

لیکن بعض شعر ایسے ہیں جو آج بالکل معمہ بن گئے ہیں انکے سمجھنے کیلئے ۱۹۲۱ء کی تلمیحات جاننا ضروری ہیں ؎

سرکار تو ہے شاد کہ گاندھی ہوئے حاضر اور قوم ہو مغموم کہ پکڑے گئے فاخر

اسکا قصہ یہ ہو کہ ۱۹۲۱ء میں لارڈ ریڈنگ وائسرائے نے سر سپرو (وزیر قانون حکومت ہند) اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے مشورہ سے ایک طرف تو مسلمانوں کو دبانا شروع کیا۔ چنانچہ انکے دو سب سے بڑے لیڈر ول محمدؐ علی وشوکت علی کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلا دیا اور دوسری طرف اس سے ذرا قبل گاندھی جی کو شرف باریابی سے نوازا گیا۔ الہ آباد کے مشہور خلافتی کارکن مولوی شاہ محمدؐ فاخر (دائرہ شاہ اجمل والے) بھی اسی زمانہ میں گرفتار ہوئے تھے۔

یا یہ شعر ؎

اے چرخ ہوائے شوق چلے اے شاخ عمل گلباری کر
کچھ سعی کریں کچھ کام کریں ہر شیخ کو عبدالباری کر

اسمیں اشارہ ہے فرنگی محل لکھنؤ کے نامور عالم و شیخ طریقت مولانا قیام الدین عبدالباری کی طرف جو "علی برادران" کے پیر و مرشد ہونے کے علاوہ خود بھی سیاسی لیڈر کی حیثیت رکھتے اور اپنی پُر جوش تقریروں کیلئے مشہور تھے۔
ردیف "سا" میں کل ایک ہی شعر ہو اور اسکے بھی سمجھنے والے اب عنقا ہو گئے ہیں ؎

دلگیر ہے مہماں مرے کیوں ہو نہ اسیر محبت کو ناز
اپنے لئے دل گیر ہیں میرے لئے ہیں دل نواز

دل گیر کو کوئی اگر صفت یا اسم نکرہ سمجھ کر شعر پڑھے گا تو مطلب کیا خاک سمجھے گا۔ "دل گیر" یہاں اسم معرفہ ہے۔ آگرہ (اکبرآباد) کے شاہ نظام الدین کا تخلص تھا۔ صوفی مشرب ہونے کے ساتھ ہی ایک ادبی ماہ نامہ "نقاد" کے نام سے نکالتے تھے۔ کئی سال تک اُردو کے ادبی حلقوں میں ان کے پرچہ کا بڑا چرچا رہا۔ کلیات اکبر کے مُرتّب توضیحی حاشیوں کی ضرورت ان تمام ضروری موقعوں پر نہ سمجھے اور اس طرح حضرت اکبر پر اچھا خاصہ ظلم کر دیا۔

ردیف "ش" میں ایک قطعہ میں دونوں مصرعے غیر موزوں چھپے ہیں صحیح یوں پڑھئے ؎

گورمنٹیوں میں بڑی عقل ہے ۔۔۔ مگر ان میں ایکا نہیں ہے نہ جوش
جو ہیں گاندھوی وہ ہیں اکثر اُجڈ ۔۔۔ مگر اک اُمنگ ان میں ہے اور جوش

کتاب میں "گورمنٹوں" اور "گاندہی" چھپا ہے جس سے وزن قائم نہیں رہتا۔

ردیف "ف" میں ایک شعر ایسا ہے جو ایک لفظی پیچ کی بنا پر غالباً پیچیدہ ہو گیا ہے اور بغیر تشریح کے بہتوں کی سمجھ میں نہ آئے گا فرماتے ہیں ؎

شعر تو دادی ہے لیکن واہ وا نانی ہے صرف ۔۔۔ داد کیسی روٹی کی لالچ سے ہے یہ واہ واہ

"دادی" یہاں رشتہ کے معنی میں نہیں بلکہ فارسی لفظ "داد" کی صفت ہے اسی طرح "نانی" سے بھی ذہن رشتہ کی طرف نہ جائے بلکہ یہ بھی فارسی لفظ "نان" کی صفت ہے اور جس کے لئے اردو لفظ روٹی پہلے مصرعہ میں آچکا ہے!

اس ردیف میں دیوان کی متعدد ردیفوں کی طرح غزل تو کوئی نہیں البتہ دو تین شعر مزہ کے ہیں مثلاً ؎

(۱)	دوا بھی ہو تو توجہ رہے خدا کی طرف	خودی سے کیجئے ہجرت بس اب خدا کی طرف
(۲)	کفر کا لاسا لگا دنیا کی زینت کی طرف	حرص سے اب کیجئے ہجرت قناعت کی طرف
(۳)	رُخ جو ہو ترکِ موالات کا عقبیٰ کی طرف	تیری آنکھیں اٹھیں زینتِ دنیا کی طرف

ایک بار پھر یاد کر لیجئے کہ ترکِ موالات کی طرح ۱۹۲۰ء میں تحریک ہجرت کا بھی بڑا زور ہندوستان میں رہ چکا ہے

ردیف "ک" میں کُل ایک ہی شعر ہے مگر سننے کے قابل ؎

دعائے سحر کو بنا اپنا پیک   دلِ صدق سے کہہ اَتَینا اِلَیک

آیاتِ قرآنی کی تضمین کی یہ مثال پہلی یا آخری نہیں ردیف "ت" میں بھی ایک شعر اسی رنگ کا آچکا ہے اس کا ذکر وہاں رہ گیا تھا شعر کتاب میں غلط چھپا ہوا صحیح یوں تھا ؎

توڑ امیدیں سب سے تو مانگ ہدایت رب سے تو   قرآں سے ہو دل پہ ثبت لا تھدی من احببت

ردیف "واو" اور "ی" کا ذرا تفصیل سے جائزہ آگے آتا ہے ان کے قبل ردیف "ن" بھی خاصی طویل اور بڑی شگفتہ ہے۔ غزلیں بھی اس میں خوب ہیں اور قطعے اور فردیں بھی خوب۔ سیر کی ابتدا ایک قطعہ سے کیجئے ؎

ہزاروں ہی طریقوں سے ہم انگریزوں کو گھیرے ہیں
طواف ان کے گھروں کا ہے انھیں سڑکوں کے پھیرے ہیں
سواری ہے انھیں کی راہ ان کی اور ڈاک ان کی

انھیں کی فوج ہے انکی پولیس ہے اور تاک انکی
ہوا میں ایرشپ انکے سمندر میں جہاز انکے

عمل ہم میں کیا کرتے ہیں نامعلوم راز انکے
علوم انکے زباں انکی پریس انکے لغات انکے

ہماری زندگی کے سارے اجزا پر ہیں ہات انکے

قرائن کہہ رہے ہیں آرہا ہے دور فتنوں کا
ہوائیں وہ چلیں گی نقش مٹ جائے گا کتنوں کا

کسی کی چل سکے گی کیا اگر قرب قیامت ہے
مگر اسوقت ادھر چرخا اُدھر[1] انکی وزارت ہے

متفرق اشعار

(۱) واقف ہوں کہ اِغلبؔ یکیڈن — اخبار وہاں کے کیا خریدوں

(۲) الگ ہے شخصیت حوادث ہمیں ہیں یا وہ ابھر رہے ہیں
یہ وقت ہم پر گزر رہا ہے کہ وقت پر ہم گزر رہے ہیں

(۳) کیوں ناز دین پر ہے کیوں تنے ہوئے ہیں — توحید کا ہے دعوی اور بت بنے ہوئے ہیں

(۴) ذرّوں کا بھی ثبوت نہیں امتحان میں — سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے جہان میں

(۵) اب شیخ جی مقیم برہمن کے پاس ہیں — گائیں اچھل رہی ہیں قصائی اداس ہیں

(۶) یہ ممبری کی دھن میں مذہب سے منحرف ہیں — مسجد میں متحد تھے ووٹوں میں مختلف ہیں

---

[1] سنہ ۱۹۲۰ء میں مانٹیگو ریفارم اسکیم کے ماتحت وزارتیں ہر صوبہ میں نئی نئی ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آئی تھیں۔ اور گاندھی جی کے کھدر اور چرخے کی تحریک بھی نئی نئی اور زوروں کے ساتھ چلی تھی۔

(۷) وہ بغداد میں ہیں میں مندر میں گم ہوں   شتر کینہ وہ ہیں تو میں گاؤ دم ہوں
(۸) سینگ غائب ہیں تو پھر گردن اُٹھانا ہے فضول
حضرت اشتر سے کہہ دیا لڈیں یا ذبح ہوں
(۹) بات کچھ تو ہوگی لائڈ جارج میں[1]   آج کل دنیا ہے ان کے چارج میں
(۱۰) خدا کے باب میں کیا آپ مجھ سے بحث کرتے ہیں
خدا وہ ہے کہ جس کے حکم سے صاحب بھی مرتے ہیں

اُمت اسلامی کی وحدت کے اظہار کے لحاظ سے یہ شعر اپنی نظیر آپ ہے۔ مولانا شوکت علی سرکار سے بغاوت اور سر ضیاء الدین احمد (علیگڈھ والے) اپنی سرکاری وفاداری کے لحاظ سے ایک ایک سرے پر تھے۔ انکو سموکر درس وحدت دیتے ہیں ؎

ایک شوکت اور ضیاء الدین وضع و خو میں ہیں
فرق اتنا ہے کہ وہ جنگل میں ہیں اور یہ زو میں ہیں[2]

دو دو شعروں کے بعض قطعے خوب ہیں مثلاً ؎

(۱) تو نے پڑھا ہے دنیا کو صرف ہسٹری میں   دنیا کو دیکھ عاقل دنیا کی مسٹری میں
ہے سلطنت کی خواہش ٹکچر میں یا تن رہی ہیں   صاحب بنا رہے ہیں ہم لوگ بن رہے ہیں
(۲) ملی ہے ڈیل اس کو مجھکو وہ نازک اطلاعیں ہیں   خدا ہے اور فطرت اس اس‌ہے کی شعاعیں ہیں

---

[1] برطانیہ کا مشہور و معروف وزیر اعظم جسکے ہاتھ پر گویا جنگ عظیم فتح ہوئی تھی۔

[2] Zoo چڑیا گھر۔ زندہ عجائب خانہ۔ فارسی کا وہ مشہور شعر یاد کر لیجئے ؎
ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دبستان عشق   او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

جوانی کی، بہار باغ کی، عمر دو روزہ کی — میرے دیوان کی نظموں میں کیا کیا الوداعیں ہیں

پہلے قطعہ میں دنیا کو کتاب کے ذریعہ "پڑھنے" اور چشم بصیرت سے دیکھنے میں جو فرق پیدا کیا ہے وہ داد کے قابل ہے اور دوسرے قطعہ کے تو دونوں شعر وجد آفریں ہیں۔ سیاسیات کے قالب میں مذہبیت کی روح۔

بعض رباعیاں بھی اسی دور ترک موالات کی گویا عکسی تصویر ہیں مثلاً

نواب جب ہو کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم — دلوں کو طاقت حق سے یہ دور کرتے ہیں
نہ یہ کہ عیش ہمارا کیا انھوں نے تلخ — ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

اکبر کی بعض خاص اصطلاحیں تو ہوئی ہیں "صاحب" "خانساماں" "مس" "برہمن" "گائے" "اونٹ" وغیرہ

اب یہاں "شیخ" و "مجتہد" کے فرق کو بھی سمجھ لیجئے "شیخ" (جب یہ مجتہد کے، مقابلہ میں ہو) سے انکی مراد علمائے اہل سنت سے ہوتی ہے اور "مجتہد" سے علمائے شیعہ سے۔ اس کے بعد ذیل کا شعر پڑھئے ؎

شیخ جی تو گردشوں پر پہلے سے تیار ہیں — مجتہد مرکز تھے لیکن وہ بھی اب پرکار ہیں

"مرکز" اور "پرکار" اور "گردش" کی مناسبتوں کا کیا کہنا۔

غزلیں اسی ردیف میں ایک آدھ نہیں کئی ایک پڑھنے اور وجد کرنے کے قابل ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

(۱) دے خواہ نہ دے، یا واپس لے، داتا سے لگی ہے دل کی لگن
جو کچھ بھی ملا ہے شکر اسکا، چھین جائے اگر جب بھی ہیں مگن
جے رُونہ ہے جیا جیتے ہیں، آن کھاتے ہیں یا جل پٹیے ہیں

سامانِ حفاظت کچھ بھی نہیں ہے پاس نہ اپنے "سورڈ"[1] نہ "گن"

(۲) فلک دبے گا نہیں اور زمیں ہٹے گی نہیں
بغیر رنج و الم زندگی کٹے گی نہیں
سمجھ رہا ہوں پڑیں گی مصیبتیں لیکن
تمہارے ساتھ محبت مری گھٹے گی نہیں

(۳) اس رنج میں ہمارے ناصح ٹہل رہے ہیں
گاندھی تو وجد میں ہیں یہ کیوں اچھل رہے ہیں
نشوونمائے کونسل جنکو نہیں میسر
پبلک کی جے میں انکے مضمون چل رہے ہیں
ہیں وفد اور اپیلیں، فریاد اور دلیلیں
اور کید مغربی کے ارماں نکل رہے ہیں
یہ سارے کارنامے اللہ کے ہیں اکبر
کیا جائے دم زدن ہے یوں ہی یہ چل رہے ہیں

معرکہ کی غزل ذیل کی غزل ہے۔ آٹھ میں سے پورے چھ شعر ملاحظہ ہوں ؎

(۴) نئی منطق اب ہوئی خضر رہ وہ طریق اپنا رہا کہاں
وہ اصول ہی جو شکست ہو تو وفائے دل کی بنا کہاں
کوئی ڈاروِن کا مرید ہے کوئی تجربوں کا شہید ہے
وہ خیالِ بزمِ ازل کہاں وہ بسر دیارِ خدا کہاں
نہ حدیثِ عشق کہیں رہی نہ وہ شانِ حسن حسیں رہی
دلِ درد و شوقِ لقا کہاں وہ حجابِ لطف و حیا کہاں
نہ محبتوں کا وہ ساز ہے، نہ بزرگیوں سے نیاز ہے
وہ ادب کہاں وہ وفا کہاں وہ خلوصِ دل کی ادا کہاں
یہ فریبِ دہر کی ہے روش کہ خزاں پہ ہوتی ہے وا روش
وہ بہارِ لالہ و گل کہاں وہ چمن کہاں وہ صبا کہاں
ہوئی ہے پرانی یہ داستاں وہ اٹھا ہے اب پئے فغاں
نہیں اکبر اپنے حواس میں کوئی اس سے پوچھے پتا کہاں

ردیف "و" مزیدار ہے اور ایسی ہی ردیف "ہ" بھی جو بہت مختصر ہے۔ سیاسی تعریضیں خوب ہیں اور جا بجا عرفانی نکتوں اور روحانی حقیقتوں سے ملی جلی۔ کہیں سادہ انداز میں اور کہیں ظرافت کے پردہ میں ملاحظہ ہوں ؎

---

[1] SWORD (تلوار) GUN (بندوق)

(۱) اخبار میں حال میرا شائع نہ کرو | مصروف دعا ہو وقت ضائع نہ کرو

(۲) دنیا تو اسی گھر کی کنیز آج ہے اکبر | صاحب سے ہو بیزار تو دنیا کو بھی چھوڑو

(۳) نہ صاحب کو مارو نہ صاحب سے بھاگو | مچاتے رہو غل، بیٹھو اور مانگو

(۴) متحد یورپ کی قوت ہو تو ہو | ہم بھی اب ہیں کلو گنگوا ئیڈ کو

(۵) یہ بات کہ کچھ نہیں ہے سب کچھ | سمجھے بھی ہو تو بس کہو نہ اب کچھ

(۶) جتنا زمانہ حشر کے پہلے ہے سب ہے آج | کہتا ہو کل میں صرف قیامت کے روز کو

رباعیاں اور قطعے بھی اسی مرتبہ اور اسی معیار کے ہیں :-

(۱) زیادہ "ان" سے رہو محترز کہ ہندو سے | یہ خود ہی سمجھ لو دل میں اگر نہ کچھ کد ہو
یہ چاہتے ہیں کہ ختنہ میاں کا ہو موقوف | وہ فکر میں ہیں مسلمانی ہی نہ دارد ہو

(۲) حکام ہے خزانہ و توپ و رفل کے ساتھ | خدام ہیں شگوفۂ ترک عمل کے ساتھ
بازو میں یاں نہ زور گلے کو نہ شوق شور | ہم تو مشاعرہ میں ہیں اپنی غزل کے ساتھ

(۳) ہو تیزی انور کی جو ہوس ہنگامہ کرو توپوں سے بھڑو
گاندھی کی جو حکمت خوش آئے چپ چاپ گڑی کے تھان بنو
صاحب کی رفاقت ہو جو پسند، آسام میں جا کر چائے چنو
اکبر کی جو مانو محو دعا ہو اور حمد خدا کے گیت سنو

(آسام میں چائے کی بہت بڑی بڑی کاشتیں اُس وقت انگریزوں کے ہاتھ میں تھیں۔ عجب نہیں جو کسی حد تک اب بھی ہوں اور انور سے مراد ترکی کے مشہور غازی و مجاہد انور پاشا ہیں)

(۴) باطن کا جمال آئے بھی نظر اور راز درون ظاہر بھی نہ ہو

آساں نہیں ہے اے اکبر، عاشق بھی بنے کافر بھی نہ ہو
ہے اب تو انھیں کو دعوے عقل، اللہ کا جنکو خوف نہیں
کم ملتا ہے ایسا بندہ کوئی کو دل بھی نہ ہو کافر بھی نہ ہو

(۵) ہو چکی یاں کی سیر یا اللہ — عاقبت ہو بخیر یا اللہ
رکھ حرم میں مرا قدم ثابت — ہے کشش سوئے دیر یا اللہ
ہم سے لاٹھی بھی اٹھ نہیں سکتی — اور ادھر ہے فیر یا اللہ
اپنوں میں یاں دے محبت وقوت — ہم پہ ہنستے ہیں غیر یا اللہ

دیوان بھر میں سب سے زیادہ مفصل اور سب سے بڑھکر قابل دید ردیف ہیؔ ہے۔ ضخامت کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ مرتب صاحب نے اور بہت سے کلام کو جنکا کوئی تعلق ردیف ہیؔ سے نہیں سب اسی کے تحت ڈال دیا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ باقی کل دیوان ۵۹ صفحوں میں آگیا اور ص۴۶ سے ص۱۰۵ تک اسی ایک ردیف نذر ہیں۔

پہلے اس ردیف کی غزلوں کا رنگ ملاحظہ ہو، ان شاء اللہ ایک سے بڑھکر ایک نکلیں گی ۔

(۱) جان مشتاق ہو تیری مرا جینا ہے یہی — مست ہوں جام ازل سے مرا پینا ہے یہی
تیرے محبوب کی منزل کی زیارت ہو نصیب — دیکھ لے چشم تمنا کہ مدینہ ہے یہی
منزل عشق میں رکھ اپنی خودی زیر قدم — حسن کہتا ہے مرے بام کا زینا ہے یہی
نور و ظلمت میں نظر آئے فقط شان ظہور — رات دن آرزو دیدہ بینا ہے یہی
پیش توحید بتوں کا سر مغرور ہے خم — انکو کینا ہے جو مجھ سے تو وہ کینا ہے یہی

(۲) زمیں تو گھد گھد اکر ہو گئی ہے کمپ میں شامل
مگر ہاں آسماں کی کچھ پرانی شان باقی ہے
سوا اسکے جو کچھ تھا ہو گیا سرکار میں داخل
خدا اسکا نام باقی ہے ہماری جان باقی ہے

(۳) مجھے کیا خبر یہ ہو کیا اثر نہ وہ ہوش ہو نہ وہ جان ہے
فقط ایک نظر ہے جہاں پر نہ خیال ہے نہ زبان ہو
نہ دماغ صرف رہ نظر نہ دلیل باعث دردسر
وہی جوش لذت دید ہے نہ خیال ہے نہ گمان ہو
نہ یہاں حدود کا نشاں کہیں نہ محل حرف و بیاں کہیں
مرا عشق ہے ترا حسن ہے مری آنکھ ہے تری شان ہو

معرفت ور وحانیت کا رنگ تو عام ہے باقی ایک آدھ غزل تو غزل ہی نہیں سو فیصدی مناجات ہے مثلاً سہ

(۴) میں مصیبتوں میں ہوں اے خدا مرا دل غموں سے دو نیم ہے
مرے حال زار پہ رحم کر تو کریم ہے تو رحیم ہے
میں بہت ہوں بیکس و ناتواں مری بیکسی کی خبر کسے
ترے رحم ہی کی امید ہے تو قدیر ہے تو علیم ہے
ترے فضل ہی کا یہ کام ہے مجھے بخشدے مجھے خلد دے
مری معصیت تو کہے گی یہ کہ مستحق جحیم ہے

غزلوں سے کہیں زیادہ یہ حصہ رباعیات، قطعات اور واقعاتی نظموں

سے بھرا ہوا ہے، زیادہ تر ظرافت کی چاشنی کے ساتھ اور کہیں کہیں سادہ سلیس زبان میں۔ لیکن عصری تلمیحات عموماً اس کثرت سے ہیں کہ مرتب صاحب نے ان حصوں کو توضیحی و تعارفی حاشیوں سے محروم رکھ کر شدید ظلم شاعر کی روح پر کیا ہے۔

مثلاً ایک نظم یہی ہے ؎

طب دہلی کی مدد سے بت کی صحت بڑھ گئی　　قدرت باری سے تھانہ کی شوکت بڑھ گئی

ڈنڈوت جب شیخ صاحب نے بھی کی پیش صنم　　گاندھی آندھی ہو گئی چیلوں کی ہمت بڑھ گئی

آکسن بھائی نے قربانی تعصب کی جو کی　　جان بُل چپ ہو گئے گایوں کی نعمت بڑھ گئی

وہ یہ کہتے تھے کہ صاحب ہی کا ہے سارا ستم　　آپ فرماتے ہیں بابو کی شرارت بڑھ گئی

اب اسکے متعلق جب تک یہ سب صراحتیں پیش نظر نہ ہوں کہ "طب دہلی" سے اشارہ حاذق الملک[1] حکیم اجمل خاں کی طرف ہے جو اس وقت گاندھی جی کے خاص رفیق ہو چکے تھے۔ "باری" کی تلمیح اُسوقت کے نامور سیاسی لیڈر اور عالم و شیخ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی جانب اور "شوکت" کی مولانا شوکت علی کی جانب ہے۔ اور دوسرا شعر اسوقت کے مسلمانوں کی تصویر ہے اور تیسرے شعر میں "آکسن بھائی" سے مراد مولانا محمد علی ہیں جو آکسفرڈ کے گریجویٹ ہونے کی بنا پر "آکسن" کہے جاتے تھے (لفظ آکسن کا املا انگریزی میں دو طرح لکھا جاتا ہے۔ ایک معنی آکسفرڈ والے کے ہیں اور دوسرا "آکس" کی جمع بیل کے معنی میں ہے) جنھوں نے اُسوقت

---

[1] یہ خطاب حکیم صاحب کو سرکار انگریزی کا دیا ہوا تھا اور اپنے وقت میں بہت اونچا اور معزز سمجھا جاتا تھا۔ حکیم صاحب ایک زمانہ میں گورنمنٹ اور حکام میں بڑے بارسوخ سمجھے جاتے تھے۔ تحریک ترک موالات میں پڑ کر حکیم صاحب نے یہ خطاب واپس کر دیا تھا اور اسکے بعد سے قوم نے انھیں مسیح الملک کہنا شروع کر دیا تھا۔

فرمایا تھا کہ ہندو جس طرح ہم سے خلافت کے معاملہ میں شیر و شکر ہو رہے ہیں اُس کا لحاظ کر کے میں گائے کی قربانی ترک کرتا ہوں۔ نیز یہ کہ "جان بُل" سے مراد انگریز قوم ہوتی ہے اور بُل کے لفظی معنی بیل کے ہیں۔ تو بغیران ساری صراحتوں کے کوئی کیا لطف اس قطعہ سے اُٹھا سکتا ہے؟

متعدد نظموں میں عصری حالات بالکل آئینہ ہیں اور "صاحب" کی طرف مخاطبت صاف ہے۔ مثلاً ؎

(۱) یہ وہ ہنگامہ ہے جسکی ہر طرف تائید ہے — آپکی تعلیم ہے اور آپکی تقلید ہے
مستحقان ادب کو آپنے رسوا کیا — آپکے بھی دعوے عظمت کی اب تردید ہے

(۲) سائنس تم نے جانا اور اسکو بھی پڑھایا — دولت اڑائی تم نے اور اُسنے گپ اڑائی
تم نے تو مال مارا اور کھولدی تجارت — یہ ترجموں میں الجھا بس داستاں سنائی
تم متحد ہوئے اور دکھلائی اپنی قوت — اسنے سلف کو روندا آپس میں کی لڑائی
تم نے نگاہ رکھا کُل اپنے ضابطوں کو — اس بےادب نے سیکھی دینی اور ڈھٹائی
یہ برکتیں تمھاری تعلیم کی بلا ہیں — مارا ترقیوں نے اللہ کی دُھائی

(۳) ہے چھتری بھی جیب نہ پٹا ہے نہ بانک ہے
پوری کبھی خشک لب ہے کہ کبھی چھ چھٹانک ہے
کپڑا گراں ہے ستر ہے عورت کا آشکار
کچھ بس نہیں زباں پر فقط ڈھانک ڈھانک ہے
بھگوان کا کرم ہے سدیشی کے بیل پر
لیڈر کی کھینچ کھانچ ہے گاندھی کی ہانک ہے

اکبرؔ پہ بار ہے یہ تماشائے دل شکن
اسکی تو آخرت کی طرف تاک جھانک ہے

(۴) چکر میں ہے آج ہسٹری بھی | چرخہ بھی ہے اور منسٹری[1] بھی
مرکز سے بہت ہٹے ہوئے ہیں | میدان میں مگر ڈٹے ہوئے ہیں
جن پر ہے خدا کی مہر باقی | دونوں کو سمجھتے ہیں وہ فانی

(۵) ؎ گاندھی اور مالوی[2] میں ہے کیا فرق | آپ اس بحث میں ہیں تا حق غرق
فرق وہ ہے جو عقل و عشق میں ہے | ایک کاشی میں اک دمشق میں ہے

۱۹۲۰ء کے آخر میں زور شور سے تحریک ہندوستان کے لئے ایک امیر شریعت کے انتخاب کی اٹھی تھی اور بعض حلقوں میں اسکے لئے نام مولانا ابوالکلام کا پیش ہوا تھا۔ مولانا عبدالباریؒ اور دوسرے حضرات فرنگی محل اس سے اختلاف رکھتے تھے۔ ترکوں نے نئی نئی حکومت انگورہ (انقرہ) میں قائم کی تھی اور کمال پاشا اس وقت تک غازی و مجاہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ والی مکہ شریف حسین کے لڑکے امیر فیصل کا عروج ہو رہا تھا بعض باریک بینوں کا خیال تھا کہ امیر شریعت کا جھگڑا برطانیہ کا اُٹھایا ہوا ہے۔ بہر حال یہ سارا پس منظر سامنے رکھ کر اب ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو ؎

امیر شریعت کی تحریک ہے | کہا اکثروں نے یہی ٹھیک ہے

---

[1] ۱۹۲۰ء میں پہلی بار ہندوستانی وزارتیں، مانٹیگو چیمسفرڈ اصلاحات کے ماتحت قائم ہوئی تھیں اور گاندھی جی کی تحریک کھدر و چرخہ بھی خوب زوروں پر چل رہی تھی۔ [2] مشہور ہندو لیڈر پنڈت مدن موہن مالوی الہ آبادی، جو اپنی مصلحت سنجی اور فرزانگی کے لئے مشہور تھے۔

فرنگی محل کو ہے اس میں سکوت ضرورت کا پاتے نہیں وہ ثبوت
اُدھر ایک کو ہے عراقی مذاق اِدھر ترک انگورہ ہے دل پہ شاق
وہ کہتے ہیں فیصل کا اُٹھا ہے ہاتھ امیر شریعت کبھی آجائیں ساتھ
یہ کہتے ہیں کوشش میں ہیں جب گل نئی بات کا کیوں کرو تم خیال
گورنمنٹ خوش ہے اسی بات سے کہ یہ کام ہو ہند کے ہاتھ سے
نئے مولوی برسر جوش ہیں جو پیر طریقت ہیں خاموش ہیں
توقع کریں ایسی عقلوں سے کیا حکومت نہیں جب تو نقلوں سے کیا
کوئی کہتا ہے کیا کمال وجمال خلا فلسفہ میں ہے بالکل محال
خلیفہ نہیں ہیں تو پیرو سہی نہ ہو تخت فی الارض سیرو[۱] سہی
وہ کہتے ہیں کافی ہیں اہل طریق نہ ڈھونڈو یہاں تم سیاسی رفیق

بعض قطعے تمام تر عارفانہ رنگ کے ہیں مثلاً ؎

(۱) ذہن شائق رہا ٹھکانے کا رنگ بدلا کیا زمانے کا
شوخیٔ عقل رہ گئی شک میں کٹ گئی عمر مفت بک بک میں
کردیا دل کو این و آں نے تباہ مردہ اے لا الٰہ الا اللہ

(۲) ارماں بقدر طاقت ہر سو نکل رہے ہیں صاحب تو اُڑ رہے ہیں اور ہم اُچھل رہے ہیں
غصے میں ہیں ہم اُن پر وہ ہم پر ہنس رہے ہیں دام فریب دنیا میں دونوں پھنس رہے ہیں
دونوں کو چاہیئے یہ طاعت سے منہ نہ موڑیں وہ اپنا جبر چھوڑیں ہم صبر کو نہ چھوڑیں

(۳) اکملت لکم دینکم[۲] اسلام کو بس ہے باقی اگر کچھ ہے تو وہ دنیا کی ہوس ہے

---

[۱] اشارہ ہے آیۂ قرآنی سیرو فی الارض کی طرف [۲] آیۂ قرآنی الیوم اکملت لکم دینکم

توحید کا مسلم نے بجا رکھا ہے ڈنکا
طاعت سے وہ رکتا نہیں لندن ہو کہ لنکا

اَتممتُ علیکم[1] کا تو کچھ کر نہ سکے پوپ
اُملی لھم[2] ارشاد تھا ایجاد ہوئی توپ

(۴) ہر چند حالِ دنیا اس وقت منقلب ہے
ایمان مطمئن ہے اور کفر مضطرب ہے

ظاہر پہ تم نہ جاؤ ہے اعتبار باطن
عقدہ مرے سخن کا کھل جائیگا کسی دن

کہیں کہیں معرفت کے ساتھ ظرافت شیر و شکر ہو کر جلوہ گر ہے مثلاً سہ

(۱) اپنی جگہ ہر اک کا ارمان نکل رہا ہے
تو پیں کبھی چل رہی ہیں جوتا کبھی چل رہا ہے

لیکن رہا میں چپکا دل میں یہ بات سوچی
کس تقویت پہ اٹھوں انجینیر نہ موچی

(۲) حضرت برہم نے فرمایا پسند اس رائے کو
اونٹ کو زیبا متانت اور کلیلیں گائے کو

انکو بڑھنا چاہیئے اور ہم کو بچنا چاہیئے
ہوم رول انکو مبارک ہم کو تقوی چاہیئے

حکیم برہم فتحپوری اپنے زمانہ کے ایک ادیب اور معتدل روش اخبار نویس تھے اُس جوش و خروش کی فضا میں انکا ہفتہ وار اخبار مشرق (گورکھپور) اپنی نرم اور ٹھنڈی پالیسی کے لئے بدنام تھا۔

(۳) نئی روشنی کا ہوا تیل کم
حکومت نے اس سے کیا میل کم

یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے
سیاسی کمیٹی میں پل جائیے

اُدھر مولوی کس مپرسی میں تھے
نہ آفس میں تھے اور نہ کرسی میں تھے

اسی میل کا آجکل ہے ظہور
خدا جانے ظلمت ہے اسمیں کہ نور

حضرت اکبر کے نزدیک بڑا فرق نان کو آپریشن اور "اینٹی کو آپریشن" کے درمیان تھا۔ یہ حکیم شاعر تقوے کے حق میں تھا اور ہنگامہ آرائی سے بیزار سہ

---

[1] اسی آیۂ قرآنی کا دوسرا ٹکڑا ادا تممت علیکم نعمتی [2] آیۂ قرآنی واملی لھم ان کیدی متین

میں تو ہوں نن کو ابریشن کیلئے تیار جبت | تم تو لیکن انٹی کو آبریشن میں ہو ست
وہ دلاتا ہے دل دیندار کو تقویٰ کی یاد | اور اینٹی کو آبریشن ہے مگر شر و فساد

لفظی صنعتوں کے پھول اور بیلیں کاغذ کاٹ کاٹ کر بناتے لیکن تخلیق کا کمال یہ تھا کہ ان کاغذی پھولوں میں بھی خوشبوئیں معنویت کی پیدا کر دیتے ؂

انعام اگر چاہیئے تو عام سے ملئے | آرام اگر چاہیئے تو رام سے ملئے
دنیا کا وہ حاصل ہے تو یہ دین کا حاصل | اکبر کا قلم صنعت لفظی میں ہے کامل

ایک نظم گویا اسوقت ایک ترک موالاتی خلافتی کی زبان سے ہے واپسی نہ ور شور کے ساتھ صاحبانہ زندگی سے ہندو تمدن اور اسلامی تہذیب کی طرف ہو رہی تھی ؂

ہر چیز ہو اے جناب واپس | عہدہ واپس خطاب واپس
غصے کو کروں میں ضبط تا چند | واپس پتلون لاؤ تہ بند
بیوی بھی خدا سے اب ڈرینگی | واپس بے پردگی کریں گی
رکھوں گالوں کو کیوں صفاچٹ | واپس لونگا ریش جھٹ پٹ
بہتر ہے نہ دیکھو بہشت یا پس | اللہ کو کر دو جان واپس
ہوگی وہی دلنواز اپنی | واپس لونگا نماز اپنی
آگے موڑھے سے بڑھ رہے ہیں | لالہ پھر رتھ پر چڑھ رہے ہیں

"ہنٹر کمیشن" اب کسی کو کیوں یاد آئے گا۔ اسوقت تازہ نام بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔ جلیان والا باغ (امرتسر) میں ڈائر نامی ایک انگریز فوجی افسر نے ہندوستانیوں کے ایک مجمع عظیم پر بے تحاشا گولیاں برسا دی تھیں اس پر ملک

بھر میں ایک آگ لگ گئی۔ آخر ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھانا پڑا جس کے صدر ایک برطانوی بیرسٹر لارڈ ہنٹر تھے اور اخبارات میں مہینوں اس کے خوب چرچے رہے انکی جھلک اس آئینہ میں دیکھئے ؎

پالیسی جھگڑے چھوڑ دو ۔۔۔ ان باتوں سے اب منھ موڑ دو
کیسے ڈائر کیسے ہنٹر ۔۔۔ لاؤ ساغر لاؤ گنٹر

حضرت اکبر گاندھی جی کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے انکی تشخیص حکومت انگریزی ہو یا گاندھوی تحریک ، بہر حال اسلامیت کو ضرر ہی پہنچنا ہے ؎

آگے تمھارے رنگ کسی کا نہیں جما ۔۔۔ جے ہو تمھاری اے مرے گاندھی مہاتما
لینے کو تم نہیں ہو گورنمنٹ کی مدد ۔۔۔ چورن کو کیا ضرور یہ پیرمنٹ کی مدد

سیاسیات کے جزر اور مدو جزر بھی عجیب عجیب ہوتے رہتے ہیں وائسرائے لارڈ ریڈنگ کا اشارہ پاکر گاندھی جی ان سے ملنے شملہ گئے اور وہیں بیان بہت نرم دیا۔ ملاقات مالوی جی کے ذریعہ سے طے ہوئی تھی۔ عام خیال یہی پھیلا کہ برطانوی سیاست کامیاب رہی اور گاندھی جی توڑ لئے گئے۔ ادھر افغانستان کا ہمراز بردست تھا اور ہندوؤں کو ڈرایا جا رہا تھا کہ خلافتی مسلمان افغانستان کی مدد سے ہندوستان پر قابض و متصرف ہو جائیں گے۔ یہ سارے منظر کلام اکبر کی عینک سے دیکھئے ؎

(۱) دل اپنا اُدھر لالہ رو ٹھا دکھائیں ۔۔۔ ادھر لاٹ صاحب انگوٹھا دکھائیں
یہ انگریز دانوں کا ہے کُل طریقہ ۔۔۔ نہیں شیخ صاحب کو اس میں سلیقہ
(۲) انکی منزل کے مسافر ہو گئے ۔۔۔ دیکھئے شملہ پر حاضر ہو گئے

لاٹ صاحب نے بہت اچھا کیا — سوت کو بھی ریشمی لچھا کیا[1]
کچھ ملائم طبع گاندھی ہو گئے — اب نسیم صبح آندھی ہو گئے
شیخ جی تم کو مبارک روم وٹے — ہم تو کہتے ہیں کہ گاندھی جی کی جے
فرق ظاہر گائے اور دُلدُل کا ہے — وحشت افزا ہم میں بل، کابل کا ہے

(۴۳) حضرت گاندھی پھرے ہیں شملہ پر نور سے — واپسی موسیٰ کی یاد آتی ہے کوہ طور سے
مشتہر اخبار میں کردیں اسی مضمون کو گوج — اور بندوں کو بھی حاصل ہونیوالا ہے عروج

مسٹر گوج اسوقت یوپی گورنمنٹ کے پبلسٹی افسر تھے۔ پہلے شعر کا طنزیہ مضمون یہ ہے کہ گاندھی جی ایسے تحفے لیکر شملے سے اترے ہیں کہ گویا حضرت موسیٰ کلیم اپنی قوم کے لئے خدائی نسخہ شفا لیکر طور سے آئے ہیں۔

(۴۴) کمزور نہیں ہیں لاٹ صاحب — پاکٹ سے نہیں ہے زہر غائب
لیکن اس پالیسی کو دیکھو — گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو
صد شکر کہ کام کر گیا گڑ — بابو ٹوٹے تھے پھر گئے جڑ[2]
اظہار جوش طبع پہ وقت اپنا کھو چکے — اونگھے جناب شیخ بھی گاندھی بھی سو چکے
پنڈت سکھائیں بیچ میں پڑ کر تو کیا کریں — کابل کے بل سر گئے جو بھڑکے تو کیا کریں
صاحب کا بھی بھلا ہو کہ ما من سمجھا دیا — پنڈت کا بھی بھلا ہو کہ شعلہ بجھا دیا[3]

ایک دُعا میاں کلو کی زبان سے مانگی ہے اور اسوقت کی صاحب زدگی

---

[1] اس "سوت" کا لطف جب آئے گا، جب گاندھی جی کے چرخہ اور کھدر کی اہمیت ذہن کے سامنے رہے۔

[2] اس وقت عام خیال یہی تھا کہ ہندوؤں نے سرکار انگریزی سے مصالحت کرلی ہے۔

[3] پنڈت سے اشارہ ہر بار وقت کے نامور ہندو لیڈر پنڈت مدن موہن مالوی الہ آبادی کی طرف ہے۔

اور صاحب پرستی کی تصویر کھینچ دی ہے ؎

اے خدا مجھکو کرے صاحب لوگ — دور ہو مجھ سے اس جنم کا روگ
میرا قالب ہو قالب غربی — بھول جاؤں زبان کبھی اپنی
رنگ چہرے کا میرے جائے بدل — کروں ایجاد میں کبھی توپ و رفل
سو کے اٹھوں جو آج صبح کو میں — سب یہ سمجھیں کہ لاٹ صاحب ہیں

وقت کی ہندو مسلم ذہنیت کو یوں تحلیل کرکے دکھایا ہے ؎

جو ہیں مالوی اور شوکت میاں — لگے کرنے آپس میں سرگوشیاں
وہ بولے کہ کابل سے ہوگا گزند — کرینگے ہم انگریز ہی کو پسند
یہ بولے کہ ہندو کا ہوگا جو رول — ہم انگریز ہی کو کرینگے قبول
نہ تھا انکے آپس میں کچھ اس سوا رنج — یہ پڑھنے لگے ہو کے وہ نغمہ سنج
کریا بخشائے بر حال ما — کہ ہستم اسیر کمند ہوا

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب سیورے کانفرنس کے موقع پر مصالحت کی طرح پڑی ہے اور فتحمندوں نے اپنی حسب مرضی خوب خوب حصہ بانٹ کی ہے اکبر کی نگاہ دور رس نے اس وقت بھی بہت کچھ دیکھ لیا تھا اور زبان سے یہ کہہ دیا تھا ؎

کورانہ ترنگیں قوت کی کچھ فائدہ انکو دیں گی نہیں
نقشوں میں لکیریں کھینچنے سے فطرت کی حدیں بدلینگی نہیں
ذروں کو تغیر ہے ہر دم ادراک ہو جس کو خواہ نہ ہو
ضائع ہے نظر تیری اکبر جب پیش نظر اللہ نہ ہو

"امام ابو حنیفہ" کا قافیہ ان سے قبل کبھی کسی نے کیوں باندھا ہوگا ؎

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت | کالج سے امام ابو حنیفہ رخصت
صاحب سے سنی ہے اب قیامت کی خبر | قسطنطنیہ سے خلیفہ رخصت

قرب قیامت کی پیشین گوئیوں میں یہ مضمون آیا ہوا ہے کہ خلیفۃ المسلمین کی حکومت قسطنطنیہ میں باقی نہ رہے گی۔

علی برادران کی جدوجہد کے منکر نہ تھے۔ داد بھی دیتے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی پیام موعظت بھی پہونچائے جاتے ہیں ؎

(۱) صاحب سے رکے تو راحتوں کو ترسے | شوکت سے اگر بکھرے تو لعنت برسے
بہتر ہے کہ پڑ رہیے توکل بہ خدا | باہر رکھیے قدم نہ اپنے گھر سے

(۲) دشوار ہے مستحق آزر ہونا | کچھ سہل نہیں علی برادر ہونا
ہاں سب دعا کریں کہ ان بندوں کو | آساں ہو پیرو پیمبر ہونا

اسوقت تک ملک کا شعور سیاسی جس درجہ تک پہنچ چکا تھا اس کا صحیح نقشہ ان صفحات کے اندر موجود ہے ؎

کہیے اگر تو ریل کی پٹری اکھاڑ دیں | ارشاد ہو اگر کوئی بنگلہ اجاڑ دیں
دفتر میں کاغذات جو ہیں انکو پھاڑ دیں | دو ایک جو پہرے والے ہوں انکو پچھاڑ دیں
لیکن نتیجہ کیا؟ وہی فیر اور بھاگ بھاگ | ہنٹر کا غم وہی وہی پھر جلسہ پراگ[1]

کام کی بات کبھی مسدس کی نے میں الاپتے ہیں ؎

اے بھائیو دل میں ہے تمھارے یہ ٹھنی کیا | سچا بھی شکوہ یہ بتاؤ شدنی کیا

---

[1] پراگ الہ آباد کا پرانا اور ہندوانہ نام ہے۔ الہ آباد میں ایک احتجاجی جلسہ بڑے زور وں کا ہوا تھا۔

بگڑی کبھی کچھ انکی تو کہو بنی اپنی کیا — بے فائدہ تم کر رہے ہو رائے زنی کیا
بس صبر کرو طاعت و تقویٰ میں گزارو — رکھو سر تسلیم کو خم حق کو پکارو

اور کبھی نغمہ کو غزل کی دھن میں سناتے ہیں اور ساتھ ہی ظرافت کا ساز بھی چھیڑتے جاتے ہیں ؎

اتنا ہی گزارش کرنا ہے ہر ایک کو آخر مرنا ہے
ایشور کی خوشی تو ان میں ہے شیطان ہی ہوگا پاپ سے خوش
بابو تو پریس کے اندر ہیں اور پنڈت محو مندر ہیں
بھگوان نے جسکو جیسا کیا۔ وہ چھاپ سے خوش یہ جاپ سے خوش
عیسیٰ نے دل روشن کو لیا اور تم نے فقط انجن کو لیا
کہتے ہو کہ وہ تھے باپ سے خوش اور تم ہو خالی بھاپ سے خوش
میں خلق کی حالت جانچوں گا تو قد کی بلندی دیکھا کر
ہو یہ تو نگاہ اپنی میں وزن سے خوش اور تو ناپ سے خوش

شروع سنہ ۲۰ء میں جب مولانا محمد علیؒ رئیس وفد ہو کر خلافت کمیٹی کی طرف سے برطانیہ و فرانس کو گئے ہیں تو شریک وفد مولانا سلیمان ندوی مرحوم بھی تھے۔ حضرت اکبر کو ایک عالم دین کی سیاسیات میں شرکت کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ ایک لطیف و مہذب انداز میں تعریض ادھر بھی کر گئے ہیں ؎

سلیمان کی بات اچھی بنی — کہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی
رہی بادہ نوشوں سے بیشک کھنچی — مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علیؒ کی رفاقت میں ہیں — خدا انکو غیروں سے کردے غنی

یہ دوسرے شعر میں شراب کے ضلع میں کھنچنا، اور چائے کے ضلع میں گاڑھی چھننا" کیا خوب!

ایک اور چھوٹے سے قطعہ کو شروع تو آپ نے دانت کی تکلیف کے ذکر سے کیا ہو لیکن معاً رخ اپنے پیام اور دینی تعلیم کی طرف پھیر دیا ہے۔ مضمون کے اندر چاہے رقت ہی کیوں نہ ہو، لیکن انداز بیان کی ندرت و لطافت بہرحال آپکے ہونٹوں پر ہنسی لاکر رہے گی ؎

دانت کا درد بدستور چلا جاتا ہے	وہی مازو[1] وہی کافور چلا جاتا ہے
ڈارون کے اُسی لکچر کا سبق ہے ابتک	وہی بندر وہی لنگور چلا جاتا ہے
برق کے لمپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ	روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے
شیخ صاحب کی کمر جھک گئی پر دل نہ جھکا	آجتک شوقِ سقنقور[2] چلا جاتا ہے

دیوان مطبوعہ میں "چلا جاتا ہے" کے بجائے دو جگہ "چلا آتا ہے" اور سقنقور، کا املا، مسخ ہو کر چھپا ہے اور یہ صرف ایک ہلکا نمونہ ہے کتاب کی بلشمار اغلاط طبع کا۔

گاندھی جی کی تحریکات ۱۹ء تا ۲۱ء اور گاندھیات پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ ایک مستقل مجموعہ گاندھی نامہ کے نام سے تیار ہو گیا۔ جولائی ۲۱ء میں جب آخری بار راقم آثم کو شرف نیاز حاصل ہوا تھا ارشاد فرمایا تھا کہ اسی مجموعہ میں موافق و مخالف ہر قسم کے خیالات نظم کر دیئے ہیں اس دیوان میں فرماتے ہیں ؎

---

[1] مازو و کافور۔ امراض دنداں کی مشہور دوائیں ہیں۔

[2] ماہی سقنقور۔ ضعف مردانہ کی مشہور دوا ہے۔

انقلاب آیا، نئی دنیا، نیا ہنگامہ ہے　　شاہنامہ ہو چکا اب ذکرِ گاندھی نامہ ہے

افسوس ہے کہ یہ اشعار دیوان بھر میں متفرق و منتشر ہی ملتے ہیں کسی ایک جگہ مرتب نہیں ملتے۔ ایک حد تک انتشار و بے ترتیبی حضرت اکبر کے ان تینوں دیوانوں میں بھی موجود ہے (اور اسکی شکایت راقم آثم حضرت سے انکے سامنے کر بھی چکا تھا) لیکن اس دیوان میں تو یہ بے ترتیبی بہت ہی نمایاں ہے اور پڑھنے والے کو کھل جاتی ہے۔ اسی مجموعہ کے بہت سے شعر پہلے گزر چکے اور یہ کچھ اب آرہے ہیں۔ لیکن الگ کر کے اور کسی خاص عنوان کے ماتحت نہیں بلکہ وہی سابق کی طرح دوسرے مضامین کے ساتھ ملے جلے اور گڈمڈ۔

سنہ ۲۱ئہ میں گاندھی جی کا شملہ جا کر وائسرائے سے ملنے کا ذکر دو تین بار آچکا ہے۔ اکبر صاحب نے ان کی اس باریابی کو معاف نہیں کیا۔ جب ذکر آتا ہے تو تعریض ہی کے لہجہ میں کرتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اس تعریض میں کبھی لطافت تلخی پر غالب ہو ؂

ملا کرتے تھے جو مضمون مجھکو ذکرِ گاندھی سے　　خدا جانے کدھر وہ اڑ گئے شملہ کی آندھی سے

گاندھی جی کی یہ رسائی پنڈت مدن موہن مالوی کے مشورہ اور توسط سے ہوئی تھی شاعر اسے کسی طرح بھولنا نہیں چاہتا ؂

گاندھی نے مان لی ہے مدن موہنی صلاح　　ہندی تو تھے ہی اب مدنی بھی وہ ہو گئے

ایک ہندی کو اس طرح بات کی بات میں "مدنی" اکبر ہی کی ذہانت بنا سکتی تھی!

برطانیہ کے زبردست وزیر اعظم اسوقت لائڈ جارج تھے اکبر کے دیوان میں یہ قافیہ بن کر حاضر ہیں ؂

یہی مرضی خدا کی تھی ہم انکے چارج میں آگئے — سرِ تسلیم خم ہے مزاجِ چارج میں آئے

صاحب نے جتنے بھی حقوق اہل ہند کو دیئے تھے اکبر کی نظر میں انکی وقعت کاغذی و لفظی سے زیادہ نہیں۔ اہل ہند کو آزادی صرف کہنے کو ملی تھی ؎

فیصلہ اچھا ہے، قانون اس سے کیوں ناخوش رہے
آپ جو چاہیں کریں اور بندہ جو چاہے لکھے

علی برادران کا وطن رام پور تھا۔ یہ یاد کر لیجئے اور اس کے بعد پڑھئے ؎

بھائی گاندھی کا نہایت ہی مقدس کام ہے — رام پوری ساتھ ہیں اور رام ہی کا نام ہے

رعایت لفظی کے تو بادشاہ ہی تھے، کہیں اس صنعت سے معنی آفرینی کا کام لیا ہے ؎

سر گاندھی کو اڑانے سے گورنمنٹ ڈری — شور ہر سمت اُٹھے گا کہ آندھی آندھی

لفظ گاندھی کا سر (حرف "گ") جدا کر دیجئے تلفظ آندھی رہ جائے گا۔

صاحب اپنا اصلی حریف تو مسلمان ہی کو سمجھ رہے تھے ہندوؤں سے کد اس درجہ میں نہ تھی بلکہ ان میں اُن میں تو بہت کچھ قدر مشترک تھا۔ اس مضمون کو اکبر نے بار بار باندھا ہے ؎

(۱) کلیسا کے مقابل آج مشکل سر اٹھانا ہے — کہ غیروں پر بھی اسکو غصہ ہے مجھ سے تو کینا ہے
(۲) دینی عدو کے سامنے گاندھی کی چل گئی — تہمد پہ فیر ہو گئے دھوتی سنبھل گئی
(۳) تیغ زباں کی دیکھو ہر سو بہ ہنگی ہے — بابو کے حوصلے ہیں صاحب کی دل لگی ہے
(۴) گاندھی سے کیوں ہو وحشت باطن کی مسٹری ہے — شوکت سے کیوں نہ کھٹکیں انکی تو مسٹری ہے

گاندھی جی کی تحریکات ۱۹۱۹ء سے شروع ہوئیں، پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کا

زمانہ ۱۹۲۰ئہ کے آخر کا زمانہ ہے شاعران دونوں واقعات میں بھی ربط محسوس کرتا ہے ؎

ظلمت ٹپک رہی ہو اس دور میں فلک سے
آنکھیں جھپک رہی ہیں شیطان کی چمک سے

جرمن کے بعد گاندھی، ہو پالیسی کی آندھی
نادان سمجھ نہ اسکو جس نے کمر نہ باندھی

بہتوں نے ہمت کرلی تھی لیکن بہتوں نے کاندھا بھی ڈالدیا تھا۔ اکبر کے کیمرے کی نگاہ میں ؎

انڈیا نے کمر تو باندھی ہے
کوئی شوکت ہے کوئی گاندھی ہے

لیکن اب بھی بہت سے ہیں اڑیل
صرف تشکیک ہے اور کاندھی ہے

تحریک کی رو میں جیسا کہ ہر ہر تحریک کے شباب کے وقت ہوتا ہے خدا جانے کتنا پیتل سونا دکھلائی دینے لگا اور ہر بلند بانگ نعرے انا الحق سے لگانے لگا ؎

گاندھی تو ہمارا بھولا ہے اور شیخ نے بدلا چولا ہے
دیکھو تو خدا کیا کرتا ہے صاحب نے بھی دفتر کھولا ہے
آنر کی پہیلی بوجھی ہے ہر اک کو نقلی سوجھی ہے
جو چوکر تھا وہ سوجی ہے جو ماشہ تھا وہ تولہ ہے

ان چٹکلوں کے ساتھ وہ بات بھی اپنے کہے چلے جاتے ہیں ؎

حکام سے نہ ربط نہ گاندھی سے ربط ہے
اکبر کو صرف نظم حوادث کا خبط ہے

ہنستے نہیں وہ دیکھ کے اس کو دھاندو کو
دل میں تو ہنستے ہیں مگر لب پہ ضبط ہے

توحید، عبرت، وفنا یہ خاص الخاص موضوع آخر عمر میں انکی گفتگو کی

طرح انکی شاعری کے بھی تھے ہنساتے، گدگداتے، جھٹ سے ایک بات بیچ میں ایسی کہہ دیتے کہ سننے والا آہ کہہ کر اور کلیجہ تھام کے رہ جاتا ہے

(۱) تجلی مشرق اچھی تھی مغرب کی تعلّی سے ۔۔۔ وہ ذوقِ بیخودی اچھا تھا اس ہلاکت کی

(۲) فنا پذیر کرشموں سے کیا ہو دل راضی ۔۔۔ نگاہ پڑ نہ جکی تھی کہ ہو گئے ماضی

(۳) آئین طرازیاں ہوں کہاں تک شعور کی ۔۔۔ کچھ حد نہیں ہے وسعت شان ظہور کی

(۴) جو رہت سے بھر رہی ہیں اہل دل روتے ہوئے ۔۔۔ جائے حیرت ہے یہ بات اللہ کے ہوتے ہوئے

(۵) مدد خرد سے کچھ اس انجمن میں مل نہ سکی ۔۔۔ نگاہ اٹھ نہ سکی اور زبان ہل نہ سکی

(۶) شگفتہ ہو کے قیام اپنا چاہتی تھی کلی ۔۔۔ مگر ہوائے فنا آفریں سے کچھ نہ چلی

(۷) اجل بولی کہ بس فرض اب تجھے خاموش رہنا ہے
بہت کہتا رہا بندہ ابھی کچھ اور کہنا ہے

(۸) دل شکستہ میں اک ساز جاں نواز بھی ہے
لرز رہا ہوں میں جس سے اسی پہ ناز بھی ہے

(۹) خرد پوچھتی ہے یہ کیا ہو رہا ہے ۔۔۔ صدائے دلی ہے، "خدا ہو رہا ہے"[1]

(۱۰) نہ بحثوں پر لگنا ہے، دلیلوں میں نہ گھسنا ہے ۔۔۔ زباں عجز ہے اور لذت اسمائے حسنا ہے

(۱۱) کیا بتاؤں سخن ہوشربا کے معنی ۔۔۔ خود بخود کے وہی معنی جو خدا کے معنی

(۱۲) یہ مصرعہ مرے ہوش کھو رہا ہے ۔۔۔ وہی تھا وہی ہے وہی ہو رہا ہے

(۱۳) یہ دعویٰ ہے مرا اسی پر مرے دل کی گواہی ہے
ہوا جو کچھ، جو ہوتا ہے، جو ہوگا سب خدا ہی ہے

---

[1] اس وجد آفریں ٹکڑے کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

سب شعر اس طرح کے مزید اگر دیوان سے نکال نکال کر پیش ہوتے رہیں تو شاید کچھ کم پورا دیوان ہی نہ نقل ہو جائے اور تبصرہ کے بعد اصل دیوان کے مطالعہ کی کچھ ضرورت ہی نہ رہے۔

لیکن دیوان کی جان، کہنا چاہیئے کہ وہ اشعار ہیں جن میں حضرت اکبر نے اپنے سہل ممتنع انداز میں شریعت و طریقت کے فرق کو بتایا ہے اور ان کے باہمی تعلق کو سمجھایا ہے۔ بحث نازک ہے اور بڑے بڑے معرکے اس میدان میں صوفی اور مولوی کے درمیان رہ چکے ہیں۔ آج سے نہیں مدتوں پیشتر سے۔ یہ کمال اکبر کا ہے کہ افراط و تفریط سے بچ کر اور اہل بدعات و زاہد خشک دونوں کے رنگ سے الگ ہو کر ایک ایسی گہری اور سچی بات اور وہ بھی ایک چٹکلے کی طرح بہترین لطیف انداز میں کہہ جاتے ہیں جو ملا و صوفی دونوں کو لگ جاتی ہے۔ یہ دونوں کو ہنسی خوشی گلے ملوا دیتے ہیں۔ یہ حقائق و معارف ہلکی پھلکی، عام فہم زبان میں نمبر وار ملاحظہ ہوں ؎

یہی الفاظ کہہ کر ذہن خفتہ کو جگاتا ہے   شریعت سر جھکاتا ہے، طریقت دل لگاتا ہے

اسلام و ایمان کی تفسیر اس سے دلچسپ تر کیا ہو گی۔ پھر فرماتے ہیں کہ عبد و معبود کے باہمی تعلق پر نظر کرنے کی صورتیں دو ہیں ایک یہ کہ اصلی زور معبود کی معبودیت پر ہو دوسری یہ کہ عبد کی عبدیت پر ہو۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ خربوزہ چھری پر گرا تو اور چھری خربوزہ پر گری تو۔ لیکن صورتیں تو بہر حال مختلف ہیں ؎

ہو شرع یا طریقت ہر ایک حق نما ہے   واں ہے خدا کا بندہ، بندہ کا یاں خدا ہے

احکام خدا اور رسول کی سیدھی سادی تعمیل ہوتی چلی جائے بس شریعت کا مقتضیٰ پورا ہو گیا۔ اور جس وقت سے دل بھی شریک ہو گیا، اس کا نام تصوّف پڑ گیا۔ رسوم و تقریبات سے اُسے کوئی تعلق نہیں ؎

نہ صورت کا تصنّع ہے نہ رسموں کا تکلف ہے
شریعت کی بہ دل تعمیل ہو، بس یہ تصوّف ہے

صورت اور معانی دونوں اپنی اپنی جگہ پوری اہمیت رکھتے ہیں اور رسول کے واقعات زندگی خود ان دونو حیثیتوں کے پورے جامع ہیں ارشاد ہے اور کتنے لطیف و لذیذ انداز میں ارشاد ہے ؎

شریعت میں ہے صورت فتح بدر — طریقت میں ہے معنی شق صدر
نبوت کے اندر ہیں دو نو رنگ — عبث ہے یہ مُلّا و صوفی کی جنگ

ایک جگہ کمال ہی کر دیا ہے۔ صرف ایک مختصر ہلکے پھلکے لفظ سے شریعت و طریقت کا فرق واضح کر دیا ہے ؎

ادھر دیکھو اے طالبان معنی — یہ مے جوش زن ہے مرے دل کے خم میں
شریعت طریقت کو کیا پوچھتے ہو — شریعت ہے تم پر طریقت ہے تم میں

تبصرہ جو کوشش اختصار کے باوجود پھیلتا چلا گیا اب ختم ہونے کو آیا۔ لیکن خاتمہ سے قبل تین چیزیں ضرور قابل ملاحظہ ہیں۔ ایک غزل، ایک قطعہ اور ایک واقعاتی دو شعری نظم یہ تینوں اکبر کے آخری دور شاعری کی بہترین ترجمان یا صحیح ترین نمونے ہیں۔ جس نے انھیں پڑھ لیا اُس نے حضرت اکبر کی روح کو پالیا۔ پہلے استادانہ غزل ملاحظہ ہو ؎

(۱) زمیں تو کھد کھدا کر ہو گئی ہے کمپ میں شامل — مگر ہاں آسماں کی کچھ پرانی شان باقی ہے
(۲) بہت آراستہ ہم کو کیا تعلیم مغرب نے — بس اتنی ہی کسر سمجھو جو کچھ ایمان باقی ہے
(۳) سوا اسکے جو کچھ تھا ہو گیا سرکار میں داخل — خدا کا نام باقی ہے ہماری جان باقی ہے
(۴) ہوئے نیکی سے بیگانہ ترقی اسکو کہتے ہیں — فرشتے ہو گئے رخصت فقط شیطان باقی ہے
(۵) طبیعت میں ابھی تلون سے سیری نہیں پاتا — یہ سچ ہے کٹ گئے ہیں پاؤں لیکن ان باقی ہے

اس کے بعد نمبر عارفانہ قطعہ کا آتا ہے ؎

ذہن شائق رہا ٹھکانے کا — رنگ بدلا کیا زمانہ کا
شوخی عقل رہ گئی شک میں — کٹ گئی عمر مفت بک بک میں
کر دیا دل این و آں نے تباہ — مدد اے لا الہ الا اللہ

واقعاتی نظم پڑھنے سے قبل یہ یاد کر لیجئے کہ ۲۰ء میں مولانا اشرف علیؒ تھانوی اور مولانا عبدالباریؒ فرنگی محلی دو مخالف کیمپوں میں سمجھے جاتے تھے۔ ایک کے یہاں تحریک خلافت و ترک موالات وغیرہ سے کامل بے تعلقی اور بے گانگی اور سارا زور اتباع احکام شریعت پر تھا۔ دوسرے کے یہاں گویا اصل تعلیم انھیں چیزوں کی تھی۔ اکبر کی نکتہ رس نگاہ اب ملاحظہ ہو کہ دونو کے درمیان کیسا ربط پیدا کرتی ہے ؎

اشرفی ارشاد کھوٹا ہے نہ باری پر ہے حرف — صاف آ جائے سمجھ میں گر کرو تم عقل صرف
یعنی اسلامی کتابوں کی وہاں تحریر ہے — کفر کے ظلموں سے بچنے کی یہاں تدبیر ہے

کلیات اکبر حصہ چہارم کے نام سے قیاس قدرۃً یہ ہوتا ہے کہ کلیات حصہ سوم کے بعد حضرت اکبر نے جو کچھ بھی کہا، اس کے اندر آ گیا ہوگا۔ لیکن

ناشرین کی عنایت سے جہاں کلام کی ترتیب میں خرابیاں اور طباعت میں غلطیاں اس کثرت سے رہ گئیں وہیں یہ بھی ہے کہ خود کلام کا ایک بڑا حصہ اس مجموعہ میں شامل ہونے سے رہ گیا۔

حصہ چہارم مطبوعہ جیسا کچھ ہے اور اسمیں کلام جتنا کچھ ہے اس پر سرسری نظر تو پچھلے نمبروں میں ہو چکی لیکن اس کے علاوہ کچھ شعر تو اس تبصرہ نگار کے حافظہ میں حضرت اکبر یا بعد کو ان کے صاحبزادہ عشرت میاں مرحوم کی زبان سے سُنے ہوئے اچھی طرح محفوظ ہیں اور کچھ کلام اسی وقت چھپ بھی گیا تھا۔ بہتر ہوگا کہ یہ سب بھی اسی سلسلہ میں پیش نظر ہو جائے، کسے خبر کہ بعد کو اتنا موقعہ بھی ملے یا نہ ملے علم سفینہ بڑی حد تک پیش ہو چکا، اب آگے جو ہے خاصی حد تک علم سینہ ہے۔

۲۰ء میں جب مولانا سید سلیمان ندوی، وفد خلافت میں شریک ہو کر یورپ گئے ہیں اس وقت اکبر نے جو قطعہ کہا تھا (سلیمان کی بات کیسی بنی۔ وہ ندوی تھے اب ہو گئے لندنی) وہ اوپر کہیں پورا درج ہو چکا۔ اس کے بعد جب خبر آئی کہ وفد پیرس گیا ہے تو اکبر صاحب اس خبر پر خاموش نہ رہ سکے۔ اسوقت انکا یہ شعر اچھی طرح یاد ہے ؎

دعائیں کر رہے ہیں ہم یہاں مسجد کی دریوں پر
مبارک ہو سلیمانی نظر پیرس کی پریوں پر

"پری" اور "سلیمان" کی مناسبت تو ظاہر ہی ہے اور سنا یہ ہے کہ فرنچ زبان میں پیرس کا تلفظ بھی "س" کی آواز کے بغیر "پری" ہی کے مشابہ ہے۔

مدتوں پہلے سر سید اور مذہبیات میں ان کے "ریفارم" کا خاکہ اس قطعہ میں اُڑا چکے تھے ؎

سدھاریں ہوا میں خدمت سید میں ایک رات | افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے وہ مجھ سے "دین کی اصلاح فرض ہے" | میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

ایک زمانہ وہ تھا جب "صاحب" ہندوستان میں سیاسی "اصلاحوں" REFORMS کی قسطوں پر قسطیں دے رہے تھے اور ہندوستانی انھیں کھلونوں سے اپنا جی بہلا رہے تھے۔ اور خوب زوروں میں نعروں پر نعرے لگا رہے تھے۔ عین اسوقت اکبر کو دل لگی سوجھی کہی تو بات دل کو گرمانے اور تڑپانے کے لئے لیکن اہل بزم سنتے کھلکھلا کر ہنس پڑے ؎

اکبر یہ توہی بھی ہیں سرافراز بھی ہیں | تدبیر میں علم و فن میں ممتاز بھی ہیں
بابو کو نچا دیا جو چابی دے کر | اس سے یہ کھلا کہ دل لگی باز بھی ہیں

بازار کے بہوے چابی سے ناچتے ہوئے کس نے نہیں دیکھے ہیں؟ لفظ "کھلا" ظاہر ہے کہ یہاں ظاہر ہوا معلوم ہوا کے معنی میں ہے لیکن "چابی" بھی "کھولنے" ہی کے کام آتی ہے۔

ظرافت و مطایبت کے کوچہ میں قدم رکھ کر یہ کیونکر ممکن تھا کہ زبان فحش یا نیم فحش سے ہمیشہ بچی رہے۔ شیخ سعدیؒ تو اس راہ میں جتنا آگے بڑھ گئے ہیں معلوم ہے۔ حضرت اکبر اس کی آدھی دور بھی نہ گئے پھر بھی کبھی کبھی کچھ نہ کچھ تو کہہ ہی گئے۔ گو حتی الامکان اس قسم کے کلام چھپنے کے روادار نہ ہوتے بلکہ یہ گوارا نہ ہوتا کہ یہ کلام زیادہ لوگوں کے کان

تنگ ہو چکے تھے۔ زمانہ شاید ۱۳۱۲ئہ کا تھا جب ترکی پر بلقان کی ساری حکومتیں (بلغاریہ۔ رومانیہ وغیرہ) یونان کے ساتھ ملکر یلغار کئے ہوئے تھیں اور ترک بیچارے برابر پیچھے ہٹتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ سالونیکا کے مورچہ پر انھوں نے جم کر مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ اکبر کی ذہانت نے اس خشک حقیقت کو ظرافت کا لباس پہنا کر پیش کیا فرماتے ہیں پہلا شعر ؎

ملحوظ رکھے دنیا اس رشتۂ باہم کو
مغرب کی لیڈیاں بھی ترکی حرم میں آئیں

ترک غریب تو اپنے حرم یعنی کثرت ازدواج کے لئے ضرب المثل کی حد تک بدنام تھے اکبر انھیں بدنام کرنے والوں کے خاندان کی خاتونوں سے اس حرم کو آباد کر رہے ہیں اور پھر دنیا کو بتلاتے جاتے ہیں کہ دیکھئے کہ اب ترکی اور یورپ کے درمیان یہ رشتہ قائم ہو گیا اور اس کے بعد یہ فرماتے ہیں ؎

سالونیکا سے اب تو "سالونیکالو" ہم کو
پھر کرکے اس پہ قبضہ کردیں یہ ترک انسے

ایسے کلام کا لطف غیر زبان والے نہیں لے سکتے نہ دوسری زبان میں اسکے ترجمہ میں کچھ جان رہ سکتی ہے۔ اسے تو وہی سمجھ سکتے ہیں جو اردو میں لفظ "سالے" کے دوہرے مفہوم سے آشنا ہیں۔ میں نے یہ شعر اسی زمانہ میں دہلی کے کسی اخبار میں چھپا ہوا دیکھ کر حضرت کو داد لکھ بھیجی۔ جواب میں ناخوشی کا اظہار ہوا کہ آپ کو کون ایسے شعر سنا جاتا ہے؟۔ میں نے عرض کیا "حضرت اب اس لفظ میں رکاکت ہی کیا رہی؟ آپ نے تو پہلے شعر میں مستقل رشتہ جتا دیا ہے"!

۱۹۱۰ء میں - الہ آباد میں ایک عظیم الشان نمائش ہوئی تھی - کلکتہ کی مشہور رقاصہ گوہر بھی آئی اور اس کے دیکھنے کے لئے خلقت کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے (اور روایت مشہور تو یہ ہے کہ وہ خود حضرت اکبر سے ملنے آئی تھی لیکن عشرت میاں مرحوم نے اس خبر کی قطعی تردید کی) حضرت اکبر نے اسوقت یہ شعر موزوں کر دیا اور بات کی بات میں یہ زبانوں پر چڑھ گیا ؎

خوش نصیب آج یہاں کون ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا [1]

۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی ہے اور کئی مہینہ تک برابر جرمنی ہی کی پیشقدمی کی خبریں آتی رہی تھیں تو خبروں کی عبارت ایسی ہوتی تھی کہ جس سے پڑھنے والوں پر اثر انگریزی فتحمندی کا پڑے اس وقت نطق اکبر نے یوں جامعہ شعر پہنا تھا ؎

ہم سے سن لو خلاصہ اخبار | ابتدا ہی سے پڑھتے آتے ہیں
ہر طرح ہے شکست جرمن | بجز اسکے کہ بڑھتے آتے ہیں

نومبر ۱۲ء (ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ) میں اس نامہ سیاہ کے والد ماجد کا انتقال مکہ معظمہ میں عین دوران حج قیام منیٰ کے زمانہ میں ہو گیا - ایک مدت کے بعد حضرت اکبر کی خدمت میں عرض کی کہ تاریخ وفات فرمادی جائے - جواب آیا کہ تاریخ گوئی میں مہارت نہیں تاہم مصرعہ تاریخ بے تکلف ذہن میں آگیا اسے قطعہ کر دیا ملاحظہ ہو ؎

---

[1] اکبر کی شاید اسی دعا کا اثر تھا کہ گوہر آخر عمر میں شوہر دار ہو گئی تھیں

پیشوائے قوم والا مرتبت | شیخ عبدالقادر والاصفات
آخرت ہی پر نظر رکھتے تھے | سمجھتے تھے دنیائے دوں کو بے ثبات
جاہ و منصب میں گو وہ ممتاز تھے | کرتے تھے یاد خدا دن ہو کہ رات
انکے ذکر و شغل کا تھا یہ اثر | "شغل" ہی میں نکلی تاریخ وفات ۱۳۳۵ھ

۱۹۱۶ء میں مشہور مہاراجہ محمود آباد۔ (سر علی محمد خاں مرحوم) نے راقم سطور سے کہا کہ اُردو انسائیکلو پیڈیا لکھوانے کو تیار ہوں کام شروع ہو تو میں ایک لاکھ دیتا ہوں۔ مولانا سید سلیمان ندوی بھی اس میں پیش پیش رہے اور ہم دونوں کی طرف سے متعدد اعلان اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ حضرت اکبر اس پر کچھ فرما گئے ؎

خدا نے جو غیرت عطا کی ہو تم کو | تو ملت کے اعلیٰ مقاصد کو دیکھو
اولوالعزمی راجہ صاحب کو سمجھو | مذاق سلیمان و ماجد کو دیکھو

اسی زمانہ میں لکھنؤ میں شیعہ کالج نیا نیا قائم ہوا ہے۔ مہاراجہ محمود آباد اس میں شریک نہ تھے۔ حضرت اکبر لکھنؤ آئے ایک روز راجہ صاحب کے ایک معتمد ملنے حاضر ہوئے اور باتوں باتوں میں کہا کہ "یہ تو علی گڑھ کے جواب میں ایک ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا ہوا ہمارے سرکار اسی لئے تو اس میں شریک نہیں ہوئے۔" حضرت اکبر نے جواب دیا کہ جی نہیں یہ علی گڑھ پر حملہ کیا ہوا جتنے کالج بنتے جائیں گے اور علی گڑھ کو تقویت ہوتی جائے گی۔ میرا شعر سنیئے ؎

سید صاحب کو عذر کیوں ہونے لگا | کالج ہے یہ کچھ امام باڑہ تو نہیں

۱۹۱۵ء میں الہ آباد حاضر ہوا۔ شب کو کھانے پر اور کبھی دو چار صاحب

مدعو تھے۔ کھانے کے بعد ذکر مسلمانوں کی موجودہ اخلاقی پستی بدنظمی وغیرہ کا نکلا۔ ایک صاحب بولے: "جو کچھ بھی ہو بہرحال ہمارا حال (فلاں فرقہ کو تو) بہتر ہی ہے۔ انکی اخلاقی حالت ہم سے کہیں زیادہ گندی ہے۔ حضرت اکبر نے فرمایا آپ نے بہت خوب بات کہی جب ہی تو میرا شعر ہوا ہے ؎

گو لاکھ بے وقار ہوں مرزا کو غم نہیں
کیا کم ہے یہ شرف کہ بقائی سے کم نہیں

ایک اور رباعی دیکھئے بالکل رہی جاتی ہے عین اس مقام پر پہنچ کر یاد آئی ؎

کتا جیسے بہ فکر جیفہ دوڑے
یوں دہریہ نیچری خلیفہ دوڑے
جب مر کے چلے ہیں سوئے جنت حضرات
لٹھ لیکے امام ابو حنیفہ دوڑے

خوب یاد ہے کہ لکھنؤ کے ایک بالاخانہ پر یہ رباعی حضرت نے اپنی زبان سے سنا کر خوب منع کر دیا تھا کہ دیکھئے اسے میری زندگی میں کہیں نہ چھاپ دیجئے گا۔ مولانا صاحبان واقعی مجھ پر لٹھ لیکے دوڑ پڑیں گے۔

غرض اس طرح کے دس بیس نہیں سینکڑوں متفرق اشعار ہیں جو ابتک کسی دیوان کی زینت نہیں بنے اور اب نہیں بنے تو آئندہ کیا توقع ہو اکبر اس لحاظ سے اپنے وارثوں اور ناشروں کے معاملہ میں سخت بدقسمت واقع ہوئے تھے، ٹھیک حضرت اقبال کی ضد یا یوں کہئے کہ اقبال جیسے اس معاملہ میں اقبال مند نکلے ویسے ہی حضرت اکبر بدا قبال۔

لیکن سب سے بڑا ظلم ان حضرت نے یہ کیا کہ ۱۸ئہ یا ۱۹ئہ کی کہی ہوئی ایک مستقل نظم کو جو شریعت و طریقت کے باہمی تعلق کی تشریح میں ہے اب تک آج کسی دیوان میں جگہ نہ دی۔ حالانکہ یہ نظم ایک الگ رسالہ کی صورت

میں آپ کی زندگی ہی میں چھپ کر شائع ہو گئی تھی۔ یہ نظم ۳۱ شعروں کی ہے۔ خدا بھلا کرے خواجہ حسن نظامی دہلوی کا کہ انھوں نے اسکے "نظم الہام" کا عنوان دے کر۔ اپنے دیباچہ کے ساتھ صفر ۱۳۲۸ھ (نومبر ۱۹۱۹ء) میں حافظ عزیز حسن نقشبندی کے انڈین پریس دہلی کے چھاپ کر شائع کر دیا۔ نظم ۱۸×۲۲ تقطیع کے ۳۲ صفحوں میں آئی ہے اور ایک ایک شعر وصلی کی طرح صفحہ کے طول میں جلی قلم سے ایک ایک صفحہ پر لکھا گیا ہے۔ یہ نظم اپنے موضوع پر لاجواب ہے معنوی و ادبی دونوں حیثیتوں سے۔ اسے ذیل میں تمام و کمال درج کر کے اس سلسلہ کو ختم کیا جاتا ہے اور مسلمان ناظرین سے استدعا ہے کہ ایسے عارف باللہ پر فاتحہ تکبیر ضرور پڑھیں اب نظم ملاحظہ ہو:

(۱) سنو دو ہی لفظوں میں مجھ سو یہ راز	شریعت وضو ہے طریقت نماز
(۲) شریعت عبادت کی تعمیل ہے	طریقت عبادت کی تکمیل ہے[۱]
(۳) شریعت بحکم و طریقت پہ دل	کہ معنی سے کر دے تجھے متصل
(۴) شریعت میں آثار راہِ خدا	طریقت میں رفتار راہِ خدا
(۵) طریقت شریعت سے ہے صف بہ صف	وہ ہے موج دریا یہ دریا میں کف
(۶) شریعت سے ہے ظلمت کفر دور	طریقت میں فطرت کا ظاہر ہے نور
(۷) شریعت کرے گی بصیرت کو صاف	طریقت میں حسب مذاق انکشاف
(۸) شریعت تو اک عام قانون ہے	طریقت کا اک خاص مضمون ہے

---

[۱] رسالہ میں یہ مصرعہ یوں چھپا ہے۔ ع طریقت شریعت کی تعمیل ہے

(۹) شریعت میں لازم اطاعت ہوئی — طریقت میں شرط ارادت ہوئی

(۱۰) شریعت تو ہے دیدہ نور بیں — طریقت میں ہے روح کی دوربیں

(۱۱) شریعت ہے اک شمع محفل فروز — طریقت اک شعلۂ ہمہ سوز

(۱۲) شریعت ہے مہر سپہر ہدیٰ — طریقت کا رخ سوئے حب خدا

(۱۳) شریعت ہے جان اور طریقت نشاط — شریعت ہے منزل طریقت رباط

(۱۴) شریعت غذا ہے طریقت دوا — شریعت چمن ہے طریقت ہوا

(۱۵) شریعت عبادت ہے اللہ کی — طریقت محبت ہے اللہ کی

(۱۶) شریعت کی خدمت کا سب سے لگاؤ — طریقت کی لذت پائے من بیناؤ

(۱۷) شریعت میں ہے نار و جنت کا رنگ — طریقت میں ہے وصل و فرقت کا رنگ

(۱۸) شریعت کتابوں کی ہے محتمل — طریقت میں ہے درس الواح دل

(۱۹) شریعت طریقت میں تو کیوں الجھ — وہ قرآن ہے اور یہ اس کی سمجھ

(۲۰) سخن سنجیاں گو ہوں میری درست — مگر قول سعدی نہایت ہے چست

(۲۱) طریقت بجز خدمت خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

(۲۲) محال است سعدی کہ راہ صفا — تواں یافت جز بر پئے مصطفیٰ

(۲۳) نہ ہو اہل اسکا تو کیا اسکی قدر — خدا ہی کی مرضی سے ہے شرح صدر

(۲۴) شریعت میں دین اور ایمان ہے — طریقت میں تسکین و ایقان ہے

(۲۵) عبادت سے عزت شریعت میں ہے — عبادت کی لذت طریقت میں ہے

(۲۶) شریعت میں ہے تاکید ضبط نصوص — طریقت میں ذوق عمل با خلوص

(۲۷) طریقت قدم ہے شریعت ہے راہ — شریعت زباں ہے طریقت نگاہ

(۲۸) شریعت در محفلِ مصطفیٰ — طریقت عروجِ دلِ مصطفیٰ
(۲۹) شریعت میں ہے قیل و قالِ حبیب — طریقت میں ہے حسن و جمالِ حبیب[1]
(۳۰) شریعت میں ہے ارشاد عہد الست — طریقت میں ہے یاد عہد الست
(۳۱) شریعت شکر ہے طریقت زباں — کہ مستی کی لذت چکھے تیری زباں

---
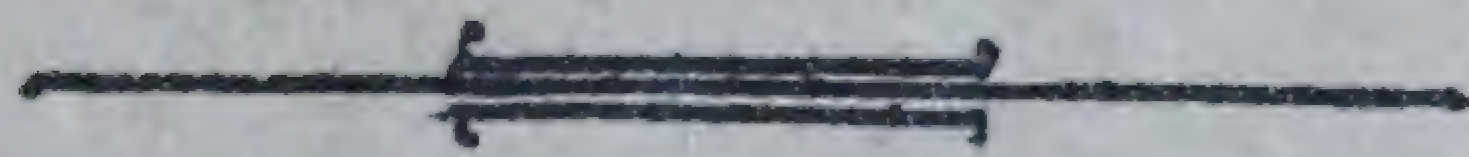
[1] رسالہ میں مصرعہ چھپا ہوا یوں ہے "طریقت میں محو جمالِ حبیب"

(۱۲) تعارف[ل]

اُن کے مضبوط جہازوں کی مددگار ہوا آگ
میری ٹوٹی ہوئی کشتی کا سہارا اسلام

جس نے غزل کا یہ شعر اپنے عمر کے اوسط حصہ میں کہا تھا اسکی شاعری کی عمر ہی دین کی غمخواری اور ملت کی خدمتگذاری میں گزری۔ لیکن خوش بخت اقبال کی سی اقبال مندی ہر ایک کہاں سے لاسکتا ہے۔ اکبر غریب کا نام اگر شہرت کی تالیوں نے اچھالا بھی تو صرف اسی حیثیت سے کہ ظریف لاجواب ہیں اور شوخ گوئی میں اپنی مثال آپ! ——— شعر کلیات اکبر حصہ اول کا ہے جو ۱۹۰۹ء میں چھپ کر شائع ہو گیا تھا عمر جوں جوں بڑھتی گئی یہ رنگ بھی اور نکھرتا گیا۔ کلیات اول اگر اس رنگ کے لحاظ سے نقش اول تھا تو کلیات دوم و سوم و چہارم کو نقش ثانی اور نقش ثالث اور نقش رابع کہیئے۔

اکبر غزل گو کی حیثیت سے بھی ایک بلند پایہ شاعر ہوئے ہیں۔ غزلیں انھوں نے خوب اور بہت خوب ہی نہیں بلکہ ایک زمانہ میں بڑی کثرت سے بھی کہیں۔ لیکن ان کے کلام کا اصلی اور امتیازی رنگ عاشقانہ غزل سرائی نہیں بلکہ

خدا کی یاد میں پکارتا ہوں ہوا کرے ناخوشی بتوں کی

ل علی گڈھ میگزین "اکبر نمبر" جلد ۲۴ نمبر ۳ ۱۹۵۰ء

کی ضربیں لگاتا ہے ——— "ذکر خفی" کی ایک لطیف و نادر صورت۔
۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۳۰-۳۲ سال کی عمر میں جب ہوش کے سن کو پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں گھر کے در و دیوار تک اقبال فرنگ کی صداؤں سے گونج رہے ہیں۔ "صاحب" کا لایا ہوا اور پھیلایا ہوا تمدن ہے کہ اندر و باہر اپنے پنجے جما چکا ہے اور اسلامی یا نیم اسلامی تہذیب و معاشرت ہے کہ کچہری سے بازار سے۔ اسکول سے اور دفتروں سے سب کہیں سے بیدخل ہو رہی ہے، مٹی جا رہی ہے، اور مٹائی جا رہی ہے۔ ماحول کی یہ گھٹا ٹوپ تاریکی دیکھ کر اپنی ذہانت اور بے پناہ حسِ ظرافت کو انھوں نے اس سے مقابلہ کے لئے وقف کر دیا۔ دوسروں کے پاس سنجیدہ دلائل تھے اور کتابوں کے پشتارے۔ اکبر کی میگزین میں سب سے بڑا حربہ طنز و ظرافت کا ہے۔ کہیں انھوں نے ہلکے مزاح سے کام لیا ہے اور کہیں گہرا نشتر طنز و تعریض کا دیا۔

دورِ فلک کا ماجرا آپ سے کیا کریں بیاں ۔۔۔ تفرقہ دیکھئے ذرا ہم پہ پڑے عجیب دن
جان سپردِ ڈاکٹر، مال سپردِ آنجناب ۔۔۔ عقل سپردِ ماسٹر، روح سپردِ ڈارون

انگریزی سیاست، انگریزی تہذیب و معاشرت، انگریزی علوم و فنون سے مرعوبیت سب کی تصویر آخر کے دو مصرعوں میں آگئی ہے۔
ڈارون پر چرچے جا بجا ہیں اور اسوقت ضرورت بھی اسی کی تھی، نظریہ ارتقا فضا بھر پر چھایا ہوا تھا، ہندوستانی دل اور دماغ اس سے بری طرح مرعوب تھے

ڈارون کے اسی لکچر کا سبق ہے اب تک ۔۔۔ وہی بندر وہی لنگور چلا جاتا ہے
ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے ۔۔۔ میں نہ مانوں گا کہ مورث آپکے لنگور تھے

اکبر تعلیم برابر خودداری اور خود اعتمادی کی دیئے جاتے ہیں۔

ڈاردینوں کا چلا سلسلہ تیمور کے بعد — دیکھیں کس نسل کی اب جیت ہو لنگور کے بعد
شاگرد ڈاردن تو خدا ہی نے کر دیا — اکبر تکمہ نہیں ہے مداری کے ہاتھ میں

دیوان پر دیوان ایسے ہی لطیفوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

معاصرین پر رائے زنی خوب خوب کرتے گئے ہیں تلمیحات کی پوری طرح سمجھنے کے لئے وقت کی شخصیتوں اور وقت کے حالات سے واقفیت ضروری ہے

ایک شوکت اور ضیاء الدین وضع وخو میں ہیں — فرق اتنا ہو وہ جنگل میں ہیں یہ زد میں ہیں

فارسی کا مشہور شعر یاد کر لیجئے ؎

ما ومجنوں ہم سبق بودیم در بستان عشق — او بصحرا رفت وما در کوچہ ہا رسوا شدیم

شعر اکبر کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو ایک طرف بابائے خلافت مولانا شوکت علی ضیغم اسلام کی وضع قطع اور پُرشور مجاہدانہ وفعال زندگی سے واقف ہوں اور دوسری طرف ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی پر حکمت سیاسی زندگی سے۔ لیکن ظاہر وقالب کے اتنے شدید اختلاف کے باوجود، در دلت دونوں میں مشترک حُبّ اسلام کے دو نو حصہ دار۔

تمدن فرنگ کے سلسلہ میں ایک بڑا فتنہ عورت کی بے حجابی کا ہے جس کا خوش نما نام عورت کی آزادی رکھا گیا ہے۔ ہر قسم کی غیرت بلکہ عزت وعصمت کا خون اس آزادی کی آڑ میں جائز ہے۔ اکبر کی خاص توجہ اس حملہ کے روکنے پر رہی اور انکا شروع کا کہا ہوا یہ قطعہ تو اردو میں گویا ضرب المثل کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

آئیں جو بے حجاب نظر چند بی بیاں | اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپکا پردہ وہ کیا ہوا | کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

جانتے تھے کہ زمانہ کے اثر کو کون روک سکتا ہے۔

بحث میں آہی گیا فلسفہ شرم و حجاب | دور گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید

سمجھتے تھے کہ روک تھام کی کوششوں سے کچھ ہونا ہوانا نہیں ہے۔

بٹھائی جائیں گی پردہ میں بی بیاں کبتک | بنے رہوگے تم اس ملک میں میاں کبتک
حرم سرا کی حفاظت کو تو تیغ ہی نہ رہی | تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کبتک
جو منہ دکھائی کی ہر رسم پر مصر ابلیس | تو منہ چھپائیں گی حوا کی بیٹیاں کبتک
سنا کہ حضرت اکبر ہیں حامی پردہ | مگر وہ کبتک اور انکی رباعیاں کبتک

لیکن اپنی والی کہے گئے اور جب تک دم میں دم رہا کچھ نہ کچھ کہے ہی گئے

کبھی یوں داد خوش نوائی دیتے ہے

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونو مہذب ہیں | حجاب انکو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

بہت کچھ اسی لے میں کہہ گئے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے انکا کہا ہوا ایک پورا مجموعہ (گو وہ مجموعہ بہت ناقص ہے) عورت نامہ کے نام سے چھاپ دیا ہے۔ مستقبل کا نقشہ فراست ایمانی کی راہ سے خوب دیکھ چکے تھے۔ ایک بڑی نظم میں پورا خاکہ کھینچ گئے ہیں نمونہ کے دو چار شعر ملاحظہ ہوں

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہونگے | نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردہ کی یہ پابندی | نہ گھونگھٹ اس طرح حاجب ہوئے روئے صنم ہونگے
بدل جائیگا معیار شرافت چشم دنیا میں | زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے

عقائد پر قیامت آئیگی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہونگے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر وبم ہونگے
تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

ظرافت سے ہٹکر سنجیدہ کلام میں بھی مذہب کی حمایت کا حق ادا کر گئے ہیں۔ یورپ کا جو چلا ہوا اعتراض اسلامی جہاد پر ہے اسکا ذکر کر کے کہتے ہیں ؂

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

جہاد، پردہ، طلاق، تعدد ازدواج وغیرہ متعدد اسلامی مسلکوں کی نصرت میں کلام کا اچھا خاصہ حصہ موجود ہے کہیں کہیں کوئی کلامی مسئلہ بھی اپنے مخصوص شاعرانہ رنگ میں حل کر گئے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ نفس میں جو تمنا یا خواہش پیدا ہوتی رہتی ہے کہ کاش یوں ہوتا یہ خود ہی ایک طرح کی دعا یا عرض حاجت ہے اور اس طرح لاشعوری طور پر ایک قادر علی الاطلاق خدا کی ہستی کا اعتراف ہے ؂

مجبور ماننے پر ہے منکر کی طبع بھی
خواہش کو کیا سمجھتے ہو صورت دعا کی ہے

دو اور شعر اسی حکمت و معرفت کے رنگ کے اسی لاجواب غزل کے سن لیجئے ؂

رفتار اور سمت میں موج ہوا کی ہے
اے قصہ گوئے بدر ضرورت حرا کی ہے
جغرافیہ سے حال گورنمنٹ پوچھیے
ہم تو یہ جانتے ہیں خدائی خدا کی ہے

اور کہیں کہیں شریعت کے پکوان میں شاعری کی چاشنی کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیتے ہیں ؂

ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ
معنی یہ ہیں کہ کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

توحید عبرت و فنا کے مضامین اس کثرت سے اور اس خوبی سے بیان کئے ہیں کہ انکا ایک حصہ بھی اگر نقل ہو تو یہ تعارف نامہ جو درحقیقت سرسری سے بھی زیادہ سرسری ہے ایک مستقل مقالہ کی شکل اختیار کرنے لگے۔

راقم آثم کی سب سے پہلے حاضری دربار اکبری میں اپریل ۱۲ء میں ہوئی اُدھر ۲۰ سال کی عمر کا طالب علم ادھر ۶۱ سال کا ایک بزرگ۔ نیازمندی کے یہ تعلقات بڑھتے گئے اور آں مخدوم کے وقت وفات تک قائم رہے۔ ادھر سے عقیدت اور تکریم تو کچھ واجبی ہی سی تھی۔ اُدھر سے شفقت و کرم کی البتہ کوئی حد نہ تھی۔ ۹ برس کی مدت کچھ ایسی کم نہیں۔ بات کہتے وہ لطف و انبساط کا زمانہ گزر گیا اور اپنی صرف حسرتناک یاد چھوڑ گیا۔ حضرت اکبر بارہا اس دوران میں لکھنؤ تشریف لائے اور کئی بار اس نیازمند کو بھی الہ آباد یا پرتاب گڑھ میں یاد فرمایا اور خط و کتابت تو کثرت سے رہا کرتی تھی۔

حضرت اکبر نثر نگاری کے بھی استاد تھے۔ ہلکی پھلکی سلیس عبارت شستہ زبان اور دلچسپ و دلنشین انداز بیان۔ خط لکھتے تو معلوم ہوتا کہ سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں خطوط کے تین مجموعہ چھپ بھی گئے ہیں جن میں سے ایک مجموعہ اسی عاصی کے نام کے خطوط کا ہے۔ گفتگو بڑی ہی دلآویز فرماتے بڑی۔ چھوٹی۔ اونچی۔ نیچی۔ دینی۔ دنیوی۔ علمی، سیاسی، شخصی سبھی طرح کی باتیں مجلس میں چھڑتیں۔ حضرت اکبر میں کمال تھا کہ موضوع کوئی سا بھی ہو اکثر تھوڑی دیر بعد گفتگو کا رخ توحید یا خدا کی طرف پھیر کر لے آتے۔ جوانی میں جو کچھ اور جیسے بھی رہے ہوں، آخر عمر میں

توحید و فنا کا خیال ہر دوسرے خیال پر غالب و حاکم بن گیا تھا اور کلام کی طرح گفتگو بھی اسی سے لبریز رہتی تھی۔

ہنستے کم اور ہنساتے زیادہ تھے۔ نماز اور تلاوت قرآن کے مشغلے گویا مقصد زندگی رہ گئے تھے۔ تلاوت کے دو وقت بندھے ہوئے تھے ایک بعد نماز فجر دوسرے بعد نماز ظہر، کبھی کبھی رات کو بھی موم بتیاں جلا کر قرآن مجید کھول کر بیٹھ جاتے اور بوڑھی و تھکی ہوئی آنکھوں سے تلاوت کیا کرتے۔

عربی کی استعداد کچھ زیادہ نہ تھی کہتے تھے کہ جو کچھ عربی آئی وہ تلاوت قرآن ہی کے طفیل میں آئی۔

۲۰ء میں ایک روز پرتابگڑھ میں تنہائی میں مجھسے فرمایا کہ یہ جو آپ میرے کلام کے اتنے گرویدہ ہیں تو اس میں بات کیا ہے۔ فارسی زبان کو سامنے رکھئے۔ کتنے ذہین اور قابل شاعر اس نے پیدا کئے لیکن دنیا نے یاد اُن میں سے دو ہی چار کو رکھا۔ یہی شیخ سعدیؒ اور مولانائے رومؒ وغیرہ۔ ان لوگوں نے اپنے کو مٹا کر اپنے خدا کی یاد تازہ رکھنا چاہی اس حی و قیوم نے بھی انھیں زندگی بخشدی۔

(۱۳) اکبر الہ آبادی[۱]

نئے لباس میں

مرے ہوئے لیکن نہ مرنے والے اکبر الہ آبادی کی یاد میں جو بزم اکبر کراچی میں قائم ہوئی ہے اس نے کلیات حصہ اول کا نیا ایڈیشن حال میں شائع کیا ہے۔ نئی وضع، نیا لباس، نئی سج دھج نئی چھب تختی۔

اس حصہ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا تھا یہ نیا ایڈیشن اسکے ۴۱ سال بعد نکل رہا ہے۔ اسکی ضخامت ۴۴۰ صفحات کی ہے۔ چھپائی اچھی صاف روشن، کاغذ اچھا، جلد بھی اچھی۔ یہ ساری خوبیاں ایک طرف، لیکن دوسری طرف غلطیوں کی بھی کمی نہیں —— غلطیاں زیادہ تر تو کاتب، پروف ریڈر اور مصلح سنگ کی غفلتوں کا نتیجہ اور اسکا بھی نتیجہ کہ مرتب صاحبان مسودہ کی ترتیب و تہذیب پر اتنا التفات صرف نہ کرسکے جتنے کا وہ مستحق تھا اور یہ آخری کمی تو خود حضرت اکبر ہی کے زمانہ سے چلی آرہی ہے —— اچھے سے اچھے شاعر کے لئے بھی یہ ضروری نہیں کہ اپنے کلام کا وہ اچھا ایڈیٹر بھی ہو۔

پرانے ایڈیشنوں میں کچھ دیباچے بھی مصنف کے قلم سے تھے۔ اس ایڈیشن میں انھیں غیر ضروری سمجھ کر حذف کردیا گیا ہے۔ حالانکہ ان سے شاعر کی شخصیت کے سمجھنے میں کسی حد تک مدد تو مل ہی جاتی تھی۔ اور اس سے

[۱] صدق جدید، مورخہ ۱۹ اکتوبر ۲۶ اکتوبر ۱۶ نومبر ۱۹۵۱ء ۱۵ فروری ۱۹۵۲ء

کہیں بڑھ کر تکلیف دہ اختصار پڑھنے والے کے لئے یہ ہے کہ فہرست مضامین سرے سے غائب! بیسویں صدی کا ناظر تو منتظر و متوقع انڈکس کا رہتا ہے، توضیحی نوٹوں کا رہتا ہے، تعارفی تمہید کا رہتا ہے خیر یہ سارے سہارے الگ رہے یہاں معمولی فہرست مضامین تک سے تخلیہ! کتاب کھولتے ہی طبیعت کو پہلا سبق مجاہدۂ صبر کا مل گیا!

اکبر کا سال پیدائش ۱۸۴۶ء ہے۔ شعر گوئی ۱۶ یا ۱۷ سال کی عمر سے شروع کر دی تھی اس کلیات میں کلام کل ۵۰ سال تک کی عمر کا آیا ہے۔ گویا صرف ۱۸۹۶ء تک کا۔ انیسویں صدی کے ختم سے بھی چار سال قبل تک کا ——

اکبر کو ابھی ۲۵ سال کی اور مہلت کہنے سننے کی باقی تھی اور یہی زمانہ بہ حیثیت مجموعی انکی بہترین سخنگوئی کا ہے۔ اور کلام کا اپنی پختگی پر پہنچنا تو اس سن میں ظاہر ہی ہے۔ لیکن یہ ابتدائی اور درمیانی عمر کا کلام بھی ہرگز نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں۔ اور بے قدری کیا معنی اگر بعد کا کلام اس سے بھی بہتر بلند تر اور پاکیزہ تر نہ مل جاتا تو یہی کلیات اول والا کلام آخری قدر و احترام کا مستحق تھا۔ آنکھوں میں لگانے کے قابل سر پہ رکھنے کے لائق۔

یہ کلیات دو بڑے حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ نسبتہً بڑا، غزلیات کا ہے ص۵ سے ص۲۳۴ تک۔ دوسرے حصہ میں رباعیات، قطعات و دیگر منظومات ہیں ص۲۳۵ سے ص۴۴۰ تک۔ پہلے حصہ کے تین دور قائم کئے ہیں، شاعر کی عمر کے لحاظ سے۔ اور یہ بہت اچھا کیا ہے تاکہ کلام کی ترقی درجہ بدرجہ ظاہر ہوتی رہے۔ دور اول میں، ۱۷ سال کی عمر سے لیکر ۳۰ سال کی عمر تک کا کلام ہے (ص۵ تا ص۴۰)

دورِ دوم میں ۳۰ سے ۴۰ سال کی عمر تک کا (ص ۵۱-۹۵) اور دورِ سوم میں ۴۰ سے ۵۰ سال کی عمر تک کا (ص ۹۹-۲۳۵) یہ دَور وار تقسیم پرانے اڈیشنوں میں بھی تھی لیکن ترتیب میں فرق کر دیا گیا ہے اور یہ بڑا فرق ہے۔ پہلے دورِ سوم شروع میں تھا اور دورِ اول آخر میں (شاید اس خیال سے کہ دورِ اول کا کلام کمزور ہی ہوگا) اب یہ ترتیب اُلٹ کر صحیح تاریخی ترتیب قائم کر دی گئی ہے۔ یعنی شروع کا کلام شروع میں آخر کا آخر میں اور درمیان کا درمیان میں۔

اب دورِ اول خود ۱۰ حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے ۱۷، ۱۸ سال کی عمر کی غزلیں پھر ۱۹، ۲۰ سال کی پھر ۲۱ سال کی۔ وقس علیٰ ہذا ـــــ بعض صاحبوں کا کہنا ہے کہ یہ سارا رطب و یابس کلام جمع کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ صرف ایک اچھا انتخاب چھاپ دینا کافی تھا۔ لیکن سوال یہی ہے کہ یہ اچھا انتخاب کون کرے؟ اور انتخاب کے اچھے ہونے کی ذمہ داری کون اپنے سر لے؟ غالب کی خوش نصیبی ہر شاعر کے حصہ میں کہاں سے آسکتی ہے کہ اُسی معیار سے اُسی دورِ زمانہ کے دوسرے اہلِ ذوق بھی متفق ہوں، چہ جائیکہ ماحول بدل جانے کے بعد! غالب تک کا کوئی بھولا بھٹکا شعر مستند دیوان سے باہر کا جب کہیں اِدھر اُدھر نظر پڑ جاتا ہے۔ تو جی یہی چاہنے لگتا ہے کہ اسے بھی مستند دیوان کے حاشیہ پر یا بین السطور میں کہیں ٹانک ہی لیجئے! باقی یہ بالکل ظاہر ہے کہ کسی بھی شاعر کا کلام اول سے آخر تک ایک معیار اور ایک سطح کا ہو ہی نہیں سکتا (گستاخوں نے تو کلام اللہ تک کے درجے، بلیغ، بلیغ تر و بلیغ ترین کے قائم کر دیے ہیں)۔ امیر۔ داغ، جلال، جلیل، ریاض

حسرت، اب اس آخری دور میں خوش گوئی و خوش فکری کے امام ہوئے ہیں۔ لیکن جب انکے کلام کے بڑے بڑے ضخیم مجموعے سامنے آتے ہیں تو عقیدتمندوں کے دلوں کو دھچکا ہی پہنچتا ہے اور زبانوں پر بے اختیار ہی آنے لگتا ہے کہ کاش انکے فلاں فلاں جزو باقی رہتے اور فلاں فلاں نہ رہتے!

اکبر غریب بہر حال بشر اور بشریت کے سارے عارضوں میں گرفتار، اس کلیہ سے مستثنیٰ کیونکر رہ سکتے ہیں، اس حقیقت کو ذہن میں جماکر جو آگے چلیے تو ان شاء اللہ کبھی مایوسی سے دوچار ہونا نہ پڑے گا۔

۱۷-۱۸ سال کا سن بھی کوئی شاعری کا ہوتا ہے؟ حکیمانہ، عارفانہ شاعری کو چھوڑیے۔ ادبی شعری ذوق کا بھی تو یہ زمانہ بچپن کا ہوتا ہے، اکبر کے ہم سن لڑکے اس سن میں لنگر لڑا رہے ہونگے یا چرخیوں پر ڈور لپٹا رہے ہونگے۔ اکبر کے لڑکپن کو دیکھیے اور اس کلام کو:—

جانب زنجیر گیسو پھر کھنچا جاتا ہے دل — دیکھئے اب سیر میں پر کیا بلا لاتا ہے دل

ساتھ ساتھ اپنے جنازہ کے یہ چلاتی تھی روح — ان کو مٹی میں ملانے کیلئے جاتا ہے دل (۶۲ء)

جوانی زندگانی کو حباب آسا سمجھتے ہیں — نفس کی موج لب دریا سمجھتے ہیں

گواہی دیں گے روز حشر یہ سارے گناہوں کی — سمجھتا میں نہیں لیکن مرے اعضا سمجھتے ہیں

یہی اُرخ ہے کہ جس پر پھول کا اطلاق ہوتا ہے — یہی آنکھیں ہیں جنکو نرگس شہلا سمجھتے ہیں

اُسے ہم آخرت کہتے ہیں جو مشغول حق رکھے — خدا سے جو کرے غافل اُسے دنیا سمجھتے ہیں

کس غضب کا ہے معاذ اللہ طول روز ہجر — حشر مجھ پر ہو گیا لیکن یہ ڈھلتا ہی نہیں

زرا دل پر ہاتھ رکھ کر کہئے گا، کتاب میں اگر عمر کی یہ تصریح مندرج نہ ہوتی تو کبھی بھی آپ اس کلام کو ایک ۱۷ سال کے لڑکے کا سمجھ سکتے تھے؟

اور ۱۹، ۲۰ سال کی عمر میں اس مصرعہ طرح ع

یاد آتی ہے بلبل مجھے تقریر کسی کی

پر یہ استادانہ پیش مصرعہ کہ ع سنتا ہوں چمن میں جو تری زمزمہ سنجی

اور اسی سن میں ان ان مضمونوں کا ورود و نزول، اللہ اللہ ع

بیخودی پردہ کثرت جو اٹھا دیتی ہے — ہر طرف جلوہ توحید دکھا دیتی ہے
نگہ شوق سے کیونکر نہ گلوں کو دیکھوں — ان کی رنگت ترے عارض کا پتہ دیتی ہے
پوچھتا ہوں میں جو عبرت سے مآل ہستی — راستہ گور غریباں کا بتا دیتی ہے
کشتہ ہوں مرگ حسیناں کی میں بیدردی کا — خاک میں چاند سی صورت کو ملا دیتی ہے
کیا ہی رہ رہ کے طبیعت مری گھبراتی ہے — موت آتی ہے شب ہجر نہ نیند آتی ہے
بزم عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں — کوئی گذری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے (۱۸۹۱)

اور اسی عمر میں یہ معرکہ کی غزل سولہ شعر والی، جسکا ایک شعر بھی انتخاب سے باہر رہنے والا نہیں ع

کہیں دل ہوں کہیں میں باعث بیتابئی دل ہوں — کہیں انداز بسمل ہوں کہیں میں ناز قاتل ہوں
کہیں جلوہ ہوں صورت کا کہیں ہوں شاہد معنی — کہیں ہوں محمل لیلیٰ کہیں لیلائے محمل ہوں
کہیں عمر دو روزہ ہوں کہیں ہوں آرزو دل کی — کہیں گھٹنے کے لائق ہوں کہیں بڑھنے کے قابل ہوں
کہیں جوش اہل معنی کا کہیں ہوش اہل صورت کا — کہیں شور انا الحق ہوں کہیں دعوائے باطل ہوں
کہیں ہوں صورت لیلیٰ کہیں حال دل مجنوں — کہیں چھپنے کے لائق ہوں کہیں کھلنے کے قابل ہوں

ستائیسویں سال میں پہلی مختصر غزل فارسی کی ملتی ہے اور اٹھائیسویں سال کے تحت میں تو تین تین غزلیں فارسی کی نظر آتی ہیں، خاصی بڑی بڑی۔

اور ۲۹، ۳۰ تک پہنچے تو یہ رنگ عام ہو چکا تھا ؎

مورد طعنہ بیگانہ احباب ہوا — خوب رسوا ترے ہاتھوں دل بیتاب ہوا
تیرے جلوہ سے ہوا حسن ظہور ایجاد — نور تیرا سبب عالم اسباب ہوا
رہی ہر کام میں ہر وقت مسبب پہ نگاہ — اپنا منظر نہ کبھی عالم اسباب ہوا
یاں کی رنگینیاں ہیں عین دلیل غفلت — سرخی چشم سے پیدا اثر خواب ہوا (۵۳ء)

اس کے بعد جو دور آیا وہ اس رنگ کلام کی پختگی بھی ساتھ لایا ؎

رہا شہرۂ عشق کا یاں مجھے ڈر۔ انھیں اپنے پردے کا خوف و خطر
رہیں دل ہی میں حسرتیں دونوں طرف، جو میں جا نہ سکا تو وہ آ نہ سکے (۵۵ء)

آپ کے شہرۂ رحمت نے تو ڈھایا ہے غضب — ایک عالم کو گنہ گار بنا رکھا ہے (۵۵ء)
وہ نظر جو مجھ سے ملا گئے تو بلا و آفتیں ڈھا گئے — کہ حواس و ہوش و خرد ہیں اب نہ شکیب و صبر و قرار ہے

یہ نوید اوروں کو جا سنا ہم اسیر دام ہیں اے صبا — ہمیں کیا جو چمن پہ ہو رنگ سا ہمیں کیا جو فصل بہار ہے (۵۱ء)
ہے عشق میں ہر لحظہ ترقی مرے دل کی — ہر داغ بڑھاتا ہے تجلی مرے دل کی
نظروں سے تری گر کے ہوا عشق دوبالا — ہوتی ہے تنزل میں ترقی مرے دل کی (۵۲ء)

(۳)

۴۰ کا سن پورے عقلی بلوغ کا ہوتا ہے۔ پختگی کلام میں اب کیوں نہ آجاتی۔ اس دور کا کلام رنگ تغزل اور مضامین معرفت دونوں ہی کے لحاظ سے قدرۃً ممتاز ہے۔

انتخاب میں آنے کیلئے پہلی ہی غزل مچل رہی ہے۔ زمین "خدا میرا" "پتا میرا"

میری حقیقت ہستی یہ مشتِ خاک نہیں
بجا ہے مجھ سے جو پوچھے کوئی پتا میرا

اور مقطع سے

غرور انھیں ہے تو مجھکو بھی ناز ہے اکبر
سوا خدا کے سب انکا ہے اور خدا میرا

دوسری غزل کا ایک ایک شعر پکار رہا ہے کہ میں بس اکبر ہی کی زبان سے ادا ہو سکتا ہوں

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بُت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

گُل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش
طالب زمزمۂ بلبل شیدا نہ ملا

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

سید اُٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا

(یہ تو ذہن میں ہو ہی گا کہ حضرت سید کے ہفتہ وار پرچہ کا نام علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ تھا) نمبر ۱ یہ ایک بڑی سی غزل ۱۱ شعر کی ہے اس کے بعض شعر دل کو میں نے حضرت اکبر کے صاحبزادے عشرت میاں کو ستار پر گنگناتے سنا تھا اور یہ بھی سنا تھا کہ خود حضرت اکبر کو ایک حد تک اسی پر ناز تھا۔ بعد کو اسے میاں نے اپنے قوالوں کو یاد کرا دیا تھا، اور انکی زبان سے مدتوں اسے سنتا اور وجد کرتا رہا۔ ملاحظہ ہو:

غنچۂ دل کو نسیم عشق نے وا کر دیا
میں مریضِ ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا

شان محبوبی صانع کا نشاں رکھا ہے یہ
ورنہ کیا تھا جس نے دل میں درد پیدا کر دیا

دین سے اتنا الگ حد فنا سے یوں قریب
استغفر اللہ تعجب پھر کیوں زنگ دنیا کر دیا

کیا سمجھے اک دل کو خوش کرنے پر قادر نہیں
ایک کُن سے دو جہاں کو جس نے پیدا کر دیا

سب کے سب باہر ہوئے فہم و خرد، ہوش و تمیز — خانۂ دل میں تم آؤ ہم نے پردہ کر دیا
شاہد بزم ازل نے اک نگاہِ ناز سے — عشق کو اس انجمن میں مسند آرا کر دیا
شورِ شیریں کا مزہ رکھا سرِ فرہاد میں — قیس کو دیوانۂ انداز لیلا کر دیا
گردنِ پروانہ میں ڈالی کمندِ شوقِ شمع — رنگِ گل کو دیدۂ بلبل کا شیدا کر دیا
جس نے یہ سب کچھ کیا اکبر میں تم سے کیا کہوں — اسی نے مجھکو کیا کیا دل کو مرے کیا کر دیا

اور اس سے متصل ایک دو شعری مختصر نعتیہ غزل اپنے رنگ میں لاجواب ہے ؎

دُرفشانی نے تیری قطروں کو دریا کر دیا — دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے — کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

راقم آثم کا ایک تفسیری مضمون سورۃ الفرقان (پ ۱۹) کے آخری رکوع تبارک الذی جعل فی السماء الخ پر ہے نعت و مدح صحابہ کا جامع اسکا عنوان "مردوں کی مسیحائی" اسی شعر اکبر کے دوسرے مصرعہ سے اڑایا ہوا ہے۔

نمبر ۲ پر جو تین شعر غزل کے ہیں وہ اسی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں جو عاشق بھی ہو اور ساتھ ہی عارف بھی ؎

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا — دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا
آ گئی تجھکو نظر صانع عالم کی جھلک — سامنے کچھ نہ رکھ آئینۂ فطرت کے سوا
تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں پیدا دفتر — ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

اور یہ شعر تو اتنی بار دہرایا جا چکا ہو کہ جیسے اردو ادب میں ضرب المثل بن گیا ہو (۲۴) ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا — دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اور اسکے معاً بعد یہ مطلع بھی خاص اکبری تیور اور اکبری ٹھاٹھ کا ہے ؎

یہ بُت پنہاں نہیں ہوتے خدا ظاہر نہیں ہوتا غنیمت وہ زمانہ ہے کہ میں کافر نہیں ہوتا

نظیر اکبر آبادی کا کلام اگر ذہن میں ہو، تو عجب نہیں کہ ذیل کی غزل جو مزیدار یوں بھی ہے۔ مزید اور طرفہ مزہ دے جائے ؎

پست ہے تو پھر کیا وہ تیز ہے تو پھر کیا نیٹو جو ہے تو پھر کیا، انگریز ہے تو پھر کیا
رنج و خوشی کی سب میں تقسیم ہے مناسب بابو جو ہے تو پھر کیا، چنگیز ہے تو پھر کیا
کسی بھی سلطنت پہ سب خوش نہ رہ سکیں گے گر ترک ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا
دونوں ہی مر رہے ہیں دونوں کا حشر ہوگا نیٹو جو ہے تو پھر کیا، انگریز ہے تو پھر کیا (ص۲۲)

ذیل کی غزل (ص۹۵) "ماڈرن" ہے لیکن قدیم اور روائتی رنگ تغزل کو بھی سنبھالے ہوئے ؎

ہے غضب جلوہ دیر فانی کا پوچھنا کیا ہے اسکے بانی کا
خوب جی بھر کے ہو لئے بدنام حق ادا کر دیا جوانی کا
کرتے ہیں مجھ سے بے تمیز کا شکریہ شکر ہے انکی مہربانی کا
قتل سے پہلے ہے کلوروفارم شکر ہے انکی مہربانی کا
شیخ در گور و قوم در کالج رنگ ہے دورِ آسمانی کا

آتش اور انکے شاگردوں کے زمانہ میں ایک چلی ہوئی زمین ردیف "سما" میں آسماں ہو کر، داستاں ہو کر، کی تھی اور اس وقت کے استادوں کی کہی ہوئی بڑے بڑے معرکہ کی غزلیں اسی زمین میں تھیں۔ اکبر نے بھی شاید انھیں روائتوں سے متاثر ہو کر ایک چو غزلہ اسی زمین میں کہہ ڈالا (۷۹ تا ۸۳) جن میں ہر غزل بجائے خود طویل ہے، ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالتے چلئے ؎

مجھی سے سب یہ کہتے ہیں کہ رکھ نیچی نظر اپنی
کوئی اُن سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہوکر

قریب ختم تھی مجلس کہ آ نکلے ادھر وہ بھی
غرض واعظ کی محنت رہ گئی سب رائگاں ہوکر

قیامت کیا ہے خلقت کو نہ صبر آنا جدائی پر
یہ فطرت خود بنے گی صور سرگرم فغاں ہوکر

کیا اچھا جنھوں نے دار پر منصور کو کھینچا
کہ خود منصور کو جینا تھا مشکل رازداں ہوکر

الگ رکھتی ہے فطرت ہوش کو ایسے مواقع پر
کہیں افشا نہ کردے راز ہستی رازداں ہوکر

مری میت پہ یہ فرماتے ہیں واعظ بدگماں ہوکر
قیامت ڈھائے گا جنت میں یہ ڈھانچا جواں ہوکر

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس حصہ غزلیات میں حالانکہ اسکے اندر غزلیں محض ردیف وار حروف تہجی کے اعتبار سے ہیں تاریخ وار نہیں۔ شاعر جوں جوں آگے بڑھتا گیا ہے، حکمت، معرفت، سیاست، اور اصلاحی طنز کا رنگ اور نکھرتا ہی گیا ہے اور ردیف "ن" اور ردیف "ی" میں کثرت سے ایسا کلام ملتا ہے، جو اکبر کے ہر چھوٹے سے چھوٹے انتخاب میں جگہ پانے کے قابل ہے —— قدم قدم پر اسی طرح کے شعر ملتے ہیں اور آخر حصہ غزلیات تک ملتے چلے جاتے ہیں ؎

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں
میں تو انگریزوں ہی سے ڈرتا ہوں (ق ۱۰)

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

اہل ظاہر جسقدر چاہیں کریں بحث و جدال
میں یہ سمجھا ہوں خودی ہیں تو خدا ملتا نہیں (د ۱۰۸)

بحثیں فضول تھیں یہ کھلا حال دیر میں
افسوس عمر کٹ گئی لفظوں کے پھیر میں (د ۱۱۷)

دلیلیں فلسفہ کو نور باطن کر نہیں سکتیں
کواکب کی شعاعیں رات کو دن کر نہیں سکتیں

ضروری چیز ہے اک تجربہ بھی زندگانی میں
تجھے یہ ڈگریاں بوڑھوں کا ہمسن کر نہیں سکتیں (ص ۱۲۶)

عوض قرآن کے اب ہے ڈارون کا ذکر ، یاروں میں
جہاں تھے حضرت آدم وہاں بندر اُچھلتے ہیں (ص ۱۳۳)

ہے پاسِ شریعت بھی ہم کو ہیں عشق کی لہریں بھی دل میں
پابند ہیں ساحل مذہب کے دریا کی طرح سے بہتے ہیں

اکبر کی بُرائی اچھائی تو پوچھو محلہ والوں سے
نظم اُنکی سنی ہے البتہ ہاں شعر تو اچھا کہتے ہیں (ص ۱۳۴)

شک ہے راہ ترقی میں اگر بڑھتے ہو
یہ تو بتلاؤ کہ قرآن بھی کبھی پڑھتے ہو

دین کو سیکھ کے دنیا کے کرشمے دیکھو
مذہبی درس "الف بے" ہو علیگڈھ "تے" ہو (ص ۱۴۶)

سب ہو چلے ہیں اس بت کافر ادا کے ساتھ
رہ جائیں گے رسول ہی بس اب خدا کے ساتھ (ص ۱۴۸)

دیوانوں سے ہو شعر نہ چھنئے سب کا خلاصہ مجھ سے سنئے
آپکی صورت سبحان اللہ میری نیت توبہ توبہ

مذہب چھوڑو ملت چھوڑو صورت بدلو عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ (ص ۱۵۱)

بیکار شب کو یوں سر بستر پڑا نہ رہ
اکبر جو تجھکو نیند نہ آئے تو شعر کہہ (ص ۱۵۴)

ردیف "ن" و "واؤ" و "ہ" کا جائزہ ہو چکا

(۳۲)

ردیف "ی" قدرۃً طویل بھی بہت ہے اور شاید سب سے زیادہ پربہار بھی لفظی، صوری اعتبار سے بھی اور معنوی فکری معیار سے بھی حسن بیان و لطف زبان پر کہیں کہیں کلام داغ کا دھوکا - اور معنویت کے لحاظ سے مثال کس کی پیش کی جائے اسکا معیار تو وہ خود ہی تھے - اب کلام ملاحظہ ہو :-

دل مرا اُن پہ جو آیا تو قضا بھی آئی ۔۔۔ درد کے ساتھ ہی ساتھ اسکی دوا بھی آئی
آئے کھولے ہوئے بالوں کو تو شوخی سے کہا ۔۔۔ میں کبھی آیا ترے گھر میری بلا بھی آئی
وائے قسمت کہ مرے کفر کی وقعت نہ ہوئی ۔۔۔ بت کو دیکھا تو مجھے یاد خدا بھی آئی (ص۱۶)

دیوان میں جا بجا فارسی کا کلام بھی ہے۔ فارسی کو لوگ اسوقت تک بھولے نہیں تھے۔ کہنے والے بھی اور سمجھنے والے تو خیر بہت سے تھے ہی لیکن ایک بات اس دیوان میں یہ بھی ہے کہ کہیں کہیں اکبر، نظیر اکبر آبادی کی طرح، اُردو کے بجائے ٹھیٹھ ہندی یا بھاشا کا لفظ لے آئے ہیں۔ اور کلام کی شیرینی اور تاثیر میں اس سے ذرا فرق نہیں آنے دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

سکھ پائے طبیعت جس سے تری، رکھ شغل اپنا دن رات وہی
جو دل میں سمائے من بھائے، ہے تیرے لئے حق بات وہی
دھرتی نے جو بدلا رنگ تو کیا تو اپنی نظر اُوپر کو اُٹھا
داتا کے کرم میں کیا ہے کمی بدلی ہے وہی برسات وہی (ص۱۶۹)

ایسا صرف کہیں کہیں ہے۔ ورنہ عام رنگ تغزل کے ساتھ ساتھ عام زبان وہی اردوئے معلّی ہی ہے ؎

مری ناکامیابی کی بھی کوئی حد ہو نہیں سکتی ۔۔۔ صداقت چل نہیں سکتی خوشامد ہو نہیں سکتی
مری ہستی ہے خود شاہد وجود ذات باری کی ۔۔۔ دلیل ایسی ہے یہ جو عمر بھر رد ہو نہیں سکتی
نہیں ہاتھ آتی دولت نام لینے سے بزرگوں کے ۔۔۔ بجائے جد کے ترکیب زر جد ہو نہیں سکتی (ص۱۷۰)

اسی دور کا ایک شعر ایسا ہے جو شمار میں ہے ایک ہی لیکن اپنی جامعیت لطافت حسن و صداقت کے لحاظ سے پورے ایک دیوان پر بھاری ہے۔

حسن ہے بے وفا بھی فانی بھی ۔۔۔ کاش سمجھے اسے جوانی بھی! (ص۱۷۱)

غالب کی مشہور غزل،

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی | اب کسی بات پر نہیں آتی

ذہن میں تو ہو ہی گی۔ اکبر تبدیلیِ قافیہ کے ساتھ اس بحر میں کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں ؎

آئی ہو گی کسی کو ہجر میں موت | مجھ کو تو نیند بھی نہیں آتی
عاقبت میں بشر سے یہ سوا[1] | جانور کو ہنسی نہیں آتی
حال وہ پوچھتے ہیں میں ہوں خموش | کیا کہوں شاعری نہیں آتی (ص ۱۸۲)

مجاز کے ساتھ حقیقت اور حسنِ ادا کے ساتھ معرفت ان غزلوں کی جان ہے ؎

کر دیا نزع نے واقف کہ یہ ہستی کیا تھی | ہوش آیا تو کھلا حال کہ مستی کیا تھی (ص ۱۸۱)

ذیل کی غزل کا ذکر اسی راقم آثم کی زبان سے اور بھی وہ ایک بار آ چکا ہے لیکن یہ اتنی مرصع کہ طبیعت اسکے ذکر سے نہیں بھرتی اور آج کے جائزہ میں تو جی چاہتا ہے کہ بلا حذف و انتخاب پوری کی پوری ہی سنا دی جائے ؎

الجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے | مانگی نہ مدد دل نے مرے طول امل سے
انکی نگہ مست ہے لبریز معانی | ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے
ادراک نے آنکھیں شب اوہام میں کھولیں | واقف نہ ہوا روشنیٔ صبح ازل سے
قرآن ہی شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے | کس حسن سے یہ بھی تو سنو حسن عمل سے
حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تک چپ | عظمت ترے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے
درجہ متحجر کا ہے بےنمو دہے فرو تر | ہے روح کو امید ترقی کی اجل سے
بحث کہن و نو میں سمجھتا نہیں اکبر | جو ذرہ ہے موجود ہے وہ روز ازل سے
یہ دعویٰ توحید مبارک تمھیں اکبر | ثابت بھی کرو اسکو مگر طرز عمل سے (ص ۲۴۱)

"صاحب" کی لائی ہوئی تہذیب کے اندر مذہبی تعلیم بھی جس رنگ کی اور جس حد تک شامل ہے ۔۔۔

[1] کلیات میں پہلا مصرعہ غلط چھپا ہے یعنی "عاقبت میں" کے بجائے "عاقبت میں"

غزل ہی کی لپیٹ میں حضرت اکبر اس زمانے میں فرما گئے ہیں اور ایسے پیرایہ میں جو مخصوص انہیں کا حصہ تھا۔

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے ۔۔۔ مگر یونہی کہ گویا آب زمزم مے میں داخل ہے

کہاں تک داد دوں تیری بلاغت کی میں اے اکبر ۔۔۔ یہ تیرا ایک مطلع لاکھ مضمونوں کا حاصل ہے (ص ۴۳)

بعض غزلیں مرثیہ نما مسلسل بھی ہیں۔ ان میں سے اشعار کا انتخاب کرنا ان کے تسلسل مضمون پر ظلم کرنا ہے۔ لیکن بہر حال نقل اتنی بھی تو نہ ہو کہ تبصرہ کا حاصل محض "نقالی" ہی رہ جائے۔ ذیل کی ۱۳ شعر کی غزل کا بیشتر حصہ ملاحظہ ہو۔ اور صرف اتنا یاد رہے کہ یہ کلام اسوقت کا ہے، جب "نئی تعلیم" اور "نئی تہذیب" کا عین شباب تھا۔ داد ہی داد اسے ہر طرف سے مل رہی تھی اور اس کی مضرتوں کا نام بھی کسی کی زبان پر مشکل سے آرہا تھا۔

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملک عدم ہونگے ۔۔۔ نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے

نہ خاتونوں میں رہ جائیگی پردہ کی یہ پابندی ۔۔۔ نہ گھونگھٹ اس طرح حاجب روئے صنم ہونگے

خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی ۔۔۔ کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہونگے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے ۔۔۔ نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہونگے

ہماری اصطلاحوں سے زبان نا آشنا ہوگی ۔۔۔ لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے

بدل جائیگا معیار شرافت چشم گردوں میں ۔۔۔ زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے

کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا ۔۔۔ ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر ۔۔۔ بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے (ص ۴۲)

پیام یار لکھنؤ کی شاعری کا مرقع ایک پرانا اور اپنے زمانہ کا مشہور شعری رسالہ یا گلدستہ تھا۔ غزلیں بغیر کسی استثنا کے اس قدیم عاشقانہ رنگ کی شایع کرنے والا۔ اکبر بھلا کب چوکنے والے تھے۔ اس کی دی ہوئی طرح پر بھی غزل کہتے۔ مگر دو ایک شعر تو ضرور ہی اپنے

رنگ کے نکال لیتے۔ "کیجئے ظلم دم نہ ماریں گے" اس زمین میں فرماتے کیا ہیں ؎

بحث میں مولوی نہ ہاریں گے — جان ہاریں گے جی نہ ہاریں گے

اور قافیہ تو دیکھئے یہ نکالا ہے ؎

رزق مقسوم ہی سے ملیگا اپنے — کوئی دنیا میں دوڑے یا رینگے (صفحہ ۲۵۴)

اور ظرافت اور دل لگی تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ کہنا نہ بھی چاہتے۔ جب بھی کہہ ضرور جاتے تھے۔ مومن خاں کی مشہور غزل یاد کر لیجئے۔ "کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کرینگے" قافیہ میں ایک خفیف تغیر کے ساتھ ؎

دیوانہ نہ سمجھ ہمیں سمجھے، وہ شرابی — اب چاک کبھی جیب و گریباں نہ کرینگے (صفحہ ۲۵۵)

اکبر کے بعض شعر جو اس کثرت سے زباں زد ہوئے کہ ضرب المثل کے پہنچنے کے قریب ہو گئے وہ اسی دور کے ہیں، اور اکثر اسی ردیف "ے" کے۔ مثلاً

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے — وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے (صفحہ)

ابھی دور فلک میں اور بھی آنے والے — ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے (صفحہ ۲۶۰)

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے — دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے (صفحہ)

باقی عام معیار جو ردیف "ے" کے اس آخری حصہ میں کلام کی بلاغت، حسن صناعت معنویت، لطافت کا ہے اس کے نمونے کے لئے ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

اہل غرور و حرص کو کیا علم سے شرف — تا چرخ بھی پہونچ کے وہ شیطاں ہی رہ گئے (صفحہ)

ہے وہم نقش ہستی ہر چند دلنشیں ہے — دیکھو اسے تو سب کچھ سوچو تو کچھ نہیں ہے (صفحہ)

کیا ملا عرض آن و این کر کے — چل دیئے وہ خیال چنیں کر کے (صفحہ)

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے

وہ فلک نہ رہا وہ سماں نہ رہا وہ مکاں نہ رہا وہ مکیں نہ رہا
وہ گلوں میں گلوں کی سی بو نہ رہی وہ عزیزوں میں لطف کی خو نہ رہی
وہ حسینوں میں رنگ وفا نہ رہا کہیں اور کی کیا وہ ہمیں نہ رہے
غم و رنج میں اکبر گر ہے گھرا تو سمجھ لے کہ رنج کو بھی ہے فنا
کسی شے کو جہاں میں نہیں ہے بقا تو اور زیادہ ملول و حزیں نہ رہے (ص ۲۶۵)

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

صبر اس لئے اچھا ہے کہ آئندہ ہے امید
موت اس لئے بہتر ہے کہ آسان یہی ہے (ص ۲۶۶)

بے نالہ و فریاد و فغاں رہ نہیں سکتے
قہر اس پہ یہ ہے کہ سبب کہہ نہیں سکتے (ص ۲۷۳)

ہم نے یہ نکتہ سنا ایک مرد حق آگاہ سے
پھر گیا اس سے زمانہ جو پھرا اللہ سے (ص ۲۷۴)

وہ عشق کیا جو نہ ہو ہادیِ طریق کمال
جو عقل کو نہ بڑھائے وہ عاشقی کیا ہے (ص ۲۸۶)

مسلمانوں کو لطف عیش سمجھنے نہیں دیتے
خدا دیتا ہے کھانا شیخ جی پینے نہیں دیتے (ص ۲۹۴)

شیخ جی اپنی سی بکتے ہی رہے
وہ تھیٹر میں سحر کرتے ہی رہے

گائیں سبزہ پا گئیں کر کے کلیل
اونٹ کانٹوں پر لپکتے ہی رہے (ص ۲۹۵)

سیکڑوں دور جنوں میں ابھی آنے والے
مطمئن کیا ہیں مجھے ہوش میں لانے والے

خاتمۂ عیش کا حسرت ہی پہ ہوتے دیکھا
رو ہی کے اٹھتے ہیں اسی بزم سے گانے والے

آپ اندھیرے میں ہیں بجلی سے مدد لیتے ہیں
چاند سورج میں ہیں راہ دکھانے والے

آپ منکر ہیں غلامی ہی نہیں ملتی ہے
سلطنت کر گئے عقبیٰ سے ڈرانے والے (ص

رحم کر قوم کی حالت پہ تو اے ذکر خدا
بے ادب ہو گئی مجلس ترے اٹھ جانے سے

اور کوئی کوئی شعر تو اس حصہ میں مرتبۂ خاص سے گزر کر درجۂ اخص میں رکھنے کے قابل ہے۔ مثلاً

یہ تمھارے ہی دم سے ہے بزم طرب بھی جاؤ نہ تم ونہ کرو یہ غضب
کوئی بیٹھ کے لطف اٹھائے گا کیا کہ جو رونق بزم تمھیں نہ رہے (صفحہ ۲۶۲)

غزلوں پر سرسری تبصرہ ہو چکا اب ایک اچٹتی سی نظر رباعیات قطعات و دیگر منظومات پر بھی ہو جائے ـــــ یہ کشکول نما عنوان مرتب صاحب نے یوں ہی دیا ہے۔

رباعیات کوئی ۳۰ صفحہ میں آئی ہیں، صفحہ ۲۳۵ سے صفحہ ۲۶۵ تک۔ اور تعداد میں ۱۶۲ ہیں لیکن ایک آدھ چیز اس حصہ میں ایسی آگئی ہے، جسے بجائے رباعی کے قطعہ یا محض نظم کے ماتحت ہونا تھا۔ مثلاً صفحہ ۲۵۱ کی وہ رباعی جس پر نمبر ۹۰ پڑا ہے ؎

لوگ ہنستے ہیں جو پیش آتی ہے یہ حالت کبھی
من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو
لیکن اخلاقی نظر میں اس سے تو بہتر ہے وہ
من ترا پاجی بگویم تو مرا پاجی بگو

اس طرح یہ ذیل کا قطعہ بھی، جس پر رباعیوں کا نمبر ۱۵۰ پڑا ہے ؎

کمیٹیوں سے نہ ہوگا کچھ بھی غرض اگر مشترک نہ ہوگی
خیال ملت نہ ہوگا جبتک مفید ہرگز یہ بک نہ ہوگی
بہت بجا نوٹ لکھ گئے ہیں یہ اپنی پوتھی میں بھائی نانک
غذا نہ ہوگی تو کیا جیوگا دیا کرو تم ہزار ٹانک

افسوس ہے کہ اس حصہ میں سنہ و تاریخ وغیرہ کہیں رہنمائی کے لیے موجود نہیں اس لئے کچھ بھی پتا نہیں چلتا کہ کون رباعی کس زمانہ کی اور کس ماحول میں

کہی ہوئی ہے۔ سوا اس کے کہ کہیں رباعی کے مضمون ہی سے کچھ سہارا مل جائے۔

اکبر کی سیاسیات پر آج کل خوب لے دے ہو رہی ہے اور زور شور سے کہا یہ جا رہا ہے کہ ملک کی سیاسی آزادی کے لئے جد و جہد میں بلکہ تبلیغ وطنیت میں اکبر کا قطعاً کوئی حصہ نہیں۔ اعتراض اگرچہ غلط در غلط ہے۔ اول تو کسی اچھے اور بڑے شاعر کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ اس نے وطنی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبہ میں حصہ لیا ہی ہو۔ اس لئے اگر زبان اکبر اس باب میں خاموش ہے تو اس سے شاعر کی منقصت ہی کیا ہوئی اور پھر کلام کی جانچ اور پرکھ کا یہ معیار تو تمامتر اضافی اور حالات زمانہ کے تابع ہے۔ ۱۹۵۲ء میں جو معیار تنقید ہے۔ نہ یہ ہرگز ضروری ہے کہ آج سے ۵۰ سال قبل بھی یہی معیار رہا ہو، اور نہ یہ ضروری کہ آج کے ۵۰ سال بعد بھی یہی قائم رہ جائے۔ اور ان دونوں زبانوں سے بھی بڑھ کر یہ کہ اکبر کا جو پیام تھا، وہ تو اس "وطنیت" اور "سیاسی آزادی" سے کہیں برتر اور وسیع تر تھا۔ وہ آزادی تو "انگریز" اور "انگریز حکومت" سے نہیں بلکہ سرے سے "انگریزیت" سے چاہتے تھے۔ "انگریز بیزاری" تو اکبر کی "انگریزیت بیزاری" کی صرف ایک شاخ اور اس سے کہیں تنگ و محدود تھی! اکبر کی نظر سیاسی لیڈروں سے کہیں گہری تھی اور شاخ پر نہیں۔ اصل پر تھی۔

لیکن اب سب سے بھی قطع نظر خود یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ اکبر کے کلام میں وطنیت اور وطن دوستی کے اجزاء ملتے ہی نہیں کلیات کا یہ حصہ اول تو ان کے بہت قدیم کلام سے متعلق ہے۔ عین انکی سرکاری ملازمت کے زمانہ کا، اس تک میں وطن دوستی کی تعلیم اور ہندو مسلم اتحاد کی دعوت کی جھلکیاں موجود

ہیں۔ خاص اکبری انداز میں ؎

چلبلیاں ایک دوسرے کی وقت پہ جڑتے بھی ہیں
ناگہاں غصہ جو آجاتا ہے لڑ پڑتے بھی ہیں
ہندو مسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہتے ہیں سچ
ہیں نظر آپس کی ہم ملتے بھی ہیں لڑتے بھی ہیں (۲۴)

چوتھا مصرا شاعرانہ ہے۔ ایک کی نظر جب دوسرے سے ملتی ہے۔ تو اردو محاورہ میں کہتے ہیں نہ، کہ "نظر لڑ گئی" شاعر کی نظر اس محاورہ پر پڑ گئی اور لیجئے اس سے ایک پورا مضمون کھڑا کر دیا! ——— اب دوسری رباعی ملاحظہ ہو۔ رنگ ہیں کچھ اس سے بھی شوخ تر ؎

کہتا ہوں میں ہندو مسلمان سے یہی	اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ	موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو (۲۵)

چوتھے مصرع کی روانی کیا خوب! ——— موجوں کو "لڑتے" اور ساتھ ہی گلے ملتے کس نے نہیں دیکھا ہے! کون جانتا تھا کہ اس سے گنگا جمنی سنگم کا شاعرانہ نکتہ، لطیفہ پیدا کرے گا!

لیکن یہ باتیں بس کہیں کہیں اور خال خال ہی ہیں ورنہ اکبر کا اصل میدان تو اخلاق کے حقائق اور دین کے معارف ہیں ——— دماغ، دل اور شکم کی تثلیث سے دیکھئے شاعر کا قلم توحید رقم کیا نکتہ پیدا کرتا ہے ؎

تھا سر میں کمال تو وہ سلطان بنا	تھا دل میں جمال وہ مسلمان بنا
نذرت طلبی سے نفس رندی پہ جھکا	تھا پیٹ بہت حریص شیطان بنا (۲۳)

اکبر مذہبی بڑے گہرے تھے۔ لیکن مذہبی بحث و مباحثہ کے زیادہ قائل نہ تھے۔ جانتے تھے اور دیکھتے تھے کہ مناظرہ بازیاں انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہیں۔ اور یہ فتنہ سامانیاں غیروں کی نہیں۔ اپنوں ہی کی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔ اب تلقین سنئے ؎

مذہب کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا — چاہی اصلاح تو خدا بھی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر — اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا (ص ۱۳۷)

یہی راگ ایک دوسری رباعی میں ؎

دیکھا مناظروں کا بہت اس نے رنگ ڈھنگ — اکبر کے دل میں اب نہ رہی بحث کی اُمنگ
کہتے بہت صحیح تھے یہ حضرت مذاق — ایمان برائے طاعت و مذہب برائے جنگ (ص ۱۵۲)

(یہ مذاقؔ۔ حضرت اکبر کے سمدھی صاحب کا تخلص تھا، جو مذہب امامیہ رکھتے تھے)

حال و قال کے نام سے کیا کچھ نہیں ہوتا۔ سجادے اور خانقاہیں رفتہ رفتہ دوکانداری میں کیسی تبدیل ہو گئی ہیں۔ دل روتا ہے تو زبان کھلتی ہے ؎

تحریک ضرورت معشیت ہے بہت — خرقہ کو بھی اب خیال خلقت ہے بہت
خالق کے جمال کا تو سودا کم ہے — اللہ کے نام کی تجارت ہے بہت (ص ۲۳۹)

(معنویت سے قطع نظر، یہ "تجارت" کے ساتھ "سودا" کی لفظی مناسبت جو ہاتھ آگئی، اُسے "گھاتے میں" سمجھئے!)

اکبر کا اصلی مقام کلامیات کے مسائل اور الٰہیات کے حقائق ہیں۔ ایک گہرے اور بڑے مسئلہ کو دیکھئے دو لفظوں میں بات کر کے بیان کر دیتے ہیں ؎

ہنگامۂ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم — لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے

کھلتا نہیں راز دہر شکوہ ہے تو یہ اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے (ص۲۵)

مخلوق کی زبان سے شکر و شکوہ کی یہ گنجائش، بلکہ ضرورت. آج تک کسی اور کے ذہن رسا نے کیوں پیدا کی ہو گی!

"آسمانی باپ" اصطلاح مسیحیوں کی سہی، لیکن آخر ہے تو ایک مذہبی ہی تخیل صریح الحاد و بے دینی کے مقابلہ میں وہ اس کو کتنا غنیمت جانتے اور اس کی حمایت میں کیسا شاعرانہ نکتہ پیدا کرتے ہیں ؎

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائیگی اک دن اور اڑ جائیگی بھاپ دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو (ص۲۲۶)

برق کے لئے کسی مفہوم میں بھی "جب گرنے" کا محاورہ چلا ہوا ہے تو اکبر اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھاتے ؎

یہ بار بار فرماتے تھے، کہ قوم کا قوام تو مذہب ہی سے ہے. جب یہی اصل کمزور ہو گئی تو ملت، امت، قوم کی شیرازہ بندی کس چیز سے ہو گی اس لئے اپنی دنیا سنبھالنے کے لئے بھی دین کا استحکام ضروری ہے ؎

جب علم گیا تو شوق عزت معدوم دولت رخصت تو ذوق زینت معدوم
مسجد سے یہ آئی گوش اکبر میں صدا مذہب جو ہٹا زور ملت معدوم (ص۲۴۲)

بے حجابی پر ماتم جب غزلوں میں نہیں چھوڑا، تو رباعیوں میں کیسے اس سے درگذر روا رکھتے کہتے ہیں، اور ملت کے حال و مستقبل کو نظر میں رکھ کر کہتے ہیں ؎

وہ شوکت و شان زندگانی نہ رہی غیرت کی حرم میں پاسبانی نہ رہی
پردہ اٹھا تو کھل گیا اے اکبر اسلام میں اب وہ لن ترانی نہ رہی
ص۲۵۵

لن ترانی کے جو لفظی معنی ہیں (یعنی ناقابل دید ہونے کے) وہ، اور جو اُردو روزمرہ میں چلے ہوئے (شیخی اور تعلّی کے) وہ، دونوں پیش نظر ہیں جب چوتھے مصرعہ کا لطف آئے گا۔

اور بے پردگی کے سلسلہ میں یہ ان کی بہت پرانی رباعی خدا جانے اب تک کتنی دفعہ دہرائی جا چکی ہے، لیکن اتنی جاندار ہے پھر بھی ہر دفعہ زبان اور قلم پر لانے کے قابل ہے۔ اور اسے لائے بغیر رباعیات اکبر کا مختصر سا انتخاب بھی ناتمام ہی رہے گا ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

(ص ۲۳۷)

مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ

اردو زبان کی بقاء اور اسکے تحفظ کیلئے

ماہنامہ

فروغ اردو

لکھنؤ

جو کہ

زیر ادارت:- ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

یکم مئی ۱۹۵۸ء سے شائع ہو رہا ہے

اس کا خریدار بننا اور بنانا آپ کا قومی فرض ہے

سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ

مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیے

(۱) منیجر ماہنامہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

(۲) پاکستان میں- منیجر مبارک بکڈپو- بندر روڈ مقابل ڈینو ہال کراچی ۲

God bless you